OUP—43—30-1-71—5,000

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۱۹۵ [illegible] Accession No. U1197

Author

Title [illegible] جلد [illegible]

This book should be returned on or before the date last marked below.

تصانیف

مصنفۂ علامہ راشد الخیری دہلوی

روداد قفس	۱۲ر	اعمالنامے	۸ر	سنجوگ	۱۰ر
گلدستہ عید	۱۲ر	انگوٹھی کا راز	۸ر	فسانہ سعید	۸ر
ستونتی	۸ر	گوہر مقصود	۶ر	موودہ	۸ر
منازل ترقی	۴ر	نوحہ زندگی	۱۲ر	سوکن کا جلاپا	۶ر
بچہ کا کرتہ	۴ر	شاہین و دراج	۸ر	الزہرا	۱۲ر
امین کا دم واپسیں	۶ر	منازل السائرہ حصہ اول	عہ	یاسمین شام	عمر
جوہر عصمت	عمر	″ ″ حصہ دوم	عہ	تائید غیبی	۸ر
سیلاب اشک	۴عمر	امت کی مائیں	۸ر	جوہر قدامت	عمر
نانی عشو	۱۰ر	ماہ عجم	۴عمر	سمرنا کا چاند	عمر
لڑکیوں کی انشا	۱۲ر	عروس کربلا	عمر	قطرات اشک	عمر
سراب مغرب	۸ر	بنت الوقت	۸ر		

صبح زندگی . . . . عمر | شام زندگی ۴عمر

شب زندگی

حضرت علامہ راشد الخیری کی بہترین اور سب سے زیادہ مشہور تصنیف جس کے سات ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل چکے ہیں ناممکن ہے کہ انسان اسے پڑھ کر کچھ نہ سیکھے۔

قیمت حصہ اول عہ حصہ دوم عہ

مکتبہ جامعہ ملیہ۔ قرول باغ۔ دہلی

مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی

عربوں کا تمدن مترجمہ سید نذیر نیازی صاحب بی اے (جامعہ) چند سال ہوئے ڈاکٹر جوزف ہیل پروفیسر میونک یونیورسٹی نے عربی تمدن پر ایک مختصر مگر جامع کتاب شائع کی تھی ں کا انگریزی ترجمہ ہر جگہ مقبول ہوا۔ دنیا کی کسی زبان میں تمدن اسلام پر ایسی مختصر مفید تصنیف موجود نہیں ں میں جدید ترین تحقیقات کی بنا پر تمام ضروری معلومات کو جمع کر دیا گیا ہو۔ تمام وہ حضرات جو مسلمانوں ے قدیم علمی و عملی کارناموں کے مطالعہ کا شوق رکھتے ہیں اس کتاب کو اپنے لئے غیر معمولی طور سے فید پائیں گے مترجم نے کتاب کی قدر نہایت مفید ضمیمہ لکھکر اور بڑھا دی ہے۔ یہ تاریخ اسلام پر پنی جگہ پر یوں بھی نہایت محققانہ اور بصیرت افروز مقالہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت عہ؍

اریخ فلسفہ اسلام (از ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی (برلن) ہالینڈ کے مشہور فلسفی و مستشرق ڈی جے دی بور کی گرانقدر تصنیف کا براہ راست جرمن زبان سے سلیس و شگفتہ اردو ترجمہ تاریخ فلسفہ اسلام پر اردو میں یہ پہلی قابل قدر کتاب ہے قیمت عا؍

ذکریٰ تفسیر پارہ عم کی ہر مسلمان کو ضرورت ہے۔ مصنفہ مولانا عبدالحق صاحب فاروقی کا سلسلہ تفسیر الفرقان فی معارف القرآن کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ یہ کتاب بھی اسی مفید سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس میں پارہ عم کی تفسیر مصنف نے اپنے مخصوص انداز میں امت اسلام کے لئے پیش کی ہے قیمت صرف ۳؍

تاریخ الامت (حصہ ششم) مصنفہ مولانا اسلم جیراجپوری۔ اس حصہ میں عباسیہ مصر کی مکمل تاریخ انکے اس زمانہ تک کی ہے جبکہ خلافت انکے ہاتھوں سے نکل کر آل عثمان کو منتقل ہو گئی تھی شروع میں مختصر طور پر طوفان نوح سے لیکر عباسیہ مصر کی ابتدا تک مصر کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے تاکہ پڑھنے والے مصر قدیم کی تاریخ سے بھی واقف ہو جائیں۔ قیمت صرف عا؍

جذبات حریت (قومی نظموں کا نہایت دلکش مجموعہ) ڈاکٹر اقبال، حضرت اکبر الہ آبادی، علامہ شبلی

مرحومین، مولنا حسرت، پنڈت برج نراین چکبست، سید ہاشمی فریدآبادی، مولانا محمد علی، اور مولانا ظفر علیخاں کی زبردست دل ہلا دینے والی بیحد دردناک و عبرت آموز نظمیں، یہ مجموعہ نسبتہً دوسرے انتخابوں سے بہت اچھا ہے اور رکھنے کے لائق ہے۔ قیمت صرف ۵ ر

کلام شاد

ڈھونڈوگے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہمنفسو وہ خواب ہیں ہم

مولنا سید علی محمد شاد مرحوم عظیم آبادی کا اسم گرامی باذاق حضرات کے سامنے محتاج تعارف نہیں۔ یہ مجموعہ شاد مرحوم کے رشحات قلم و افکار عالیہ کا مختصر مگر جامع نمونہ ہے۔ ملک کے مقتدر اہل کمال آپ کی شاعری کے قائل ہیں۔ مولنا سید سلیمان ندوی صاحب مقدمہ میں فرماتے ہیں کہ شاد کی شاعری حسن و عشق کے عامیانہ اور سوقیانہ انداز بیان سے تمام تر پاک ہے۔ پاکبازانہ حسن و عشق، رزم و بزم کی دلکش روداد کے علاوہ انکی شاعری میں اخلاق، فلسفہ، تصوف اور توحید کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ طباعت و کتابت اور کاغذ اعلیٰ مع تصویر حضرت شاد مرحوم۔ قیمت عا ر

باقیات فانی

نگاہ شوق کے دم تک تھیں آنکھیں — اب آنکھیں یادگاریں ہیں نظر کی
فانی ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی — سانچے ہیں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

اپنی تو ساری عمر ہی فانی گزار دی — اک مرگ ناگہاں کے غم انتظار میں
دنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے — موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے
فانی کف قاتل میں شمشیر نظر آئی — لے خواب محبت کی تعبیر نظر آئی

فانی ایک اچھے شاعر ہیں۔ انکے کلام کی خوبی لطافت زبان اور نزاکت بیان ہے۔ ایک ایک شعر دلپذیر اثر کرتا ہے۔ پڑھئے اور سر دھنئے۔ ابتدا میں رشید احمد صاحب صدیقی ایم۔ اے (علیگ) کا مقدمہ ہے جو دو ابواب پر منقسم ہے پہلے باب میں اردو شعر و شاعری پر دلچسپ بحث ہے۔ دوسرے میں کلام فانی کے محاسن پیش کئے ہیں۔ یہ مقدمہ ۲ صفحات پر مشتمل ہے اس کے بعد حضرت جگر مرادآبادی کا تبصرہ ہے۔ کتاب مجلد ہے۔ طباعت وغیرہ اچھی ہے۔ فانی کی تصویر بھی ہے۔ باذاق حضرات

ضرور طلب فرمائیں۔ قیمت صرف ۳؍

تخمیس

حضرت محسن کاکوروی رحمۃ اللہ علیہ کو نعت گوئی میں قبول عام حاصل ہوا اور اُنکے نعتیہ کلام نے جو مرتبہ پایا وہ کم سے کم اردو میں اور کسی کو میسر نہیں آیا۔ اُن کی مشہور و معروف نعتیہ نظم "نظم دل افروز" کسی مزید تعریف کی محتاج نہیں ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم و مغفور بھی اُن پاکیزہ صفات اور اللہ کے مقبول بندوں میں تھے جن کا کلام خصوصاً مسدس اور عرض حال کو قبول عام حاصل ہوا اُسے کون نہیں جانتا۔

محسن کاکوروی رح کی نظم دل افروز اور خواجہ حالی رح کی عرض حال یہ وہ معرکۃ الآرا نعتیہ نظمیں ہیں جن میں خلوص اور درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے ممکن نہیں کہ کوئی صاحب ایمان انہیں پڑھے اور رسول پاک کی محبت و عقیدت بھرے آنسو نہ ٹپکائے۔

ان ہر دو بے نظیر نظموں پر ملک کے مشہور شاعر و ادیب مولانا احسن مارہروی نے ہر شعر پر مصرع لگائے ہیں جو اصل نظموں کے درد و اثر میں گوناگوں اضافہ کے موجب ہیں اور نہایت خوب ہیں۔ شروع میں احسن صاحب نے حضرت محسن کی شاعری پر ایک دلکش مقدمہ لکھا ہے جو بجائے خود ایک قابل قدر چیز ہے فلسکیپ چوتھائی (اسکول کاپی) سائز کے ۴۵ صفحات طباعت پاکیزہ۔ کتابت عمدہ۔ سرورق نفیس اور قیمت صرف آٹھ آنے (۸؍)

پردۂ غفلت

از ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم۔ اے پی ایچ۔ ڈی (برلن) ڈاکٹر صاحب نے یہ ڈراما لکھکر تعلیم نسواں اور آزادی نسواں کیطرف توجہ دلائی ہے اور ایک مسلمان زمیندار خاندان کی معاشرت کی سچی تصویر پیش کی ہے۔ ڈرامے میں ایک مزاحی کیرکٹر بھی ہے۔ کتاب فن ڈراما نویسی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ زبان نہایت شستہ اور پاکیزہ ہے اور ادبی خوبیوں سے مالا مال۔ پردہ کے موافق اور مخالف دونوں پڑھیں۔ مطبع شرکت کاویانی (برلن) میں چھپی ہے حجم ۱۴۶ صفحات قیمت صرف عہ

ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی

۷۸۶

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سیّد عابد حسین ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۱	بابتہ ماہ صفر ۱۳۴۷ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۲۸ء	نمبر ۱

فہرست مضامین

۱۔ تمدن اور مذہب	ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی	۲
۲۔ احتساب اور مسیحائی	دستیفسکی (روسی سے) ترجمہ از محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن)	۹
۳۔ غزل	حضرت ثاقب لکھنوی	۲۳ و ۴۸
۴۔ بردولی اور رعیت واری بندوبست	ڈاکٹر ذاکر حسین ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی	۲۴
۵۔ اسلام اور تعلیم جدید	مارمڈیوک پکتھال ترجمہ از اسرائیل احمد خانصاحب	۳۳
۶۔ مفتی محمد عبدہٗ	ابو حمزہ الحسنی، بھوپال	۳۹
۷۔ ماموں جان (ڈراما)	انتون چیخوف ترجمہ از جلیل احمد صاحب قدوائی بی اے	۴۹
۸۔ قانونی زندگی	ملا رموزی، بھوپال	۶۶
۹۔ اقتباسات		۷۲
۱۰۔ شذرات		۷۵

تمدن اور مذہب

ہماری زبان کے مایۂ ناز ادبی صحیفہ آردو نے اپریل ۴۲ء کے پرچہ میں ”مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ ملیہ“ پر مفصل تنقید کر کے مصنف کی قدر افزائی کی ہے۔ محترم تنقید نگار صاحب و ایک بنیادی عقیدے سے جو رسالے میں ظاہر کیا گیا ہے اختلاف ہے۔ رسالے کے پہلے باب میں بتایا گیا ہے کہ مسلمان صدیوں کی غفلت اور جمود کے بعد اب بیدار ہوئے ہیں ”ان میں مذہبی اور اخلاقی احساس پھر سے زندہ ہو گیا ہے۔ سرچشمہ حقیقت و حیات سے ٹوٹا ہوا رشتہ دوبارہ قائم ہونے کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں دوبارہ زندگی کی آرزو پیدا ہو گئی ہے اور اپنے بازوؤں میں زندگی کی قوت محسوس کرنے لگے ہیں۔ لیکن یہ حیات قومی کا محض پہلا قدم ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب ضرورت ہے کہ اس بنیاد پر اس عمارت کی تعمیر شروع ہو جسے اصطلاح علمی میں تمدن اور ہم مسلمان وسیع معنوں میں مذہب کہتے ہیں جو ہمارے نزدیک زندگی کے تمام شعبوں کا احاطہ کرتی ہے جس میں علم و تعلیم، اقتصاد و معیشت، حکومت و سیاست کے بوقلمون قصر ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو کھڑے ہوتے ہیں اور دنیا کے ویرانے میں آبادی کی شان پیدا کرتے ہیں۔“

اس پر فاضل تنقید نگار صاحب فرماتے ہیں ”ٹھیک اسلام ہی نہیں بلکہ ابتدا میں ہر مذہب زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی تھا۔ انسان کا تجربہ اور تمدن وسیع ہوا تو ہر ہر شعبہ الگ ہونا شروع ہوا ہے اور قید مذہب سے آزادی حاصل ہوئی اور اسی میں انسان کی خیر تھی۔“

اسے پڑھنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میں اس مسئلہ کے متعلق اپنے خیالات پوری طرح واضح نہ کر سکا اور غلط فہمی کی گنجائش رہ گئی۔ اس لئے میں صفحات ذیل میں مذہب و تمدن کے معانی اور انکے باہمی تعلق کو کسی قدر تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ جو لوگ ان مقدمات کو تسلیم کر لیں گے انہیں اس نتیجے کے ماننے میں بھی کوئی تامل نہ ہو گا کہ مذہب کو تمام تمدنی شعبوں

پرحاوی ہونا چاہیئے ۔

تمدن اور مذہب دونوں کے حامل افراد ہی ہوتے ہیں اس لئے ان کے معانی کو واضح کرنیکی بہترین صورت یہ ہے کہ دونوں کا تعلق فرد سے دکھایا جائے ۔

ہر فرد کی ذات میں صناع حقیقی نے مختلف رجحانات ودیعت کئے ہیں جن کے ذریعے سے وہ اعلیٰ اعیان کے ماتحت خود اپنی سیرت اور خارجی اشیاء کا مشاہدہ اور ان کی تشکیل کرتا ہے مثلاً علم جس کے ذریعہ انسان خود اپنی اور سارے عالم کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی تحقیق کے نتائج کو مجرد معانی کی صورت میں ترتیب دیتا ہے یا اقتصاد جس کے ذریعے سے وہ اپنے بقائے نفس اور آسائش کے اصول کو سمجھتا ہے اور خارجی اشیاء میں اس طرح تصرف کرتا ہے کہ وہ اس کے لئے زندگی اور راحت کا سرمایہ بن سکیں ۔

ان رجحانات کو پوری طرح قوت سے فعل میں لانے کی غرض سے ضروری ہے کہ بہت سے افراد مل کر اجتماعی زندگی بسر کریں تاکہ ایک دوسرے کے لئے آئینہ کا کام بھی دے سکیں اور باہمی امداد سے ان چیزوں کی تشکیل بھی کر سکیں جو کسی فرد واحد کے بس کی نہیں ہیں ۔ یہ افراد ان ذہنی رجحانات کی تکمیل کے لئے متفقہ طور پر جو نصب العین قائم کرتے ہیں، جو اصول وقوانین وضع کرتے ہیں اور جن خارجی اشیاء اور ادارات کی تعمیر کرتے ہیں وہ بہیئت مجموعی ان کا تمدن کہلاتے ہیں ۔ مثلاً یونان کے باشندوں کا حسن وخیر کا نصب العین، ان کے عقائد و مسلمات، ان کے اخلاقی اور عدالتی قوانین ان کا رسم و رواج، انکی عمارتیں ان کی تصانیف ان کی دوسری مصنوعات یہ سب چیزیں مل کر یونانی تمدن کے مفہوم کو پورا کرتی ہیں ۔ گویا تمدن ایک جماعت کے مشترک ذہنی رجحانات کا مجموعی خارجی مظہر ہے ۔

اب فرد کا تعلق تمدن سے یہ ہے کہ اسے خود اپنی ذات کی تکمیل کے لئے کسی تمدن کا رکن ہونے کی ضرورت ہے ۔ نفس انسانی کی نشو ونما کے لئے دو چیزیں ناگزیر ہیں ۔

(۱) توسیع

(۲) حدبندی

توسیع اسے کہتے ہیں کہ انسان میں جتنی فطری صلاحیتیں ودیعت کی گئی ہیں وہ سب بھاری جائیں اور اُن کی تربیت کی جائے تاکہ اُس کے علم، احساس اور عمل کا دائرہ جتنا بڑھ سکتا ہے بڑھے اور حدبندی سے مراد یہ ہے کہ جن چیزوں کی استعداد اُس میں نہیں ان کی کوشش نہ کرے اور جن کی استعداد ہے ان میں بھی اہمیت کا لحاظ کرتے ہوئے کسی پر زیادہ زور دے کسی پر کم تاکہ اُن میں ترتیب و توازن قائم ہو سکے۔

تکمیل ذات کے یہ دونوں عناصر توسیع اور حدبندی تمدنی زندگی کے محتاج ہیں جب کوئی بچہ کسی متمدن ملک میں پیدا ہوتا ہے تو وہ آنکھ کھولتے ہی ایک ایسی تہذیب کی فضا میں، سانس لیتا ہے جو متعدد نسلوں کی صدہا سال کی سعی پیہم کا نتیجہ ہے۔ اگر وہ اور اُس کے ماحول کے کل انسان اس تاریخی خزانے سے محروم ہو جائیں تو عمر بھر کی متفقہ کوشش اور باہمی امداد سے بھی وہ بمشکل تمدن کے اُس درجہ پر پہنچ پائیں گے جس پر دنیا کی وحشی قومیں آج سے ہزار سال پہلے تھیں اور اگر کہیں اس بچے کو اپنے ابنائے جنس کی صحبت بھی نصیب نہ ہو اور وہ کسی غیر آباد جزیرے میں ڈال دیا جائے تو بظاہر اسباب تو اُس کا زندہ رہنا ہی ناممکن ہے پھر اگر خدا کی قدرت سے بچ بھی گیا تو اُس کی زندگی بہائم کی زندگی سے شاید ہی کچھ بہتر ہو۔ بغیر تمدنی ماحول میں رہنے کے نہ انسان اپنے فطری رجحانات کی توسیع کرتا ہے نہ حدبندی اور تہذیب۔ اُس کا نفس جذبات و خیالات اور جبلتوں اور آرزوؤں کے ایک ابلتے ہوئے چشمے کی طرح اپنے پھیلنے اور بڑھنے کے لئے اجتماعی زندگی کا وسیع میدان چاہتا ہے اور دوسری طرف اپنے روکنے اور راہ پر لگانے کے لئے تمدنی اخلاقی قوانین کے بلند ساحل کا محتاج ہے۔ افراد کی زندگی کے لئے تمدن دلیل راہ بھی ہے۔ اور سرچشمہ قوت بھی وہ اُن کے دل میں زندگی کی اعلےٰ قدروں کا احساس بھی پیدا کرتا ہے۔ ہم روزمرہ دیکھتے

ہیں کہ جو اپنے عہد کی اجتماعی زندگی سے گہرا تعلق رکھتا ہے اور پورا استفادہ کرتا ہے وہ تہذیب و ترقی کے بلند مرتبے پر فائز ہوتا ہے، اور جو تمدن کی برکات سے محروم رہتا ہے اسکی زندگی پست، تنگ اور بے ترتیب ہوتی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ فرد کے لئے مذہب کی کیا اہمیت ہے اور تمدن کو مذہب سے کیا علاقہ ہے۔

یہ ہم کہہ چکے ہیں کہ ہر فرد کی طبیعت میں مختلف رجحانات ہوتے ہیں اور ہر رجحان کا موضوع زندگی کا کوئی ایک شعبہ ہوتا ہے۔ مثلاً علم کی موضوع تصورات و معانی کی دنیا ہے۔ ذوق جمال کا موضوع حسن و خوبی کا عالم ہے وقس علیٰ ہذا

ان میں سے کسی میں اتنی وسعت نہیں کہ پوری زندگی کا احصار کر سکے۔ لیکن یہ تو ممکن نہیں کہ انسان کی ذہنی زندگی کی ساخت چھوٹے چھوٹے منتشر ٹکڑوں میں کی گئی ہے جن میں باہم کوئی ربط نہ ہو اگر ایسا ہوتا تو نہ وہ خود اپنی سیرت سمجھ سکتا نہ دوسرے اُسے سمجھ سکتے۔ علم الانسان اور نفسیات کا پھر کسی طرح امکان ہی نہ تھا۔ نفس انسانی کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ واحد اور غیر منقسم ہے جس میں تقسیم محض اعتباری ہے۔ جب نفس کے مختلف "عناصر" یا "حصوں" کا ذکر کیا جاتا ہے تو مراد اُس کے مختلف مظاہر یا مختلف پہلوؤں سے ہوتی ہے۔ اسلئے ضرور انسان کے دل میں کوئی رجحان ایسا ہوگا جسکا موضوع زندگی کا کوئی ایک شعبہ نہیں بلکہ کل زندگی ہو جسکا تقاضا ہو کہ انسان اپنے پورے تمدنی ماحول اور اپنی مجموعی سیرت پر ایک ہمہ گیر نظر ڈالے، انکے عناصر کے باہمی علاقوں کو سمجھے اور اپنے اعمال کی ایسی تشکیل کرے کہ وہ بہ ہیئت مجموعی اسکی شخصیت کو اور اس تمدن کو جس کا وہ رکن ہے اوج کمال پر پہنچانے میں مدد دیں۔ یہ رجحان جسے جذبہ اخلاقی کہتے ہیں مذہب ہی کا ایک پرتو ہے۔

لیکن اصل مذہبی رجحان اور اسکا موضوع اس سے کہیں زیادہ بلند اور وسیع ہے۔ تمدن جو اخلاقی رجحان کا موضوع ہے ایک محدود چیز ہے۔ ہر تمدن کسی خاص نسل، کسی

خاص زمانے اور کسی خاص ملک کا پابند ہوتا ہے۔ دنیا میں ایک ہی زمانہ میں متعدد تمدن ہوتے ہیں جن میں آپس میں اختلاف اور تصادم واقع ہوا کرتے ہیں اور اکثر ایک فرد واحد پر کئی تمدنوں کے اثرات پڑتے ہیں اور وہ اس کشمکش میں رہتا ہے کہ ان میں سے کسے قبول کرے اور کسے رد کرے۔ اس لئے جس طرح انفرادی زندگی کی قدر کا اندازہ کرنے کے لئے تمدن معیار ہے۔ اسی طرح خود تمدن کے پرکھنے کے لئے ایک بلند ترین معیار کی ضرورت ہے جو آخری اور قطعی ہو۔ اسی کا نام مذہب ہے اور جو رجحان انسان کے نفس میں اس کی طرف پیدا ہوتا ہے اُسے مذہبیت کہتے ہیں۔

مذہبیت کا موضوع محض یہ زندگی یا یہ دنیا نہیں ہے بلکہ کل کائنات ازل سے لے کر ابد تک۔ اس رجحان کے ماتحت انسان کے ذہن میں ایسے ایسے سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا جواب دینے سے اس کے سارے قوائے ذہنی عاجز اور مجبور ہیں۔ وہ کائنات کی حقیقت، اُس کا آغاز، اُس کا انجام، اُس کی تخلیق کا منشا، اُس کی ارتقا کا قانون معلوم کرنا چاہتا ہے تاکہ اپنے اعمال کو اُس ناموس اعظم۔ اس مقصد اکبر کا پابند بنائے جس پر نظام کائنات قائم ہے۔ اگر اسے وہ سرچشمہ ہدایت ہاتھ آجائے جہاں خود خالق کائنات کی طرف سے ان سوالوں کا جواب دیا جاتا ہے تو اُس کے قلب میں ایسی جمعیت تسکین اور گہرائی پیدا ہوتی ہے اور اُس کے اعمال میں ایسا خلوص، اعتماد اور استحکام رونما ہوتا ہے کہ اس کی مجموعی سیرت تکمیل کے مدارج میں بہت بلند درجے پر پہونچ جاتی ہے۔

آپ ملاحظہ کر چکے ہیں کہ فرد کے نفس کو تمدن کی بدولت وسعت اور بلندی حاصل ہوتی ہے۔ اب اندازہ کیجئے اس وسعت اور بلندی کا جو مذہب انسانی سیرت کو عطا کرتا ہے جب کوئی شخص اس پر غور کرتا ہے کہ اس کی ذات ایک عظیم الشان اور جلیل القدر نظام کا جزو ہے اور ایک نامحدود، لازوال، کامل و اکمل خالق کی مخلوق ہے تو وہ

بے اختیار کہہ اٹھتا ہے:

دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

اسی طرح جب وہ سوچتا ہے کہ اسکا ہر فعل خواہ وہ کتنا ہی خفیف کیوں نہ ہو ساری کائنات کے سلسلہ ارتقاء پر اثر ڈالتا ہے تو وہ اپنے اعمال کی مکمل حدبندی اس طرح کرتا ہے کہ انہیں فطرت الہیہ کا پابند بنائے جو مکان و لامکاں اور زمان و لازماں میں کارفرما ہے۔

یہی مذہبیت کا عین جو دنیا میں ہر مذہب کے پیش نظر رہتا ہے۔ مگر دنیا کی ذہنی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جتنا واضح اور روشن تصور پیغمبر اسلام کو ہوا کسی دین و ملت کو حاصل نہیں ہوا اسی لئے جتنا زور اسلام میں مذہب کے مرکز تمدن بلکہ روح تمدن ہونے پر دیا گیا ہے اس کی مثال کسی دین و ملت میں نہیں ملتی۔

مذہب کے اس خالص اور اعلیٰ عین میں اور ثبوتی مذہب میں فرق کرنا چاہئے جو رسوم و روایات، اذعانی عقائد اور عبادات کا مجموعہ ہوتا ہے، بیشک یہ ثبوتی مذہب بھی نفس انسانی کی تہذیب کے لئے نہایت اہم چیز ہے۔ بغیر اس زینے کے کوئی شخص حقائق و معارف کی بلندی تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ انسان کی کوتاہ بیں آنکھ اس کی پابند ہے کہ ”شرب مدام“ کا لطف اٹھانے کے لئے ”عکس رخ یار“ کو کسی مخصوص ”پیالے“ میں دیکھے۔ پھر بھی یہ مذہب کا جوہر نہیں بلکہ ان اعراض کا نظام ہے جو مذہب و تمدن کے تعلق سے پیدا ہوتے ہیں۔

”مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ ملیہ“ میں اسی عین مذہب کو تمام تمدنی شعبوں کی جڑ قرار دیا گیا ہے۔ ورنہ خدا نخواستہ یہ منشا نہیں کہ قرون وسطیٰ کے رسمی

کلیسا کی تقلید میں محکمۂ احتساب قائم کیا جائے اور پادریوں کا ایک جتھا ملت اسلامی کے سر پر ترقی کو روکنے اور اصلاح کی مخالفت کرنے کے لئے مسلط کر دیا جائے۔ اصل میں جو تنگ نظری ہندوستانی مسلمانوں میں مذہب کے نام سے برتی جاتی ہے اسکا تقاضہ تو یہی ہے کہ ہر شعبہ تمدن خواہ وہ علم ہو یا سیاست یا اقتصاد مذہب کے خلاف اعلان جنگ کر دے لیکن اس جذبہ انتقام کے نتائج یوروپ میں بیحد خطرناک ثابت ہو رہے ہیں اور ہمارے یہاں اس سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہونگے کیونکہ اس قسم کی ذہنی جنگجوئی ہماری فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ اس لئے ہر ذمہ دار اہل الرائے کا فرض ہے کہ اس معاملے میں انتہائی احتیاط برتے اور مذہب کے غلط ڈھانچے کی مخالفت اس طرح نہ کرے کہ اس سے صحیح مذہبی روح کو بھی نقصان پہنچ جائے۔

احتساب اور مسیحائی

مغرب پر مشرق کی روحانیت کا بہت کم اثر ہوا ہے۔ حضرت عیسیٰ کا محبت کا پیغام اُس بگڑی حالت میں بھی جس میں متی، مرقس، لوقا اور یوحنا اسے پیش کرتے ہیں، کبھی یوروپ میں مقبول نہ ہوا، عیسائی مذہب پھیلانے کے لیے رومن کلیسا نے مغربی فطرت کا اس قدر لحاظ کیا کہ آخر میں وہ کچھ اور ہی بن گیا، اور باوجود اس کے کہ رہبانیت کا ایک بڑے عرصہ تک یورپ میں ڈھنڈورا پٹتا رہا، حضرت عیسیٰ کی پیروی عمل میں کیا عقیدے میں بھی صرف چند لوگوں نے کی اور وہ بھی ناکامیاب رہی۔

روس کا مشہور مصنف دستئیفسکی بھی انہیں لوگوں میں سے تھا۔ اس میں اتنی طاقت نہ تھی کہ حضرت عیسیٰ کی تعلیم پر عمل کر سکے۔ مگر وہ اسے بھی ناکافی سمجھتا تھا کہ گرجا میں روزانہ یا ہفتہ میں ایک مرتبہ حاضری دے آئے اور یہ سمجھ لے کہ اس نے حضرت عیسیٰ کی پیروی کر لی۔ تمام عمر وہ اس کوشش میں رہا کہ کسی طرح عقل کے زور یا جذبات کے جوش سے انسان کی وہ روحانی حالت تصور کرے جو حضرت عیسیٰ کی بلندی پر پہنچ کر ہوتی ہے اور اس ذریعہ سے حضرت عیسیٰ کی پیروی کی کوئی صورت اپنے لئے نکالے۔ اُس کی تمام ناولوں میں یہ کوشش ظاہر ہے، اور رفتہ رفتہ وہ اپنے نصب العین کے نزدیک پہنچتا ہوا بھی معلوم ہوتا ہے "برادران کرازف" اُس کی اعلیٰ ترین تصنیف اور اس قلعہ کی طرف سفر میں آخری منزل ہے جہاں حضرت عیسیٰ اسے راج کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

محتسب کی تقریر جس کا ہم یہاں ترجمہ دے رہے ہیں۔ ان اعتراضوں کو ایک نہایت گہرے اور پرجوش طریقہ پر پیش کرتی ہے۔ جو دنیا دار اور "سمجھدار" لوگ حضرت عیسیٰ کی تعلیم پر کرتے رہے ہیں۔ دستیفسکی کی بے تعصبی، صفائی اور ادراک کا یہ ایک بڑا ثبوت ہے کہ وہ محتسب کی دلیلوں کو غلط یا نامعقول نہیں بتاتا۔ محتسب کی منطق میں کوئی خامی نہیں، مگر یہی منطق جس کا حضرت عیسیٰ بھی کوئی جواب نہیں دیتے اس عشق کی بلند ہمتی کی سب سے مضبوط دلیل ہے جو صرف جلاتا نہیں بلکہ جلنے کی تمام تکلیفوں سے آگاہ بھی کر دیتا ہے۔ حضرت عیسیٰ اور شیطان کا مکالمہ، جو حضرت عیسیٰ کی "آزمایش" کے نام سے مشہور ہے چاروں انجیلوں میں پایا جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ ایک ویرانہ میں چالیس روز تک عبادت اور فاقہ کشی کر چکے تھے۔ اس کے بعد شیطان انکے پاس آیا اور انہیں بہکانا چاہا۔ پہلے اس نے کہا کہ اگر تو اپنے آپ کو خدا کا برگزیدہ بندہ سمجھتا ہے تو ان پتھروں کو روٹی بنا دے، اس سے معلوم ہو جائے گا کہ تیرا خیال صحیح ہے یا محض وہم۔ اس کے جواب میں حضرت عیسیٰ نے کہا کہ "انسان صرف روٹی پر نہیں جیتا"، پھر شیطان نے انہیں ایک اونچے مینار پر لیجا کر کھڑا کر دیا اور کہا کہ اگر عقیدہ تیرا سچا ہے تو نیچے کود پڑ، تجھے تیرا خدا بچا لیگا۔ اس پر حضرت عیسیٰ نے کہا کہ خدا کو آزمانا نہ چاہیے۔ آخرکار وہ انہیں ایک پہاڑ کی چوٹی پر لے گیا، جہاں سے تمام دنیا ایک چادر کی طرح پھیلی ہوئی نظر آتی تھی اور کہا کہ تو مجھے اس وقت سجدہ کرے تو میں یہ سب تجھے دیدوں گا۔ لیکن یہ بھی حضرت عیسیٰ کو منظور نہ ہوا، اور شیطان عاجز آ کر چلا گیا۔ محتسب کی تقریر میں اسی آزمایش پر زیادہ تر بحث ہے۔

م۔م

اس قصہ کا اس وعدہ سے کوئی تعلق نہیں جو حضرت عیسیٰ نے اپنی رحم دلی کی وجہ سے کیا ہے، کہ

انسانی زندگی جب ختم ہونے والی ہوگی تو وہ شان وشوکت سے آسمان پر سے اُتریں گے اور انکا آنا اُس بجلی کی چمک سا ہوگا جو ایک دم میں مشرق و مغرب کو روشن کر دیتی ہے نہیں، اس مرتبہ تو وہ بس اپنی روحانی اولاد کے یہاں مہمان بن کر آنا چاہتے تھے، خاص طور سے اس ملک میں جہاں مشرکوں کی ہڈیاں توڑی جا رہی تھیں۔ اُنکی محبت کا بے انتہا جوش انہیں پھر انسانوں کے درمیان میں اُسی شکل و صورت میں لے آیا جس میں وہ پندرہ سو برس پہلے تین سال تک فلسطین میں اپنی محبت کا پیغام سناتے پھرے تھے۔ جس دن وہ زمین پر شہر اشبیلیہ میں اترے اس سے ایک روز پہلے کوئی سو مشرک "خدائے عزوجل کے نام پر" اشبیلیہ کے بڑے پادری محتسب اعظم کے حکم سے، بادشاہ اور درباریوں اور درباری بیگمات اور شہر کی تمام آبادی کے سامنے جلائے گئے تھے۔ وہ بغیر کسی دہوم دہام کے چپ چپاتے نمودار ہوئے۔ کسی کو اُنکے آنے کی خبر نہ ہوئی لیکن یہ عجیب بات تھی کہ سب کے سب انہیں فوراً پہچان گئے۔ لوگ انہیں اسی طرح سے گھیر لیتے ہیں جیسے سمندر کی بلند موجیں ایک نازک جہاز کو، اور ہر جگہ اُنکے پیچھے پیچھے لگے رہتے ہیں۔ وہ خود خاموش کبھی ادہر جاتے ہیں کبھی اُدہر۔ اُنکے ہونٹوں پر ایک بے پایاں محبت اور ہمدردی مسکرا رہی ہے۔ محبت کا نور آفتاب کی طرح ان کے سینے میں چمک رہا ہے۔

اس کی شعاعیں ان کی آنکھوں سے نکل رہی ہیں، انکے چاروں طرف جو لوگ ہیں انکے دل اس محبت کے جواب میں تڑپ رہے ہیں، وہ اس مجمع کی طرف ہاتھ پھیلاتے ہیں اُس کے لئے دعا کرتے ہیں۔ جو اُنہیں یا اُنکے لباس کو چھو لیتا ہے اُسے ہر مرض سے نجات ملجاتی ہے، مجمع میں سے ایک بڈہا جو بچپن سے اندھا تھا، چلا اُٹھتا ہے "حضور میری آنکھوں کو روشنی بخشئے، کہ میں آپ کے دیدار کی تمنا پوری کرسکوں"۔ اس کی آنکھوں میں سے ایک مواد سا بہہ جاتا ہے، اور وہ انہیں دیکھ لیتا ہے۔ سارا مجمع جذبات کے جوش میں روتا ہے، اور زمین پر انکے قدموں کو چومتا ہے، بچے اُنکے راستہ میں پھول بکھیرتے ہیں۔ اُن کے آنیکی خوشی مناتی

ہیں۔ سب کی زبانوں پر یہی کلمہ ہے "یہ وہی ہیں، یہ وہ خود ہیں، یہ صرف وہی ہو سکتے ہیں یہ انکے سوا کوئی نہیں" وہ اشبیلیہ کے بڑے گرجا کے زینوں پر آ کر اُسی وقت ٹھہرتے ہیں جب ایک بچہ کا جنازہ گرجا میں لایا جاتا ہے۔ یہ جنازہ شہر کے ایک مشہور باشندے کی اکلوتی لڑکی کا ہے۔ مردہ بچی پھولوں میں پھول کی طرح لیٹی ہے۔ لوگ اس کی ماں سے چلا کر کہتے ہیں "یہ تیری بیٹی کو دوبارہ زندہ کر دینگے" گرجا سے جو پادری جنازہ کو اندر لیجانے کے لئے نکلتا ہے اسے پسند نہیں کرتا اور اس کی ابرووں پر بل آ جاتے ہیں لیکن لڑکی کی ماں ایک چیخ مار کر انکے پیروں پر گر پڑتی ہے اور کہتی ہے: "اگر تم وہی ہو تو میری بچی کو مجھے واپس دلا دو" جلوس رک جاتا ہے، جنازہ کو اُنکے پیروں پر رکھ دیتے ہیں وہ لڑکی پر محبت کی نظر ڈالتے ہیں اور ان کی زبان پر پھر وہی کلمہ آ جاتا ہے "قم باذن اللہ" لڑکی اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے، اور حیرت سے مسکرا کر ادھر اُدھر دیکھتی ہے۔ اُس کے ہاتھوں میں وہی سفید گلاب کے پھولوں کا گلدستہ ہے جسے وہ لئے ہوئے لیٹی تھی۔ لوگ یہ کرشمہ دیکھ کر حیران ہو جاتے ہیں کچھ اپنے جذبات کی شدت میں رونے لگتے ہیں، مگر اسی دم شہر کا کارڈنل، محتسب اعظم گرجا کے پاس سے گزرتا ہے۔ یہ کوئی نوے برس کا بڈھا ہے، دبلا پتلا، مگر کمر اس کی سیدھی اور آنکھیں روشن ہیں۔ وہ اسوقت کارڈنل کے شاندار لباس میں نہیں ہے جیسا کہ پچھلے روز، جب اُس کے حکم سے رومن کلیسا کے دشمن جلائے گئے تھے۔ انہیں اس وقت وہ ایک موٹا سخت کپڑے کا رہبانوں کا جبہ پہنے ہے اس کے پیچھے مقررہ فاصلہ پر اُس کے ترش رو اور تیرہ جان مددگار اور کلیسا کی "روحانی پولیس" ہیں۔ وہ مجمع کو دیکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے، سب کچھ دیکھتا ہے کہ لوگ کس طرح سے ان کے قدموں پر جنازہ لا کر رکھتے ہیں اور لڑکی اُنکے حکم سے پھر زندہ ہو جاتی ہے، یہ دیکھ کر اُس کے چہرہ پر تاریکی سی چھا گئی اُس نے تیوری چڑھائی اور اُسکی آنکھوں میں ایک پرمعنی چمک آ گئی اُس نے اپنا عصا ہلایا اور اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ انہیں گرفتار کر لیں۔ اُس کی عظمت اور جلال کا یہ عالم تھا، لوگ اس سے اس قدر ڈرتے تھے کہ مجمع نے سپاہیوں کو روکنے

کی ہمت نہ کی، سارے مجمع پر موت کی سی خاموشی طاری ہوگئی اور سپاہیوں نے بلا شور و شغب انہیں گرفتار کرلیا اور اپنے ساتھ لے گئے۔ مجمع نے ایک ساتھ محتسب کے سامنے زمین تک سر جھکا لیا اور محتسب نے خاموشی سے اُنکی مغفرت کے لئے دعا کی سپاہی اپنے قیدی کو ایک پرانے جیل خانے میں لے گئے اور وہاں انہیں ایک تاریک کوٹھری میں بند کر دیا۔ رات کو، اشبیلیہ کی مشہور تاریک رات کو جب ہوا، بیلے اور لیمو کی خوشبو سے لدی ہوئی تھی، کوٹھری کا دروازہ کھلا اور بڈھا محتسب ہاتھ میں چراغ لئے ہوئے آہستہ آہستہ اندر آیا۔ وہ اکیلا تھا اور اندر آتے وقت اس نے دروازہ بند کر دیا۔ پہلے تو وہ دروازہ کے پاس کھڑا اُنکے چہرہ کو تکتا رہا، اس کے بعد آگے بڑھا، میز پر چراغ رکھا اور ان سے پوچھا۔

"یہ تو ہے؟ تو؟" اور جب اسے کوئی جواب نہ ملا تو جلدی سے یوں کہنے لگا "ہاں، جواب نہ دے خاموش رہ۔ اور اب تو کہہ بھی کیا سکتا ہی؟ میں بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ تو کیا کہے گا۔ تجھے تو اب اسکا حق بھی نہیں ہی کہ جو کچھ ایک مرتبہ کہہ چکا ہی اُس میں اب اضافہ کرے۔ اب تو ہمارا کام بگاڑنے کیوں آیا ہے؟ ظاہر ہے کہ تو ہمارا کام بگاڑنے آیا ہے اور خود تو بھی اسے اچھی طرح جانتا ہی کہ کل کیا ہوگا۔ مجھے نہیں معلوم کہ تو کون ہے۔ میں یہ معلوم بھی نہیں کرنا چاہتا، تو صرف اُس کی صورت لیکر آیا ہو یا خود وہی شخص ہو(۱)۔ میں کل تجھے جلاؤں گا۔ اسی طرح ایک لکڑی سے باندھ کر جیسے خطرناک مشرکوں کو جلاتا ہوں، اور وہی لوگ جو آج تیرے قدم چوم رہے تھے، وہی لوگ کل صرف میرے اشارے پر بڑے انہماک سے لکڑیوں کے اس انبار پر تیل ڈالیں گے اور آگ لگائیں گے جس پر تو بندھا ہوگا۔ تجھے یہ بھی معلوم ہے کہ نہیں؟ ہاں ممکن ہے تو خود یہ جانتا ہو" محتسب نے ایک بارگی گویا ہوش میں آکر خود ہی کہہ دیا، اُس کی نظر قیدی پر سے ایک لمحہ بھر کے لئے بھی نہیں ہٹی تھی . . . . . .

ایک ہیبت ناک اور عاقل قوت، جو خود فراموشی اور زندگی سے رہائی کی پیغام بر ہے

---

(۱) یعنی حضرت عیسیٰ

ایک عظیم الشان شخصیت نے تجھ سے ایک ویرانہ میں گفتگو کی تھی جو ہماری کتابوں میں تیری "آزمائش" کے نام سے لکھی ہے۔ یہ واقعہ ہے یا نہیں؟ اور کیا راست گوئی، خوش معاملگی کی ان تین تجویزوں سے بہتر مثال مل سکتی ہے جو اُس نے تیرے سامنے پیش کی تھیں اور جن کو منظور کرنے سے تو نے انکار کر دیا تھا؟ . . . تو خود اس بات پر غور کر کہ تو ٹھیک تھا یا وہ، جو تیرا امتحان لے رہا تھا؟ اُس کا پہلا سوال یاد کر: "تو دنیا میں جانا چاہتا ہے، اور خالی ہاتھ جا رہا ہے، ایک غیر مفہوم آزادی کا وعدہ لیکر جو انسانوں کی سادہ دلی اور فطری بیقراری کی وجہ سے کبھی انکے دماغ میں بھی نہیں سما سکتی جس سے وہ گھبراتے اور ڈرتے ہیں، کیونکہ انسان کے لئے کہیں اور کسی زمانہ میں آزادی سے دشوار کسی آفت کا برداشت کرنا نہیں ہوتا! دیکھ اس ویرانہ میں بہت سی پتھر پڑے ہیں، ان کو روٹی بنا دے، اور تمام دنیا بھیڑوں کی طرح تابعدار اور شکر گزار ہو جائے گی، چاہے اس خوف سے ہمیشہ کانپتی کیوں نہ رہے کہ تو اپنا ہاتھ ہٹائے گا اور اُنکی روٹی بند ہو جائیگی۔" مگر تو اس پر راضی نہ ہوا، تو انسان کو آزادی سے محروم نہیں رکھنا چاہتا تھا اور تو نے شاید سوچا ہوگا، تو اُسے آزاد کیسے کریگا اگر اُس نے روٹی کی لالچ میں تابعداری کی؟ تو نے (شیطان کو) جواب دیا کہ انسان صرف پیٹ کا بندہ نہیں، لیکن تو نہیں جانتا کہ صرف اسی حقیر روٹی کے زور پر شیطان تیرے خلاف جھنڈا کھڑا کریگا۔ تجھ سے مقابلہ کر کے تجھے شکست دے گا، اور سب اسی کے بندے ہو جائیں گے اور چلائیں گے: "کون ہے اس جیسا۔ یہ تو آسمان پر سے روزی دلاتا ہے!" تو جانتا ہے کہ صدیاں گزر جائیں گی اور بنی نوع انسان اپنی سائنس اور علم کی زبان سے یہ کہلائیں گے کہ مجرم کوئی نہیں ہوتا نہ گناہگار ہوتے ہیں، ہوتے ہیں صرف بھوک کے مارے "پہلے ہمیں کھانے کو دے تب ہمارے اخلاق پوچھ!" یہ انکے جھنڈے پر لکھا ہوگا اسی کے گرد جمع ہو کر وہ تیرے عبادت خانہ پر حملہ کریں گے اور اُسے برباد کرینگے، اس کی جگہ پر وہ ایک نیا مینار بابل: - - - بنائیں گے، اور اگرچہ پہلے مینار بابل - - - کی طرح اس کی تعمیر بھی کبھی ختم نہ ہوگی۔ لیکن تیرے لئے تو یہ ممکن تھا کہ انہیں اس کا موقعہ نہ دے اور

انہیں صدیوں کی مصیبتوں سے بچائے، کیونکہ اپنے اس مینار بابل کو بنانے کی کوشش میں صدیاں گنوانے کے بعد وہ آخرکار ہمارے ہی پاس واپس آئیں گے۔ پھر ہمیں وہ غاروں اور تہ خانوں میں سے ڈھونڈ کر نکالیں گے۔ اس لئے کہ ہم پھر اس زمانہ میں مظلوم اور مقہور ہوں گے۔ اور ہم سے التجا کریں گے "ہمیں تم ہی کھلاؤ پلاؤ، آباد رکھو۔ جن لوگوں نے ہمیں آسمان پر پہنچانے کا وعدہ کیا تھا وہ اسے پورا نہ کر سکے" اور تب ہم پھر اپنی عمارت بنائیں گے، کیونکہ تعمیر وہی کرتے ہیں جو کھلا سکتے ہیں اور یہ صرف ہمارے بس کی بات ہوگی اور ہم تیرے نام سے جھوٹ بھی بولیں گے، ارے وہ ہمارے بغیر کبھی اپنا پیٹ نہیں پال سکتے جب تک وہ آزاد ہوں گے انہیں علم روٹی نہیں دے سکے گا۔ اور نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنی آزادی ہمارے قدموں پر لاکر رکھ دیں گے اور کہیں گے "ہمیں چاہے غلام ہی بنا لو مگر بھوکا نہ رکھو" وہ رفتہ رفتہ خود ہی سمجھ لیں گے کہ آزادی کی شرط فاقہ کشی ہے اور ان میں کبھی یہ صلاحیت نہ ہوگی کہ آپس میں اچھے اور برے کو انصاف کے ساتھ بانٹ لیں انہیں اس کا بھی یقین ہو جائے گا کہ وہ کبھی آزاد نہیں ہو سکتے، اس لئے کہ وہ کمزور، بدطینت حقیر اور سرکش ہیں۔ تو نے ان سے روحانی غذا کا وعدہ کیا تھا، لیکن میں تجھ سے پھر پوچھتا ہوں کیا تیری روحانی غذا کمزور، بدطینت، ناشکرے انسان کی نظر میں جسمانی غذا کا مقابلہ کر سکتی ہے!

اور اگر اس روحانی غذا کی آرزو ہزاروں کو تیرا اسیر بنا دے تو ان لاکھوں کروڑوں کا کیا انجام ہوگا جو جسمانی غذا سے اپنا رشتہ نہیں توڑ سکتے؟ یا تجھے صرف وہ چند ہزار ہمت والے عزیز ہیں اور باقی انسانوں کا جو ریگستان کے ذروں کی طرح بے شمار ہیں، جو کمزور ہیں لیکن انکے دلوں میں تیری محبت ہے، کیا انکا صرف یہی مصرف ہوگا کہ تیرے چیلے انکے خلاف اپنی ہمت آزائی کر سکیں؟ نہیں ہم کو تو کمزور انسان بھی عزیز ہیں۔ وہ فطرۃً برے اور سرکش ہیں، کبھی نہ کبھی تابعدار ہو جائیں گے۔ وہ ہمیں حیرت سے دیکھیں گے۔ ہمیں خدائی کا رتبہ دیں گے اس لئے کہ ہم نے انکے سردار بن کر اسی آزادی کا بوجھ اپنے سر پر لیا جس سے انہیں اتنا

خوف تھا، اور ان پر حکومت کرنا منظور کر لیا۔ انکے دلوں میں آزادی کی ہیبت رفتہ رفتہ بیتوہمیت پیدا کر دے گی۔ لیکن ہم ان سے کہیں گے کہ ہم تیرے پیرو ہیں، تیرے ہی نام سے حکومت کرتے ہیں۔ ہم انہیں پھر دھوکا دینگے، اس لئے کہ ہمارا ارادہ تجھے ہمیشہ کے لئے اپنے ملک سی باہر رکھنے کا ہے۔ یہ دھوکا ہمیں تکلیف بھی پہنچائے گا، کیونکہ ہم جھوٹ بولنے پر مجبور ہونگے۔

تجھ سے ویرانے میں جو سوال کیا گیا تھا اس کا یہی مطلب تھا، یہ سب کچھ تھا جس پر تو نے آزادی کو ترجیح دی۔ اس لئے کہ تو آزادی کو اس سے زیادہ بلند سمجھتا تھا۔ لیکن اس سوال میں ایک اور بھی نکتہ تھا جس میں دنیا اور انسان کا ایک بڑا بھید چھپا ہے۔ اگر تو نے جسمانی غذا عطا کرنا منظور کیا ہوتا تو تو نے ایک عام اور دائمی آرزو پوری کر دی ہوتی، ایک ایسے سوال کا جواب دیدیا ہوتا جو ہر فرد اور ہر قوم کے سامنے رہتا ہے یعنی یہ کہ کس کو سجدہ کریں اگر انسان آزاد ہو تو اس کے لئے کوئی فکر اسقدر مستقل اور تکلیف دہ نہیں ہوتی کسی چیز کی کمی اسے اس قدر محسوس نہیں ہوتی جتنی ایک معبود کی جسے وہ سجدہ کر سکے۔ اور تلاش اسے ایسے معبود کی ہوتی ہے جسے سب بغیر اختلاف سب سجدہ کریں۔ ان قابل رحم ہستیوں کو ایسا معبود نہیں چاہئے جسے میں یا تو، یا ہر شخص اپنے لئے مانے بلکہ ایسا جس پر سب ایمان لائیں، جسے سب سجدہ کریں، اور سب ایک ساتھ سجدہ کریں۔ اسی ضرورت نے کہ انکا معبود سب کا معبود ہو، طلوع زندگی سے ہر فرد اور تمام بنی نوع انسان کو سب سے زیادہ آزار پہنچایا ہے۔ اپنے معبود کو عام معبود بنانے کے لئے انہوں نے ایک دوسرے کا گلا کاٹا ہے۔ انہوں نے دیوتا بنائے ہیں اور ایک دوسرے کو للکارا ہے، "اپنے دیوتاؤں کو چھوڑ دو۔ ہمارے دیوتاؤں پر ایمان لاؤ، ورنہ ہم تمہیں اور تمہارے دیوتاؤں کو موت کا مزہ چکھائیں گے!" یہی حال قیامت تک رہے گا، تب بھی جب دیوتا دنیا سے غائب ہو جائیں گے، کیا ہوا، لوگ مورتوں کو پوجیں گے تو اسے جانتا تھا، یہ ناممکن ہے کہ انسانی فطرت کی بنیاد کے اس اہم راز سے واقف نہ ہو، تجھے ایک موقعہ ملا تھا کہ ساری دنیا کو بغیر انکار اور سرکشی کے اپنے سامنے سجدہ کرنے پر مجبور کرے۔ لیکن تو نے اس

موقعہ کو ہاتھ سے نکل جانے دیا، آزادی اور روحانی غذا کی آرزو میں جسمانی غذا سے منہ پھیر لیا دیکھ تو نے اس کے بعد کیا کیا؟ آزادی حاصل کرنیکے لئے اور کیا قربان کیا؟ میں تجھ سے پھر کہتا ہوں، انسان دنیا میں آزاد آتا ہے لیکن اُسے کسی طرح سے تسکین نہیں ہوتی جب تک وہ کسی ایسے کو تلاش نہیں کر لیتا جس کو وہ اپنی آزادی سپرد کر سکے۔ انسان کی آزادی کا تحفہ اُسی کو مل سکتا ہے جو اُس کی ضمیر میں امن قائم رکھ سکے۔ روٹی تیرے ہاتھ میں ہوتی تو تیری حکومت مستحکم ہوتی۔ روٹی دیتا تو انسان سجدہ کرتا، کیونکہ روٹی سے وہ کبھی انکار نہیں کر سکتا، لیکن اگر اُسکا ضمیر تیرے سوا کسی اور کے ہاتھ میں ہوتا۔ ارے تب تو وہ تیری روٹی پھینک کر اس کے پیچھے دوڑتا جو اُس کے ضمیر کو بہلا سکے۔ یہاں بھی تیری رائے ٹھیک تھی۔ انسان صرف روٹی پر نہیں زندہ رہتا۔ انسان کی ہستی کا راز صرف یہ نہیں ہے کہ وہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ وہ یہ بھی معلوم کرنا چاہتا ہے کہ وہ کس واسطے زندہ ہے جب تک کہ وہ اپنے زندہ رہنے کی کوئی اہم اسباب تصور نہ کرے گا، انسان جینے پر کبھی راضی نہ ہوگا۔ چاہے اُس پر آسمان سے رزق برسایا جائے، وہ موت کو زندگی پر ترجیح دے گا۔ اصل معاملہ یہ ہے، اور ہوا کیا؟ بجائے اس کے کہ تو اُن کی آزادی اپنے قبضہ میں کر لے، تو نے انہیں اور آزاد بنانا چاہا۔ یا تو بھول گیا تھا کہ انسان موت پسند کرے گا۔ لیکن اچھے اور برے میں اپنے بوتے پر فرق کرنا، اپنی آزاد خواہش سے اچھے کو لینا اور برے کو چھوڑ دینا، یہ اُسے کسی طرح منظور نہ ہوگا۔ وہ جی بہلانے کے لئے اپنے ضمیر کو آزاد سمجھنا چاہتا ہے لیکن اس آزادی سے اُسے سب سے زیادہ تکلیف بھی ہوتی ہے، اور تو نے بجائے انسان کے ضمیر کو ہمیشہ کے لئے خوش اور خاموش اور مطمئن کرنے کے وہی پسند کیا جو غیر معمولی، غیر مفہوم، غیر متعین تھا، وہی جو انسان کے امکان سے بالکل باہر تھا، اور پھر ایسی باتیں کیں، ایسا برتاؤ کیا جس سے لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ تو ایمان لانے والے پر سختی اور ظلم کرتا ہے، تو جس نے بعد کو صلیب پر انکی مغفرت کے لئے اپنی

جان قربان کی! بجائے اس کے کہ لوگوں کی آزادی اپنے قبضہ میں لے، تو نے اسے اور بڑھا دیا، اور دائمی روحانی عظمت کا بار ان کے کمزور کندھوں پر رکھ دیا تو چاہتا تھا کہ آزاد انسان اپنی خواہش سے محبت کرے، اپنی خواہش سے تیری پیروی کرے، تیری شخصیت سے مسحور۔ تیری محبت میں گرفتار ہو جائے۔ بجائے پرانے قانون(۱) کے جو جرم اور سزا پر مبنی تھا، تو نے یہ چاہا کہ اپنے آزاد ضمیر کے بھروسے پر انسان اچھے اور برے میں فرق کرلے اور اس میں سوائے تیری شخصیت کے اسکا اور کوئی رہبر نہ ہو، لیکن کیا تو یہ بھول گیا تھا کہ اگر اس پر اتنا بار ڈالا جائے تو وہ تیری تعلیم کو غلط قرار دے گا۔ تیری ہستی تک سے انکار کر دے گا . . . . اس طرح تو نے خود اپنے پیروں تلے سے زمین نکالی۔

اور سوا تیرے اس تباہی کا الزام کسی پر نہیں لگایا جا سکتا . . . . دنیا میں تین قوتیں ہیں، جو کمزور سرکش انسان پر اس کی بہبودی کے لئے فتح حاصل کرسکتی ہیں اور اسے ہمیشہ کے لئے گرفتار اور مطمئن رکھ سکتی ہیں، معجزہ، راز اور اقتدار۔ تو نے ان تینوں ذریعوں کو استعمال کرنے سے انکار کیا اور خود اس انکار کی ایک مثال بن گیا۔

اُس عاقل روح(۲) نے تجھے بیت الحرام کے مینار پر لیجا کر کھڑا کر دیا اور تجھ سے کہا، اگر تو معلوم کرنا چاہتا ہے کہ تو واقعی خدا کا بیٹا ہے تو یہاں سے نیچے پھاند پڑ، کیونکہ یہ روایت ہے کہ تجھے فرشتے اپنے ہاتھوں پر اٹھالیں گے اور تیرے چوٹ نہیں لگے گی، تب تجھے یقین ہو جائیگا کہ تو واقعی خدا کا بیٹا ہے اور دنیا کے لئے بھی ایک ثبوت ہو جائے گا" مگر تو نے انکار کر دیا دھوکا نہیں کھایا اور نیچے نہیں گرا۔ اس موقعہ پر جس طرح تو پیش آیا اُس کی زبان کافی تعریف نہیں کرسکتی لیکن ان کمزور سرکش ہستیوں کا خیال کر جن کے لئے تو ایک مثال بننا چاہتا تھا

---

(۱) یعنی حضرت موسے کے احکام عشرہ

(۲) یعنی شیطان

ہاں تو جانتا تھا کہ اگر تو نے ایک قدم بھی آگے رکھا، ذرا بھی نیچے کی طرف جنبش کی، تو تجھ میں خدا کا امتحان لینے کی خواہش پیدا ہو جاتی، یعنی تیرا ایمان بالکل جاتا رہتا، تو زمین پر گر کر چور چور ہو جاتا۔ اسی زمین پر جس کے باشندوں کو فلاح دینے آیا تھا، اور تیری تباہی پر وہ عاقل روح خوشی مناتی جو تجھے بہکانے آئی تھی لیکن میں تجھ سے پوچھتا ہوں تیرے جیسے دنیا میں کتنے لوگ ہو سکتے ہیں؟ کیا تو ایک لمحہ کے لئے بھی اسے ممکن سمجھتا تھا کہ سب انسان ایسے امتحان میں کامیاب ہو سکیں گے؟ کیا تو سمجھتا ہے کہ انسان کی فطرت کا تقاضا ہے کہ معجزہ سے انکار کرے، اور زندگی کے ایسے نازک موقعوں پر جب اس کی طبیعت میں ایسے گہرے اصولی شک تہلکہ مچاتے ہیں تو صرف اپنے آزاد دل کے اشارے پر چلے، ہاں تو سمجھتا تھا کہ تیری تحریک کا حال کتابوں میں محفوظ رہے گا۔ آخر زمانہ تک زندہ رہے گا اور دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلے گا، تجھے امید تھی کہ تیری پیروی کر کے انسان خدا پر ایمان لائے گا، اور اُسے معجزہ کی کوئی ضرورت نہ رہے گی، مگر تجھے نہیں معلوم تھا کہ جس وقت انسان معجزہ سے انکار کرتا ہے اُسکے دل میں خدا کے لئے بھی جگہ باقی نہیں رہتی کیونکہ اسے خدا سے زیادہ معجزہ کی تلاش ہے۔ اور چونکہ انسان کا بغیر معجزہ کے گزارا نہیں ہو سکتا، تو وہ اپنے لئے ایک روحانی عجائب خانہ تیار کر لیتا ہے، اور وہ نٹ کے تماشوں اور بڑھیوں کے منتروں کے سامنے سر جھکا لیتا ہے۔ باوجودیکہ وہ سو دفعہ سرکش اور مشرک اور ملحد ہو چکا ہے۔ تو اُس وقت صلیب پر سے نہیں اترا جب لوگ تیرے کپڑے نوچ رہے تھے، تیرا منہ چڑاتے تھے اور چلا رہے تھے "صلیب پر سے اُتر آ تو ہم سمجھ لیں گے کہ تو مسیح ہے!"، تو اس لئے نہیں اترا کہ پہلی دفعہ کی طرح تو اس وقت بھی نہیں چاہتا کہ لوگ کسی معجزہ کی وجہ سے تجھ پر ایمان لائیں بلکہ اپنی آزاد خواہش کی تحریک سے۔ تو اُس محبت کے لئے ترس رہا تھا جو خود بخود دل میں پیدا ہو۔ اُس کے لئے نہیں جو معجزہ سے پیدا ہوتی ہے۔ تو محبت کے لئے ترس رہا تھا۔ تجھے غلاموں کی ثنا خوانی نہیں درکار تھی

نہ تو لوگوں کو اپنی طاقت دکھانا چاہتا تھا لیکن یہاں بھی تو نے انسان کو جتنا بلند حوصلہ سمجھا اتنا وہ دراصل ہے نہیں۔ اس لئے اُس کی فطرت میں سرکشی تو ضرور ہے لیکن وہ قیدی ہے اور قیدی رہنا چاہتا ہے۔ خود آنکھیں کھول کر دیکھ لے، پندرہ سو برس گزر چکے ہیں، اور تیرے پایہ کو ابھی تک کون پہنچا ہے؟ . . . . کیا جو کچھ تو نے کیا ہے وہ معمولی انسان کے امکان میں ہے؟ تو اُس کی اتنی عزت کرتا تھا، لیکن تیرے برتاؤ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ تجھے اُس سے کوئی ہمدردی نہیں رہی۔ تجھے، جو اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا! اگر تو اسکی عزت کم کرتا تو تجھے اُس سے امیدیں بھی کم ہوتیں، اور یہ رویہ اُس کے تصور میں محبت کی شکل اختیار کرتا۔ اسی لئے کہ یہ اس پر بوجھ بھی کم ڈالتا۔ انسان کمزور اور کمینہ ہوتا ہے۔ آخر اس امر کی حقیقت کیا ہے کہ وہ ہر جگہ ہمارے(۱) خلاف بغاوت کر رہا ہے اور اپنی بغاوت پر فخر کرتا ہے؟ یہ ایک بچہ یا کمسن لڑکے کا غرور ہے۔ ننھے طالبعلموں کی بغاوت جو کلاس میں سے اپنے اُستاد کو باہر دھکیل دیتے ہیں . . . . .

تو اُن آزاد ہستیوں پر فخر کر سکتا ہے جنہوں نے تیری پیروی کی اور تیرے نام پر جان دی۔ لیکن یہ بھی سوچ لے کہ وہ کتنے تھے، اور جو باقی رہتے ہیں اُنکا کیا انجام ہوگا؟ انہوں نے کیا خطا کی ہے۔ اگر ان کو اتنی ہمت نہیں بخشی گئی کہ وہ تیری پیروی کرنے کی مصیبتیں نہ جھیل سکے؟ . . . . ورنہ کیا تو چند برگزیدہ ہستیوں کے پاس صرف انہیں برگزیدہ ہستیوں کے لیے اپنا پیغام لایا تھا۔ اگر ایسا ہے تو اس میں کوئی بھید ہوگا جسے ہم نہیں سمجھ سکتے اور اگر بھید ہے تو ہم کو بھی یہ تعلیم دینے کا حق تھا کہ محبت اور آزاد دل کی اُمنگیں بے فائدہ ہیں، مذہب کا انحصار صرف ایک بھید پر ہے اور اس لئے انہیں ہماری تقلید کرنا چاہئے، اُن کا دل چاہے جو کچھ کہے۔ اور ہم نے کیا بھی یہی۔ ہم نے تیری تحریک میں کانٹ چھانٹ کی، اُسے سیدھے راستہ

---

(۱) یعنی رومن کلیسا کے

پر لائے۔ معجزہ، بھید اور اقتدار پر اُس کی بنیاد رکھی، اور لوگ اس سے بہت خوش ہوئے . . . . . . اب تو ہمارا کام بگاڑنے کیوں آیا ہے؟ . . . . خفا ہو جا، مجھے تیری محبت درکار نہیں، اس لئے کہ خود مجھے بھی تجھ سے کوئی محبت نہیں، اور میں تجھ سے بات کیوں چھپاؤں؟ کیا مجھے معلوم نہیں کہ تو کون ہے؟ میں جو کچھ تجھ سے کہہ رہا ہوں تجھے پہلے ہی معلوم ہے یہ میں تیری آنکھوں میں پڑھ سکتا ہوں، میں کون ہوں کہ تجھ سے اپنا راز چھپاؤں؟ ممکن ہے تو اُسے میرے منہ سے سننا چاہتا ہے، تو سن لے۔ ہم[1] تیرے ساتھ نہیں ہیں بلکہ اُس[2] کے۔ اب سے نہیں بہت پہلے سے، کوئی آٹھ صدی پہلے سے جب ہم نے اُسکا وہ تحفہ منظور کر لیا جسے تو نے نہایت خفگی کے ساتھ واپس کر دیا تھا، وہ آخری تحفہ جو اس نے تیرے سامنے پیش کیا تھا جب تجھے دنیا کی تمام سلطنتیں دکھائیں اور تجھے اُن کا بادشاہ بنانے کا وعدہ کیا۔ ہم اس سے روم اور قیصر کی تلوار لینے پر راضی ہو گئے اور ساری دنیا کے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا . . . ہم ابھی تک سارے ارمان پورے نہیں کر سکے ہیں، ابھی دنیا کو بہت بھگتنا ہوگا۔ لیکن کبھی نہ کبھی ہم کامیاب ہو جائیں گے اور تب تمام دنیا کو خوش رکھنے کی ترکیبیں سوچیں گے . . . . لیکن تو تو اس زمانہ میں بھی قیصر کی تلوار ہاتھ میں لے سکتا تھا، تو نے یہ آخری تحفہ لینے سے کیوں انکار کر دیا؟ اگر تو راضی ہو جاتا تو تو انسان کی وہ تمام حاجتیں رفع کر سکتا جو اُسے دنیا میں ہوتی ہیں۔ اسے یہ معلوم ہو جاتا کہ کسے سجدہ کرنا چاہئے، کس کے سپرد وہ اپنا ضمیر کر سکتا ہے اور کون ایسا ہے جو تمام آدمیوں کو ہم خیال اور ہم مذہب بنا سکتا ہے کیونکہ تمام دنیا کی یکسانی اور یک رنگی انسان کی تیسری حاجت ہے جو اس کے لئے تکلیف کا باعث ہوتی ہے . . . اور انسانوں پر اُس سے بہتر کون حکومت کر سکتا ہے جس کے ہاتھ میں اُنکی روٹی اور اُنکا ضمیر ہو۔ ہم نے قیصر کی تلوار لی، اور جب ہم نے اُسے لیا تو ظاہر ہے کہ تجھ سے جدا ہو گئے اور اُس[3]”

---

(۱) رومن کلیسا (۲) شیطان (۳) یعنی شیطان

کے پیر دبن گئے . . . . . ہاں ہم اپنے بندوں کو اسکا ضرور یقین دلا دیں گے کہ انہیں مغرور نہ ہونا چاہئے کیونکہ تیری زندگی اُنکے لئے ایک اعلیٰ مثال ہے اور تو نے انہیں سکھایا ہے کہ کس چیز پر انہیں فخر کرنا چاہئے . . . لیکن ہم انہیں یہ بھی بتائیں گے کہ گناہ کیا ہے اور ثواب کیا . . . ہم اُن سے کہیں گے کہ ہر گناہ کا کفارہ دیا جا سکتا ہے اگر گناہ ہماری اجازت سے کیا جائے، ہم انہیں گناہ کرنے کی اجازت اس لئے دیں گے کہ ہم کو اُن سے بہت محبت ہے اور ہم انکے گناہوں کی سزا اپنے سر پر لے لیں گے . . . . وہ خود ہمیں آکر اپنے دلوں کے دردناک افسانے سنائیں گے۔ جو کچھ اُن کے دلوں میں ہوگا سب ہم سے آکر کہدیں گے ہم اُن کے تمام معمے حل کر دیں گے۔ ان کو ہمارے فیصلہ پر پورا بھروسا ہوگا، اور وہ بہت خوش ہونگے، اس لئے کہ وہ اچھے اور برے میں فرق کرنے کی دقتوں اور تکلیفوں سے بچ جائیں گے . . . . وہ اطمینان سے مریں گے۔ مرتے وقت تیرا نام انکے لبوں پر ہوگا اور موت انہیں صرف ایک لمبی نیند معلوم ہوگی . . . .

لوگ کہتے ہیں کہ قیامت کا ایک دن ہوگا . . . . . اس وقت میں کھڑا ہو کر لاکھوں ہنستے مسکراتے جوان تیرے سامنے پیش کردوں گا جو بالکل معصوم اور گناہوں سے بالکل پاک ہونگے، تب ہم جنہوں نے انکے گناہ سارے اپنے سر پر لئے ہیں تیرے سامنے کھڑے ہوں گے اور کہیں گے: ہم کو سزا دے، اگر تیرے لئے یہ ممکن ہے اور تجھ میں اتنی ہمت ہے!'' کیونکہ یہ تجھے سمجھ لینا چاہئے کہ میں بھی ویرانوں میں رہا ہوں، ٹڈیوں اور جڑوں پر بسر کی ہے، آزادی کی تیری طرح ثنا خوانی کی ہے۔ تیرا برگزیدہ شاگرد ہونے کی آرزو رکھی ہے . . . . لیکن میرے ہوش حواس موقعہ پر درست ہوگئے اور میں اپنی کوشش کو محض دیوانگی سمجھ کر اس سے باز آیا۔ میں ویرانوں سے نکل کر اُس جماعت میں شامل ہوگیا جو تیری تحریک کو راہ راست پر لا رہی تھی . . . . مجھے پورا یقین ہے کہ ہم ایک دن اس دنیا پر حکومت کریں گے، تجھ سے میں پھر کہتا ہوں، کل تو دیکھے گا کہ میری تابعدار قوم صرف ایک اشارہ پر بڑے انہماک سے لکڑیوں

کے اُس انبار میں آگ لگائے گی جس پر میں تجھے اس لئے جلاؤں گا کہ تو ہمارا کام بگاڑنے آیا ہے۔ کیونکہ اگر دنیا میں کوئی ایسا ہوا ہے جو اس سزا کا مستحق ہے تو وہ تو ہے۔ کل تجھے جلاؤں گا۔ بس مجھے جو کہنا تھا وہ کہہ چکا ؛

غزل

از جناب مصورِ جذبات جانشینِ میرؔ و غالبؔ میرزا ثاقبؔ لکھنوی مدظلہٗ

معلوم تھا یہ رسمِ دنیا نباہتا تھا   کہتا تھا میں کہ کیا ہے جب دل کراہتا تھا
بیگانے اور اپنے خوش تھے مری فنا سے   اُنکی بھی تھی یہ مرضی گردوں بھی چاہتا تھا
کوئی تو داد دیتا اس دردِ دل کی آخر   جب تم نہ بولتے تھے تب میں کراہتا تھا
کیا ضبطِ درد کرتا دل کا علاج لیکن   جو کچھ میں کہہ چکا تھا اس کو نباہتا تھا
برباد کر کے چھوڑا آپس کے مفسدوں نے   جو کچھ میں چاہتا تھا وہ دل نہ چاہتا تھا
پوچھو زمیں سے جو کچھ بیمارِ غم پہ گزری   ذرے تڑپ رہے تھے جس جا کراہتا تھا
محشر میں میری چُپ سے باقی رہی مروت   زخموں نے کہہ دیا سب جو کچھ میں چاہتا تھا
بے التفاتیوں سے دل مر گیا ہے ورنہ   کیا کیا نہ تھیں مرادیں کیا جی نہ چاہتا تھا

اب تک نہ سمجھی دنیا اس طولِ زندگی پر
تم سے فلک سے ثاقبؔ کیونکر نباہتا تھا

بردولی اور رعیت واڑی بندوبست

ترک موالات کی تحریک میں جب ابتدائی منازل طے ہو چکے تو ٹکس بند کرنیکی آخری منزل کا نمبر آیا کہ یہ دراصل پرامن ذریعہ سے حکومت وقت کے خلاف جنگ کا مرادف ہی۔ اور اگر کامیاب ہو جائے تو بے تیغ و تفنگ انتظام حکومت کو بند کر دینے کا سب سے موثر ذریعہ۔ اس کی شروع کرنے کے لئے ہمارے وسیع ملک کا جو حصہ مہاتما گاندھی اور انکے ساتھیوں نے منتخب کیا تھا وہ سورت کے ضلع میں ایک تحصیل ہی جس کا نام بردولی ہے۔ لوگوں کو بردولی سے طرح طرح کی امیدیں تھیں۔ وہاں کی تنظیم کے متعلق تمام ملک میں ایسی خبریں مشہور تھیں کہ حریت ہند کی فوج کا ہر سپاہی انہیں سن سنکر دل ہی دل میں خوش ہوتا تھا۔ یہیں سے مہاتما گاندھی نے وائسرائے کو وہ خط لکھا تھا جو ہمارے ملک کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گا لیکن یہی وہ مقام ہی جہاں اس تحریک کی تمام امنگوں اور تمام آرزوؤں کا خون ہو گیا۔ یہیں ترک موالات کی تحریک کی بنیادی کمزوریوں کا اقرار کیا گیا۔ اور اس وقت سے آزادی ہند کی کوشش کچھ ایسی دشواریوں میں پڑ گئی کہ آج تک ان سے نکلنا مشکل نظر آتا ہے۔ لیکن اس سب میں بردولی والو کا قصور نہ تھا۔ وہ اپنے فرض کو انجام دینے کے لئے تیار تھے۔ ملک کے دوسرے حصص میں تحریک قابو سے باہر نکل گئی، سردار کو با دل ناخواستہ تمام فوج کو روکنا پڑا، اور بنا بنایا کام بگڑ گیا۔

بردولی اس وقت جب ہوایں حریت کی تاثیر تھی کیا کچھ کرتا۔ اسکا اندازہ آج لوگ اس تحریک سے کر سکتے ہیں جو اس تحصیل میں اضافہ مالگذاری کے خلاف ہو رہی ہے۔ ناظرین غالبًا واقف ہوں گے کہ بردولی میں صوبہ بمبئی کے بیشتر حصہ کی طرح رعیت واری بندوبست ہے یعنی حکومت اور کاشتکاروں کے درمیان بنگال، بہار اور ممالک متحدہ کی طرح کوئی تیسرا

شخص (زمیندار) حائل نہیں بلکہ حکومت براہ راست کاشتکاروں سے مالگذاری وصول کرتی ہے۔ مالگذاری کا تعین عموماً ۳۰ سال کے لئے ہوتا ہے اور اس کے بعد اس میں ترمیم کیجاتی ہے (یعنی اضافہ!) اس مرتبہ تجویز تھی کہ اس تحصیل میں مالگذاری ۳۰ فیصدی کے حساب سے بڑھا دی جائے لیکن حکومت بمبئی نے ازراہ شفقت و غربا پروری صرف ۲۲ فیصد کا اضافہ کیا! اس اضافہ سے حکومت کی آمدنی میں کوئی سوا لاکھ روپیہ سالانہ زیادہ ہو جاتے ہیں۔

تحصیل کے "شورہ پشت" کسانوں نے اس اضافہ کو غلط بتایا۔ اور عذر یہ پیش کیا کہ انکی معاشی حالت میں ترقی نہیں بلکہ تنزل ہوا ہے۔ یہ اضافہ کیسا؟ انکا مطالبہ یہ تھا کہ ایک غیر جانبدار کمیشن تحقیقات کرے۔ اور اگر اس کی رائے میں اضافہ جائز ہو تو وہ ادا کرنے کو تیار رہیں۔ حکومت ظاہر ہے کہ اس قسم کے مشوروں پر عمل کرنے کی عادی نہیں۔ اس نے یہ تجویز مسترد کر دی۔ کسانوں نے اضافہ مالگذاری ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس "گستاخی" پر حکومت نے تادیب شروع کی۔ قرقیاں ہوئیں۔ نیلام کئے گئے۔ پنشنیں روکنے کی دھمکی دی گئی۔ زمینیں ضبط ہوئیں جبر و تشدد شروع کیا گیا اور دھمکی کے لئے حکومت کے وسائل جبر کا علم ہی کیا کم ہے۔

ہندوستان میں انگریزی حکومت نے مالگذاری وصول کرنے کے لئے جو کچھ مختلف اوقات میں کیا ہے اگر اسکا علم کسی کو ہو تو یہ جو کچھ اس "گستاخ" اور "سرکش" تحصیل کے ساتھ اس وقت کیا جا رہا ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس مالگذاری کی خاطر تو بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے گانوں کے گانوں مسمار کرا دئے تھے۔ زمینداروں کو بے خانماں بنا دیا تھا۔ دوسروں کے دلوں میں ہیبت و جبروت کا سکہ بٹھانے کے لئے بستیوں میں آگ لگا دی گئی تھی۔ اس مالگذاری کے لئے تو فوجوں اور توپوں کو نقل و حرکت کرنی پڑتی تھی۔ آج بردولی میں تو یہ دعویٰ ہے کہ کسانوں کی آمدنی اور مرفہ الحالی بڑھ گئی ہے۔ پہلے سنہ ۱۷۷۰ء میں جب بنگال میں قحط کی وجہ سے پلے سے زیادہ آبادی موت کے گھاٹ اتر چکی تھی تو بھی سنہ ۱۷۷۱ء میں گورنر بنگال نے اس پر فخر کیا تھا کہ امسال سال گذشتہ سے زیادہ مالگذاری وصول کی گئی۔ ہندوستان میں انگریزی

راج کا بہت بڑا کارنامہ بندوبست استمراری سمجھا جاتا ہے جس کے متعلق گمان ہے کہ اس نے بنگال اور بعض دیگر حصص ملک میں ایک نئے "طبقہ اشراف" کی بنیاد ڈالی۔ لیکن اسی مالگذاری کے وصول کرنے کے لیے ان "اشراف" کی جائدادیں نیلام پر چڑھائی جاتی تھیں اور یہ نیلام کس پیمانہ پر ہوتے تھے؟ اسکا اندازہ اس سے لگائیے کہ ۱۷۹۶ء میں صرف ضلع ڈھاکہ میں ۲½ لاکھ روپیہ سے اوپر کی مالگذاری کی جائدادیں نیلام کر دی گئیں۔ اسی سال کل صوبہ میں ۱۱ فیصدی سے زائد مالگذاری کا علاقہ بقایا وصول کرنے کے لئے نیلام کیا گیا! ایک سال بعد پھر کوئی ۵ فیصدی مالگذاری کی جائدادیں یوں ہی نیلام ہوئیں۔ کوئی ۲۲ سال کے اندر اندر اس نئے "طبقہ اشراف" کی دائمی املاک میں سے تقریباً نصف اراضیات بقایا مالگذاری وصول کرنے کے لئے عام نیلام میں بک چکی تھیں! اس مالگذاری میں اضافہ کی بے معنی ہوس نے ہی تو ۱۷۵۳ء میں کرناٹک میں ایک پوری بغاوت کرا دی تھی جس میں ہزاروں مالکان آراضی کو اس لئے تہ تیغ کر دیا گیا کہ وہ ۱۰ فیصدی کے اضافہ کو ناجائز سمجھتے تھے!

جسے یہ سب کچھ معلوم ہے اسے حیرت ہوتی ہے کہ آج لوگ ۱۲ فیصدی کے اضافہ پر مالگذاری دینے سے انکار کرتے ہیں۔ اور ابھی تک صرف جیل بھیجنے یا قرقی کی سزائیں دی گئی ہیں! لیکن اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مثالیں جو اوپر درج کی گئیں سب کی سب ان علاقوں کی ہیں جہاں زمینداروں کا تسلط تھا۔ انکی حیثیت اکثر راجوں نوابوں کی سی تھی اور اگر ان سے ایسا سلوک نہ کیا جاتا تو ملک میں برطانوی اقتدار کا قیام مشکل ہو جاتا۔ خود انگریزوں نے جس وقت یہ مذکورہ بالا کارروائیاں کی ہیں تو اسی قسم کے عذر پیش کر کے بلکہ کبھی کبھی تو "بے بس کسانوں" کو ان غیر ذمہ دار زمینداروں کے ظلم سے بچانے کے دعوے کے ساتھ۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اسی "ہمدردی انسانی" کے جذبہ نے بعد میں انگریزی مدبرین کو اس پر آمادہ کیا کہ بجائے اس کے کہ حکومت اور کسان کے درمیان زمیندار کے وجود کو قائم رکھیں بہتر یہی ہے کہ براہ راست کسان سے معاملہ کیا جائے۔ مورخین نے جہاں ہندوستان میں سلطنت برطانوی کے برکات کا ادر

بہت کچھ ذکر کیا ہے وہاں اس فیصلہ کو کہ رعیت سے مالگذاری وصول کرنے کے معاملہ میں حکومت کا براہ راست تعلق ہو اس پر محمول کیا ہے کہ مذکورہ بالا واقعات کے بعد انگریزوں میں ایک نیا اور گہرا احساس ذمہ داری پیدا ہو گیا تھا اور وہ دل سے ہندوستانی قوم کی فلاح و بہبود کے آرزومند ہوگئے تھے۔ چنانچہ بعض ایسے انگریزوں نے جو ہندوستان کے قدیم اداروں سے دلی تعلق کا اظہار کرتے تھے یعنی منرو، الفنسٹن، اور مٹکاف نے رعیت واری بندوبست کی تجویز پیش کی اور حکومت و رعیت میں بلا واسطہ تعلق پیدا کرایا۔ یہ لوگ اپنی تحریروں میں اس تباہی پر بہت کچھ روئے ہیں جو کارنوالس نے محض انگریزی نمونہ پر ایک طبقہ اشراف قائم کرنے کی خاطر برپا کی اور ان تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی دیہات کی خصوصیات کو زمینداروں کے ہاتھوں مٹتا دیکھکر انکا دل بھر آتا ہے۔ کیا تعجب ہے کہ تعلیم یافتہ ہندوستانی ان انگریز مدبرین کا نام آجتک عزت و احترام کے ساتھ لیتے ہیں۔ مجھے خیال پڑتا ہے کہ انجمن خدام ہند کی عمارت میں گوکھلے آنجہانی کے مکان کے اندر انہیں سے بعض کی تصویریں آجتک بطور اعتراف احسان شناسی زینت دیوار ہیں!

انسانی نیت کی گہرائیوں میں ایسے سربستہ راز ہیں جن کا انکشاف یقین کے ساتھ کوئی نہیں کرسکتا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ رعیت واری بندوبست کے پہلے مویدوں کی نیتیں خراب تھیں، اور کوئی نہیں جانتا کہ ان میں اغراض سلطنت کو کسانوں کے مفاد سے زیادہ دخل تھا لیکن افراد کی نیتوں سے قطع نظر کرکے کل نظام کے اعمال اور رویہ پر نظر ڈالی جائے تو شاید واضح ہو جائیگا کہ رعیت واری بندوبست کو بھی معقول وجوہ کے ساتھ ان کارناموں میں نہیں شمار کیا جاسکتا جن کی بنا پر ایک قوم دوسری قوم پر حکومت کرنیکو حق بجانب ثابت کرسکے۔

ایسے مورخ کی نظر جو انگریزی سیرت قومی سے واقف ہے اور جانتا ہے کہ ہندوستان پر حکومت کرنے کا "بوجھ" انگریزوں نے محض خلق خدا کی خدمت کی خاطر اپنے سر نہیں لے لیا بلکہ اپنی تجارتی و مالی مفاد کی خاطر ایسا کیا ہے۔ صاف دیکھ سکتی ہے کہ پہلے جب زمینداروں سے معاملہ کیا گیا تھا اس وقت کمپنی بہادر کو اپنی سیاسی و فوجی قوت پر پورا پورا بھروسا نہ تھا اور ایسی مالی مشکلات کا

سامنا تھا کہ اگر وقت پر روپیہ وصول ہو سکا تو سارا کاروبار بیٹھ جائے گا۔ اس اندیشہ کو مدنظر رکھکر اس وقت زمینداروں سے تصفیہ کیا گیا اور موجودہ پریشانیوں کو رفع کرنیکے لئے اس وقت جو زیادہ سے زیادہ مل سکتا تھا اسے لیکر مستقبل کے فوائد کو نظر انداز کیا گیا۔ لیکن اب کمپنی کا سارے ملک میں اقتدار مسلم تھا۔ مالی مشکلات کی نوعیت بھی وہ نہ رہی تھی۔ پھر خالی تجارت، لین دین منافع ایسی چیزیں نہ تھیں کہ حکمراں طبقہ کے دل میں وہ احساس ذمہ داری پیدا کر سکیں جو ہندوستان جیسے وسیع براعظم پر حکومت کرنے والوں کے لیے ازبس ضروری ہے۔ انگریز بھی آدمی ہیں آخر کہاں تک صدی بعد صدی یہ یقین رکھ کر حکومت کر سکتے ہیں کہ ہم یہاں صرف تجارتی نفع کے لئے ہیں۔ حکومت کرنے کے لئے کسی عمیق دھوکہ اور ذہنی خود فریبی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ حکمراں انگریز کو سکھایا جاتا ہے کہ وہ دنیا میں ہندوستاں کی بے زبان مخلوق کا حامی و مددگار ہے۔ وہ اب انگلستان کی عظمت کی بنیاد ہندوستان کی فلاح پر رکھنا چاہتا ہے۔ یورپ کی لبرل تحریک اس کے تصورات پر اثر ڈالتی ہے اور وہ اپنے کو فریب دے لیتا ہے کہ وہ جو کچھ کرتا ہے ہندوستان کے بھلے کے لئے کرتا ہے اور اس خود فریبی سے وہ اخلاقی قوت حاصل کرتا ہے جس کے بغیر حکومت کا کام ناممکن ہے۔ انہیں خود فریبیوں میں یہ ہے کہ ہم رعیت سے بلا واسطہ تعلق پیدا کر کے اس کے حقوق کی حفاظت کریں گے اور اس پر زمیندار کے ہاتھوں ظلم نہ ہونے دینگے۔

چنانچہ رعیت داری بندوبست کی تجویز پیش کرنیوالے انگریز سب کے سب کسان کی حق تلفی کا مرثیہ پڑھتے ہیں اور اس کی مدد و دستگیری کو اپنا مقصد حیات بتاتے ہیں۔ انکی تحریریں سب کی سب اسی سے بھری پڑی ہیں۔ لیکن ذرا غور سے دیکھئے تو کہیں کہیں انسانی کمزوری اپنی جھلک دکھا دیتی ہے۔ ان مدبرین میں سے سب سے "نیک نیت" اور ہندوستان کی سب سے بڑے دوست سر طامس منرو اپنے ایک مراسلہ میں لکھتے ہیں کہ "اس ملک میں یورپ کی طرح اسکی کوئی ضرورت نہیں کہ یہاں بڑے بڑے مالدار زمیندار ہوں۔ اور اگر ایسی ایک جماعت تیار بھی ہو سکے تو آخر میں وہ نفع سے زیادہ نقصان کا باعث ہوگی۔ بڑے زمیندار کچھ عرصہ بعد پردیسی

حکومت سے بیزار ہو جائیں گے۔ اور چونکہ انکے پاس دولت ہوگی اور انکی تعداد کم ہوگی اس لئے یہ آسانی سے متحد ہو سکیں گے۔ برخلاف اس کے عام کسانوں میں نہ اس کی خواہش پیدا ہوگی نہ انکے پاس اس کے ذرائع موجود ہوں گے۔"[۵۱]

لارڈ ولیم بنٹنک نے ۲۹ اپریل ۱۸۳۰ء کو اپنی حکومت کے سامنے ولیم تھیکرے کی ایک تحریر زمینداری بندوبست کے متعلق پیش کی جس میں فاضل مصنف لکھتا ہے کہ "اس سے حکومت کے اختیارات کم ہو جاتے ہیں اور ملکوں میں یہ اچھا ہے کہ حکمراں کے اختیارات کم کئے جائیں لیکن یہاں تو حکومت کو اپنے ہاتھ میں اتنے اختیارات رکھنے چاہئیں جتنے شخصی ملکیت کے منافی نہ ہوں" آگے چلکر ان فوائد کا ذکر کرتے ہوئے جو انگلستان کو زمینداروں سے پہنچے ہیں یہ فرماتے ہیں "لیکن ہندوستان میں اس بلند حوصلگی، احساس نفس، اور تفکر و تدبر کو جو دولت سے پیدا ہو جاتا ہے دبانا چاہئے۔ یہ چیزیں ہمارے اقتدار اور ہمارے اغراض کے قطعی خلاف ہیں۔ ہم ہندوستان میں بڑے بڑے جنرل، مدبر، مقنن نہیں چاہتے، ہمیں بس محنتی کسان درکار ہیں"[۵۲] ہندوستان کے یہ محسن واقعی محسن ہوں یا نہوں صاف گو اور راست باز ضرور معلوم ہوتے ہیں!۔

تصریحات بالا سے رعیت داری طریق پر بندوبست کرنے میں خود اس کے مجوزین کی نیت کا معاملہ مشتبہ ہو جاتا ہے۔ اور پھر بعد کو عمل میں تو اس احسان سے بھی بس محسن ہی کا فائدہ ہوا ہے۔ غریب کسانوں پر تو اس میں کسی طرح زمینداری بندوبست کے مقابلہ میں کم مصیبت نہ رہی زمیندار کے نہ ہونے سے جو کچھ بچا وہ حکومت نے کبھی نہ چھوڑا۔ اور چونکہ حکومت ایک غیر شخصی چیز ہے اس لئے وصولیابی میں مروت و پاسداری اور دیرینہ تعلقات کا خیال جو کبھی کبھی اچھے زمینداروں پر ضرور اثر کرتا ہے یہاں کچھ نہ کر سکا۔ زمینداری علاقوں کی طرح یہاں بھی

---

[۵۱] منرو کا مراسلہ بنام ٹیری مورخہ ۲۶ اگست ۱۸۲۵ء

[۵۲] Examinations of the Principle and Policy of the Govt. of Br. India: London, 1829 pp. 16, 19-20.

کسانوں پر انکی بساط سے زائد لگان لگایا گیا۔ ایک صاف گو انگریز نے لکھا ہے " نہ ہم اس حقیقت کو چھپا سکتے ہیں نہ اس سے انکار ممکن ہے کہ اس رعیت واری بندوبست کا مقصد یہ ہے کہ لگان کی شکل میں حکومت کے لئے جو زیادہ سے زیادہ وصول ہو سکے وہ وصول کیا جائے"[۵۱] جان برائٹ نے ۱۸۵۸ء میں دارالعوام کے سامنے اقرار کیا کہ " ہندوستان کے اکثر حصوں میں خصوصاً صوبہ مدراس میں تمام آبادی کسانوں کی ہے اور حکومت انکے سر پر کوڑی برابر ایک پیچ کو کسے جاتی ہے، رعیت کو بس مٹھی بھر چاول روز ملتے ہیں اور زمین کی باقی پیداوار ایسٹ انڈیا کمپنی کے خزانہ میں پہنچ جاتی ہے "

رعیت داری بندوبست کی تجویز پیش کرنے والوں کے ساتھ ناانصافی ہوگی اگر ہم اس حقیقت کو پوشیدہ رکھیں کہ انکی خواہش یہ تھی کہ رعیت واری بندوبست میں مالگذاری ہمیشہ کے لئے ایک ہی مقرر ہو جائے تاکہ اجناس زرعی کی قیمتیں جب بڑھیں تو اسکا تمام فائدہ کسانوں کو ملے۔ مثلاً سر طامس منرو نے دارالعوام کی ایک کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے ۱۸۱۳ء میں صاف صاف کہا کہ " رعیت واری نظام میں رعیت جس زمین پر قابض ہوتی ہے اسکی مالک بھی ہوتی ہے اور خود اس پر کاشت کرتی ہے اور اسکو اختیار ہے کہ ہمارے مقررہ لگان پر جب تک چاہے اس زمین کو اپنے پاس رکھے۔ یہ ہمیشہ کے لئے اس کی ہے اور اس کے لگان پر کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا " لیکن یہ صورت حال کہاں باقی رہی؟ رعیت داری علاقوں میں بھی ہر ۳۰ برس بعد بندوبست پر نظر ثانی اور اضافے ہونے لگے۔ ۱۸۸۲ء میں لارڈ رپن کے ایما سے حکومت مدراس نے فیصلہ کیا کہ " جبتک اجناس کی قیمت میں کوئی نمایاں اضافہ نہ ہو مالگذاری میں بھی اضافہ نہ کیا جائے " لیکن اس قسم کے مستقل ارادے انگریزی حکومت کے اصول کے بالکل خلاف ہیں۔ چنانچہ وزیر ہند نے ۲ سال بعد ہی اس اصول کو مسترد کر دیا۔ جس کسان پر احسان کیا گیا تھا اس کے سر پر مالگذاری کا

---

[۵۱] H. J. Tucker. Memorials of the Indian Govt. London 1853, p. 113.

کا غیر واجب مطالبہ رہا اور ساتھ ساتھ امکان اضافہ کی بشارت!

رعیت واری علاقوں میں مطالبہ مالگذاری کے غیر واجب ثابت کرنے کے لئے ہمیں بس یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ہندوستانی کسان بالطبع سرکش نہیں مفلس و نادار ہے، مقدمہ بازی سے گھبراتا ہے اور اپنی بے بسی کی وجہ سے ناجائز مطالبات تک کو برداشت کر لیتا ہے۔ لیکن جب مطالبات کا بوجھ اسقدر ہو جائے کہ اٹھ ہی نہ سکے تو بیچارہ کاندھا ڈال دیتا ہے۔ وہ اگر مطالبہ مالگذاری کی ادائیگی سے کبھی انکار کرتا ہے تو سمجھنا چاہئے کہ ادائیگی کی کسی طرح صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ آج بردولی میں "شورہ پشت" سیاسی لوگ غریب کسانوں کو بہکا کر مصیبت میں ڈال رہے ہیں تو ہم اس موجودہ معاملہ کو بطور ثبوت کے پیش نہیں کرتے بلکہ چند اور واقعات کا ذکر کرتے ہیں جن میں سیاسی شورش کی آمیزش کا شائبہ بھی نہیں۔ یہ اطلاعیں سب سرکاری کاغذات سے ماخوذ ہیں۔ ملاحظہ ہوں:۔

سنہ ۱۸۷۱-۷۲: سورت کے ضلع میں گورنمنٹ کو ۷۶۴۷۷ روپیہ مالگذاری کے معاف کرنے پڑے، بروچ میں ۹۰۲۰۶

سنہ ۱۸۷۳-۷۴: گجرات میں مالگذاری جمع کرنے میں بہت دشواریاں ہوئیں۔ احمد آباد میں وصول مالگذاری کے لئے ۲۶۶۳۳ آدمیوں کو نوٹس دئے گئے، کیرا میں ۱۴۵۱۳ کو، بروچ میں ۴۱۰۴ کو، سورت میں ۵۹۲۲۳ کو۔

سنہ ۱۸۷۷-۷۸: صرف بروچ کے ضلع میں منقولہ جائداد کی ۷۱۹۱ قرقیاں ہوئیں۔ اور باوجود اس کے تقریباً سوا لاکھ روپیہ وصول نہ ہو سکا۔

سنہ ۱۸۷۸-۷۹: بروچ ہی میں ۹۹۹۶ آدمیوں کو نوٹس دئے گئے، ۲۵۶۵ قرقیاں ہوئیں، پھر بھی ۱۶۷۹۸۹ روپیہ غیر وصول شدہ رہ گئے۔ اور یکم اپریل اور ۳۱ جولائی سنہ ۱۹۰۱ء کے درمیان عدم ادائیگی مالگذاری کی وجہ سے ان احمد آباد، کیرا، بروچ اور سورت کے اضلاع میں تقریباً ۵ ہزار ایکڑ زمین ضبط کی گئی۔

یہ اعداد و شمار صاف بتاتے ہیں کہ مطالبہ مالگذاری ناواجب ہے اور کسان اسے آسانی سے ادا نہیں کر سکتے۔ آیئے دیکھیں کہ آخر کیوں؟

مجلس واضع قوانین بمبئی کے ایک رکن آنریبل گوکلداس پارکھ نے موجودہ بردولی کے واقعہ سے کئی سال قبل اندازہ لگایا تھا کہ گورنمنٹ کل پیداوار زمین کا ۲۴ فیصدی کسان سے لے لیتی ہے کرنل پریسکاٹ مہتمم محکمہ سروے مصر تھے کہ نہیں حکومت کل پیداوار کا صرف ۲۰ فیصدی لیتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ مطالبہ کم ہے یا زیادہ۔ مختلف حالات میں یہی مطالبہ کم بھی ہو سکتا ہے زیادہ بھی۔ اگر کسی کسان کی آمدنی ۵۰۰۰ روپیہ سال ہو تو اسمیں سے ۱۰۰۰ کا مطالبہ اس پر اتنا گراں نہ گزریگا جتنا کہ ۵۰ روپیہ سال کی آمدنی پر ۱۰ روپیہ کا مطالبہ۔ حالانکہ شرح فیصدی وہی ہے۔

اب دیکھئے کہ گجرات میں کسانوں کی کیا حالت ہے۔ کیرا میں ۵۵ فیصدی کسانوں کے پاس ۵ ایکڑ سے کم زمین ہے، سورت میں ۴۷ فیصدی کے پاس، بھڑوچ میں ۳۸ فیصدی کے پاس، احمدآباد میں ۴۳ فیصدی کے پاس۔ اس علاقہ میں ایک کسان کے اوسط سالانہ اخراجات کا تخمینہ خود حکومت کے مہتمم مسٹر ڈے نے مبلغ ۲۵۱ روپیہ کیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جس کسان کے پاس کل ۵ ایکڑ زمین ہو اسے زندہ رہنے اور اپنا کام کر سکنے کے لئے فی ایکڑ ۵۰ روپیہ سال پیدا کرنا چاہئے۔ لیکن خود حکومت کیطرف سے جو تجربے کئے گئے ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ سوائے نیشکر یا ترکاریوں وغیرہ کی کاشت کے فی ایکڑ اتنی آمدنی ممکن نہیں۔ ۱۰۵ تجربوں میں سے صرف ۱۲ میں ۵۰ روپیہ فی ایکڑ پیداوار ہوئی اور ۵۸ تجربوں میں تو ۲۵ فی ایکڑ سے بھی کم رہی۔ یعنی اکثر کسان ۱۰ ایکڑ زمین سے بھی اپنا سال بھر کا معمولی خرچ نہیں نکال سکتے۔ اور کسان آبادی کی بڑی اکثریت کے پاس ۱۰ ایکڑ سے کم ہی زمین ہے۔ جن لوگوں کی آمدنی زندگی کے دن گذارنے کے لئے بھی کافی نہ ہو ان پر تو ہر مطالبہ بھاری ہوگا چہ جائیکہ کل پیداوار کا ایک چوتھائی حکومت لے لے۔

لیکن کسانوں کو زمینداروں کے ظلم سے بچانیوالی حکومت رعیت داری علاقوں میں برابر یہ کرتی ہے اور اگر کوئی اس ناجائز مطالبہ پر نہیں اسمیں ناجائز اضافہ پر کچھ کہتا سنتا ہے تو ملک معظم کے حکم اور چند غیر ذمہ دار لوگوں کی رائے کے مقابلہ کا سوال پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ حکومت ملک معظم کے حکم کو منوانے کے لئے سب کچھ کرنے پر تیار ہو جاتی ہے!

اسلام اور تعلیم جدید

[ذیل کا مضمون مشہور فاضل مارمڈیوک پکتھال نے یورپ کے رسالہ "ریویو آف نیشنس" میں لکھا تھا جو ایک مغربی نو مسلم فیلکس والی کی زیر ادارت نہایت آب و تاب سے شائع ہوتا ہے ہم اسکا ایک آزاد اردو ترجمہ ہدیہ ناظرین کرتے ہیں]

اسلام میں تعلیم کا مفہوم نہایت وسیع ہے۔ اسلام اور تعلیم جدید دونوں کی حقیقت اور ماہیت کے متعلق لوگ عجیب عجیب غلط فہمیوں اور شکوک میں مبتلا ہیں۔ اسلام کے امانت داروں کے نزدیک مغربی تعلیم کفر و الحاد کے ہم معنی ہے جس میں وہ اسلام کے حرم کو بہرحال مامون و مصئون رکھنا چاہتے ہیں۔

اپنوں کی طرح اغیار بھی اسی گمراہی اور بے بصری کا شکار ہیں لارڈ کرومر کا فرمودہ ہے کہ "اگر اسلام کو مغربیت کی سطح پر لایا جائے گا اور عہد جدید کی ضروریات کے دوش بدوش کیا جائے گا تو اسلام اسلام نہ رہے گا۔" جہل مرکب کی اس سے زیادہ درخشاں مثال مشکل سے مل سکتی ہے۔ کس کو خبر ہے کہ اسلام زندہ ترین مذہب ہے۔ قرآن حکیم جدید ترین کتاب ہے، محمد (صلعم) تازہ ترین شخصیت ہیں! یورپ کے رنگ تجدید و اصلاح کو اسلام سے طبعی تعلق ہونا چاہیے۔ اسلام کا دامن تمام یورپین علوم و فنون اور جملہ سائنٹفک ایجادات و اختراعات سے پُر ہونا چاہیئے۔ وہ اسکی قدرتی ملکیت ہیں اور بالفاظ حدیث نبوی (الحکمۃ ضالۃ المومن) مسلمانوں کی "متاع گم گشتہ" جس کی انہیں "اپنی اولین فرصت میں بازیافت کر لینی چاہیئے (بحکم اینما وجدھا فھو احق بھا)

اسلامی تعلیم کی وسعت تخیل، تعلیم میں "دینی اور "دنیاوی" کی تفریق کو برداشت نہیں کر سکتی۔ خالص قرآنی نقطہ نظر سے تمام تعلیم دینی تعلیم ہے! جو وقت مذہبی علوم کو "علم الفقہ" کے تنگ دائرے میں مقید کیا جاتا ہے تو اجتہاد فقہی کی ایک عظیم الشان بدعت سیئہ کا ثبوت دیا

جاتا ہے۔ اگر فقہ سے عبارت ہیں وہ احکام واوامر جو خدا کی شریعت، دنیا اور اہل دنیا کے لئے دنیا چاہتی ہے تو بداہتہً انکو اتنا ہی وسیع و ہمہ گیر ہونا چاہئے جتنی کہ خود دنیا ہے۔ کسی بادشاہ کے آئین و قوانین کو اُسکی حدود سلطنت کے ہم وسعت ہونا ایک پیش پا افتادہ حقیقت ہے انسان دنیا میں آسمان کے شہنشاہ کا وائسرائے (خلیفہ) ہے اور یہ کرۂ ارض اس کو اس کی جاگیر میں دیا گیا ہے۔ بحیثیت حاکم کے اُس کو اس "ملک خدا" کے چپہ چپہ سے واقف ہونا چاہئے اور گویا تقرر خلافت اور "تمکن فی الارض" کے بعد اُسکا اولین فرض ساری دنیا کا جغرافیہ سیکھنا ہے!

قل سیروا فی الارض فانظروا کیف بدء الخلق! نہ صرف کتابی جغرافیہ خوانی بلکہ جغرافی سیاحت و ارض پیمائی اور جغرافی تحقیقات و اکتشافات کا حکم قطعی اس نص قرآنی سے ملتا ہے۔ تاریخ میں مسلمانوں کا عمل بھی بعینہ یہی نظر آتا ہے کہ جب وہ کسی نئے ملک پر قابض ہوتے تھے تو اُنکا پہلا کام یہ ہوتا تھا کہ وہاں کا مکمل جغرافیہ (طبعی و تمدنی) تیار کر کے مستقر خلافت کو بھیجتے۔ ملت اسلامی کو اپنے جغرافیہ دانوں، "جہاں گشتوں"، سیاحوں، اثریوں، اور سفرنامہ نویسوں پر ناز ہے۔

قرآن کا ایک اور موکد اور بالتکرار حکم یہ بھی ہے کہ خدا کی جس دنیا میں ایک ذمہ دار عامل بنکر آیا ہے ذرا اُس میں چل پھر کر دیکھے کہ اُس میں کیا کیا حوادث تاریخی ظہور میں آئے ہیں تاکہ وہ سماوی احکم الحاکمین کے اُن قوانین معنوی سے آگاہ و متنبہ ہو جو زمین میں کارفرما ہیں اور جن سے قوموں کا عروج و زوال وابستہ ہے۔ قرآن فلسفہ تاریخ اور اجتماعیات کے معرکۃ الآراء مسئلہ "انقلاب الامم" کی ایک بے نظیر اور حیرت انگیز کتاب ہے بلاشبہ قرآن حکیم کا یہ اہم ترین موضوع ہے اور اُس پر اس نے سیر حاصل بحثیں کی ہیں جو پڑھنے اور لطف لینے کے قابل ہیں۔ حق یہ ہے کہ وہ تاریخ کی بہترین تعبیر ہیں اور تاریخ عالم کا اگر اسکی روشنی میں مطالعہ کیا جائے تو وہ ایک آئینہ نظر آئے۔ قل سیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبۃ

المجرمین (یا مکذبین)

خدائے بزرگ نے ان مباحث قرآنی میں وہ نوامیس فطرت بے نقاب کئے ہیں جن سے مستبد حکومتیں اور موذی قوتیں جب اپنی پالیسی کو متصادم کرتی ہیں تو خود مع اپنی ساری عظمت وشوکت کے پاش پاش ہوجاتی ہیں۔ پھر یہ روحانی قوانین چونکہ خدائے قدوس کی لسان صدق سے ادا ہوئے ہیں۔ اس لئے وہ اس عیب سے پاک اور بالاتر ہیں جس نے تاریخ کو "پروپگینڈا" بنادیا ہے اور اس کو بجا طور سے "سیاسیات سابقہ" کا ناقابل رشک لقب دیدیا ہے چنانچہ اس تاریخی نقرے نے تاریخی لٹریچر کے سارے دفتر بے معنی کی ساقط الاعتباری کو طشت از بام کردیا ہے کہ:

"تاریخ کبھی تاریخ کے لئے نہیں لکھی گئی"

مگر قرآنی تاریخ امم کا طغرائے امتیاز یہ ہے کہ

ان ہذا لہو القصص الحق!

مذکورہ بالا تقریر سے معلوم ہوا ہوگا کہ قرآن نہ صرف جملہ مادی علوم کی مسلمانوں سے تحصیل کرانا چاہتا ہے بلکہ انکی اندرونی معنویت سے بھی بدرجہ اتم آشنا کرانے پر مصر ہے اس لئے تعلیم وتعلم کا قرآنی مطمح نظر متداول طریق تعلیم سے بھی زیادہ بالغ نظری اور وسعت پسندی کا متقاضی ہے شاید ہم کو کہنا چاہیئے کہ اسلام کے ماتحت دینی تعلیم نہ صرف یہ کہ "فقہ" کی مفروضہ تنگنائے میں محدود نہیں ہے اور تعلیم عمومی کے "کل" کا "جز" نہیں بلکہ خود یہ کل اس کی آفاق گیر "کلیت" کا ایک چھوٹا سا "جز" ہے! اس لئے کہ وہ مادہ اور روح، جسم وجان، قشر ومغز، خلق وامر دونوں پر حاوی ہے۔ اور اس امتیاز وتکمیل سے عہد حاضر کے بھی اکثر علوم ہنوز عاری ہیں۔

قرآن ایک خالص علمی کتاب ہے۔ اسکی سب سے زیادہ نمایاں ودرخشاں، مرکزی وعمومی خصوصیت اسکا یہی علمی وتعلمی زاویۂ نگاہ ہے۔ وہ قدم قدم پر اپنے مخاطبین کو مشاہدہ

و تجربہ، فکر و نظر، تعقل و تدبر کی دعوت دیتا ہے۔ وہ اصولی تجربے اور منطق استقرا، کا اولین بانی ہے مسلمانوں کو "اولو الالباب" "قوم یتفکرون" "قوم یتذکرون" "قوم یعقلون" وغیرہم کے گوناگوں القاب سے خطاب کرتا ہے اور مسلم اور عاقل، اسلام اور علم اور دین و حکمت کو مترادف الفاظ کی طرح بولتا ہے! قرآن خود اپنے تئیں "العلم" کہتا ہے، خدا کے برگزیدہ ترین نبی کا وظیفہ۔ "رب زدنی علما" بتاتا ہے خود پیغام آسمانی کا فتح باب "علم و قلم" سے کرتا ہے (علم بالقلم) اور ایک مستقل سورۃ کا آغاز ہی "قلم و رقم" سے کرتا ہے (ن والقلم وما یسطرون) ذہن و دماغ، عقل و خرد، انصاف و دیانت، اصول و باقاعدگی سے اسکی پیہم اپیلیں غیر مختتم اور نا متناہی ہیں ایک موقع پر وہ اہل جہنم کی علامت ہی یہی بتاتا ہے کہ وہ اپنے حواس خمسہ سے کام نہیں لیتے (ولقد ذرأنا لجہنم الآیہ) مشکل سے کوئی سائنس کی کتاب قرآن حکیم سے زیادہ سائنٹفک مزاج رکھتی ہوگی۔ قرآن کی ساری روح اسکی تمام ذہنیت یکسر سائنس آموز اور سائنس نواز ہے وہ اپنا سب سے زیادہ ممتاز لقب "کتاب حکیم" رکھنا چاہتا ہے سائنس کو شکایت ہے کہ،

There is more religion in Science

than Science in religion.

(سائنس میں اُس سے زیادہ مذہب ہے جتنا کہ مذہب میں سائنس ہے) لیکن قرآن کے روبرو یہ شکوہ کیا اسکا مصداق نہیں کہ

الٹی شکایتیں ہوئیں احسان تو گیا؟!

اسلام سائنس کا سب سے بڑا سرپرست ہے، اور دنیا میں سائنس اسلام کا سب سے بڑا "حلیف" (نہ کہ "حریف" جیسا کہ اکثر ہمارا کورانہ فقدان بصیرت ہم کو یقین دلاتا ہے)

جس چیز کو سائنس کے طبعی علوم، قوانین فطرت کہتے ہیں، لسان قرآنی میں اُنہی کا نام "کلمات اللہ" اور "آیات اللہ" ہے جن کے ذکر سے قرآن کے صفحات لبریز ہیں۔ انکا علم حاصل کرنا دنیا کے نزدیک علوم مادی "وغیر مذہبی" کی تحصیل ہوگی لیکن ایک قرآن خوان مسلم کے لئے

وہ لغوی معنی میں "تلاوت قرآن اور "قیامِ صلوٰۃ" ہے! (الذین یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبہم ویتفکرون فی خلق السمٰوات والارض)

اسلام جسم وروح ہر دو کی آزادی کا علمبردار ہے۔ وہ تمام مادیات و روحانیات کا منتہاء اخیر اور منزلِ مقصود "فلاح" کو قرار دیتا ہے جو اہل سائنس کے اصل الاصول یعنی قانون ارتقا کے لفظ بہ لفظ ہم معنی ہے۔

لیکن باینہمہ سائنس پرست یورپ کو مسلمان نہیں کہا جا سکتا۔ اہل یورپ ایک معنی میں بے نظیر مسلمان ہیں مگر ان کی اسلام کی نوعیت وہی ہے جو آنحضرتؐ کے ایک ناقدانہ قول میں بیان کی گئی ہے یعنی یہ کہ

آمن لسانہ وکفر قلبہ

بعینہ اس کے برعکس حالت مسلمانوں کی ہے اور عقائد صحیح کے ساتھ انکی بے عملی زندگی اس مقولہ کی مصداق ہے، کہ

آمنوا قلوبہم وکفروا ایدیہم!

پس یورپ کا دل اور مسلمانوں کا جسم کافر ہے۔ علمائے یورپ کی زبانوں پر حقائق ومعارف کے دریا بہتے ہیں لیکن وہ اللظالمین الاخسارا کے مخاطب بنکر رہ گئے۔ انہوں نے اپنے غیر معمولی وسائل وذرائع سے بجائے داؤدؑ وسلیمانؑ کی فرعون وہامان بننے کو ترجیح دی۔ ادہر مسلمانانِ عالم کے قلوب قطعاً مومن قانت ہیں۔ لیکن انکی عملی روش بالکل کافرانہ، خدا فراموشانہ اور اس لئے خود فراموشانہ ہے۔ (نسوا اللہ فنسی انفسہم)۔

یورپ کی کافرمزاج سائنس اور اس کے دامن میں جو ہلاکت بار آلات ومخترعات آئے وہ سب مل کر اسی غلط ذہنیت کی وجہ سے خدا کی دنیا اور بنی آدم کے لئے عذاب بن گئے۔ لیکن یہ انکا طبعی خاصہ نہ تھا بلکہ انکی ہوائے نفس اور استبداد پسندی انکی ذمہ دار ہے جس نے ان کو اپنا آلۂ کار بنا لیا۔ متمدن اور سائنس مآب اور ایجاد پرست یورپ کو چھوڑ دیجئے۔ نا آشنائے

سائنس مشرق کے "خداساز دیہات" کے اندر کسی چولھے کی آگ کو دیکھئے، یہ تو کسی سائنسدان مکتشف و موجد کی کوئی مہلک ایجاد نہیں ہے بلکہ خدا کی الہام کردہ ایک "نعمت و آیت" ہے لیکن چولھا گرم کرنے اور ہانڈی پکانے کے کام کو چھوڑ کر اسی معصوم اور بے ضرر چیز سے اگر ہمسایوں کے چھپروں کی آتش زنی کا کام لیا جانے لگے تو کیا یہ آگ بھی جرمن ہاوٹزروں کے آتش خوار جہاں سوز دہانوں کی کم از کم فہرست تحتانی میں داخل نہ ہو جائیگی؟

پھر اصل شے ان علوم و فنون کی غرض و غایت اور انکا مصرف و محل استعمال ہے اگر اُن میں راست روی اور انسانیت دوستی کو اپنا نصب العین بنایا جائے تو سائنس کے معلوم کردہ جملہ معارف اور اُس کے ایجاد کردہ تمام آلات دنیا کے لئے معاً آیۂ رحمت بنجائیں اور خود یہ بدنام و ملعون سائنس اہل سائنس کو اول درجہ کا عارف باللہ اور محسن خلق بنا دے۔ قرآن حکیم نے اپنے صفحات میں ایمان آموزی اور تلقین یقین کی غرض سے انہیں چیزوں کو وسیلۂ کار بنایا ہے جو سائنس کی زبان سے مظاہر فطرت اور قوانین نیچر کہلاتے ہیں لیکن لسان الٰہی میں "آیات و معجزات"!

مسلمانانِ عالم کا فرض ہے کہ وہ اسلام اور تعلیم جدید کی اس حقیقت اور واقعیت سے آشنا ہوں۔ سائنس کو تمام و کمال حاصل کریں۔ وہ سرتاسر قرآن عظیم کا ضمیمہ اور تتمہ ہے یا اُس کے اجمال کی تفصیل۔ سائنس قرآن کی ماں جائی بہن ہے۔ اسلام اور سائنس کے باہمی اشتراک عمل اور تناصر و تعاون سے دنیا میں ایک رحمت بدامن انقلاب پیدا کیا جا سکتا ہے اور خود اسلام کا حسین چہرہ علوم سائنس کی اس برقی روشنی میں "ماہ شب چاردہم" کی طرح طلعت افروز ہوگا اور سائنس اور قرآن حکیم کا یہ قدرتی ائتلاف سارے عالم میں لیظہرہ علی دین کلہ کا پرچم اڑائیگا۔

مفتی محمد عبدہٗ

(گذشتہ سے پیوستہ)

مفتی محمد عبدہٗ نے شام کا سفر کیا اور تقریباً ایک سال وہاں قیام رہا پھر آپ یورپ تشریف لے گئے تقریباً دس ماہ یورپ میں قیام رہا اور وہاں اپنے محبوب ترین دوست سید جمال الدین افغانی سے ملاقات ہوئی۔ دونوں نے مل کر ایک اخبار "عروۃ الوثقیٰ" نامی عربی میں نکالا جس نے عالم اسلامی میں ایک بیداری کی لہر دوڑا دی (یہ جو کچھ بیداری اس وقت عالم اسلام میں ہے اس کا بڑا حصہ انہی اخبارات کا رہین منت ہے) لیکن زیادہ عرصہ تک اسکا اجراء نہ رہ سکا اس لئے کہ مصر اور ہندوستان میں بہت جلد اسکا داخلہ بند کر دیا گیا اور یہی ملک زیادہ تر اصلاح کے محتاج اور مصلحین کے پیش نگاہ تھے یہ اخبار بند کر کے مرحوم ٹیونس ہوتے ہوئے شام واپس آئے اور ایک سال اور قیام فرمایا۔ اس زمانہ میں شہر بیروت کے مدرسہ سلطانیہ میں عقائد اسلامیہ کا درس اور جامع کبیر میں تفسیر کا درس دوسرے علوم کا بھی درس دیا کرتے تھے اور آپ کے درس میں اطراف عالم کے علما وفضلا شریک ہوتے تھے۔ اصلاح مسلمین کے لئے آپ بعض بعض اخبارات میں اصلاحی مضامین بھی دیا کرتے تھے اور حالات اسلامی بھی معلوم کرتے رہتے تھے۔

مصر میں واپسی و قاضی القضاۃ سنہ ۱۳۰۶ھ میں دوبارہ مصر تشریف لائے اور بڑے بڑے لوگوں نے خدیو سے سفارش کی۔ خدیو نے نہ صرف آپ کو معاف کیا بلکہ عہدۂ قاضی القضاۃ جو سب سے بڑا عہدہ ملک مصر میں ہے پیش کیا۔ آپ نے انکار فرماتے ہوئے عرض کیا کہ میں تعلیم کا کام اچھا کر سکتا ہوں مجھے خدائے تعالیٰ نے تعلیم کے لئے پیدا کیا ہے قاضی ہونے کا اہل نہیں ہوں لیکن خدیو نے نہیں مانا اور زور دیا۔ بہ مجبوری آپ راضی ہو گئے اور مصر کے قاضی القضاۃ ہوئے آپ

کے فیصلے صرف قانونی و رسمی نہیں ہوتے تھے بلکہ حقیقت میں عدل و انصاف کے فیصلے ہوا کرتے تھے لیکن قانون کے مطابق آپ اس وقت تک حکم نہیں دیتے تھے جب تک کہ وہ عدل و انصاف کے بھی مطابق نہ ہوا ور فریقین میں زیادہ تر باہمی اصلاح کی کوشش کرتے تھے۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ ممالک زیر اثر سے فریب و دغا کا بالکل استیصال ہوگیا اور عدالتیں پاک ہوکر حقیقی معنی میں عدالتیں کہلانے کی مستحق ہوگئیں۔

تقریباً تیس سال سے عقلاء وقت اس مسئلہ پر غور کر رہے تھے کہ کیا طریقہ اختیار کیا جائے کہ علماء دین اس درجہ پر پہنچ جائیں کہ ان سے لوگوں کو حقیقی نفع پہنچ سکے بعض کی رائے تھی کہ ایک ایسے مدرسہ کی بنیاد رکھی جائے جس میں علوم دین و دیگر علوم جدیدہ بھی اس کے ساتھ شامل کر کے پڑھائے جائیں چنانچہ ایک مدرسہ دار العلوم کے نام سے سنہ ۱۲۹۰ھ میں اس غرض سے کھولا گیا تھا۔ بعض کی رائے تھی کہ صرف جامع ازہر کی اصلاح کر دینے سے یہ غرض حاصل ہوجائے گی۔ مرحوم دوسرے گروہ میں شامل تھے چنانچہ آپ نے موقع پاکر خدیو عباس ثانی سے کل حال عرض کرتے ہوئے حکم حاصل کر لیا کہ ایک مجلس انتظام جامع ازہر کے لئے اور اس کی تعلیمی پالیسی کی اصلاح کے لئے مقرر کیجائے۔ مرحوم کا یہ اعتقاد تھا کہ جامع ازہر اگر صحیح روشنی دینے لگا تو عالم اسلام اس کے نور سے خود بخود روشن ہوجائیگا۔

مفتی اعظم مصر سنہ ۱۳۱۷ھ میں آپ ملک مصر کے مفتی اعظم بنا دئے گئے۔ بسبب مفتی اعظم ہونے کے آپ مجلس اعلیٰ اوقاف کے بھی ممبر تھے اور آپ کی رائے حل مشکلات و احکامات شرعی کی تطبیق میں دوسروں کے لئے راہ ہدایت کا کام دیتی تھی۔ آپ نے اپنی زیر سیادت ایک مجلس قائم کی۔ جس نے ایک قانون مساجد کے لئے تیار کیا اگر کاش اس پر عمل ہوتا تو جملہ مساجد اور مساجد کے زاویے سب آباد ہوتے اور اس سے اشاعت علوم دین میں بڑی امداد ملتی۔ منصب افتاء پر فائز ہونیکی وجہ سے آپ مجلس شوریٰ قانونی کے بھی ممبر ہوئے اس مجلس کے ذریعہ سے قوم و ملک و حکومت کی ایک بڑی حد تک خدمت ہوسکتی تھی عام کی رائے کی تربیت و طریقہ بحث و وقت

نظر اس کے ذریعہ سے حاصل کیجا سکتی تھی جو اس سے اول نہیں تھی۔ مرحوم نے باوجود ان مصروفیتوں کے اپنی اصلی غرض یعنی خدمت علوم اسلامیہ کو فراموش نہیں کیا۔

نادر کتابوں کی اشاعت ایک جمعیت کی بنیاد اپنے ہی زیر صدارت ڈالی جس کا مقصد احیاء علوم اسلامیہ تھا۔ یہ جمعیت ۱۳۱۸ھ میں قائم ہوئی تاکہ علماء و فضلاء سلف کی نادر کتابیں تلاش کرے اور ان کو شائع کرے۔ چنانچہ سب سے اول بطور اپنے ابتدائی کام کے کتاب مخصص مصنفہ ابن سیدہ لغت میں شائع کی اور اسکی تصحیح اعراب کے ساتھ شیخ محمود شنقیطی نے فرمائی اور اس موضوع میں بے نظیر کتاب ہے۔ اور حضرت امام مالکؒ کی سوانح عمری شائع کی۔ ان کتابوں کی ترتیب و تکمیل میں بہت زیادہ حصہ مرحوم کا ہی تھا۔ آپ کا یہ اعتقاد تھا کہ اصلاح امت و فلاح قوم کی امید اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے افراد میں جذبہ خود اعتمادی و توکل علی مسبب الاسباب نہ پیدا ہو۔ اور جب تک کہ صحیح تعلیم اور عمدہ تربیت عوام میں نہ پیدا ہو یہ جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ مرحوم کا چونکہ خیال تھا کہ انکو قوم کی تربیت اور اس کی اصلاح کے ہی لئے خدائے تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اس لئے انہوں نے اس جماعت کی بنیاد ۱۳۱۰ھ میں ڈالی تھی اور بڑے بڑے امراء و علماء جو آپ سے اشتراک فی العمل رکھتے تھے، آپ کے شریک کار رہتے اور اس جمعیت کا نام جمعیت خیریت الاسلام تھا اور آپ بنفس نفیس اس جماعت کے کارکن اور اسکی اشاعت و توسیع میں مددگار اعلیٰ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس جماعت کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان ایک منتظم زندگی بسر کریں اور ان میں تنظیمی سلسلہ اس طرح پیدا ہو کہ امراء و غرباء اس میں تعاون کریں یعنی امراء غرباء کی امداد کریں اور اس کے سالانہ جلسوں میں ہمیشہ مرحوم اس کی تصریح فرمایا کرتے تھے اس بابت حضرت قاضی فاضل شیخ ابی خطوہ نے مرحوم کی صفت میں جو ازہر میں بیان کیا اس کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

ازہر کی اصلاح انکی زندگی کا صرف یہی مقصد رہ گیا تھا کہ اپنا تمام وقت ازہر اور اہل ازہر کی اصلاح میں ہی صرف کریں۔ اس لئے کہ انکے خیال میں صرف ازہر ہی کی اصلاح سے عام مسلمین کی اصلاح ہو سکتی

ہے۔ شیخ صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ جب مرحوم ملک شام میں تشریف فرما تھے تو بھی ہر وقت ازہر و اہل ازہر کی اصلاح کی فکر ہی میں بے چین رہا کرتے تھے۔ انکی آرزو یہ ہی رہی کہ انکی زندگی اور انکی موت سب ازہر کے لئے ہو اور وہ مرتے وقت ازہر کیطرف سے اطمینان لیکر جاویں اگرچہ اسوقت تک حکومت کی طرف سے جامع کا کوئی اصلاحی بار ان پر نہ تھا لیکن جب حکومت مصر نے رجب ۱۳۱۲ھ میں اپنے ایک فرمان سے جامعہ ازہر کی مجلس انتظامیہ کا رکن مقرر کیا اس وقت انہوں نے محسوس کیا کہ اب صحیح وقت اصلاح جامعہ ازہر کا آگیا۔ خوش قسمتی سے بعض بعض ممبران وشیوخ جامعہ بھی آپ کے شریک عمل ہو گئے۔ خصوصاً آپ کے دست و بازو آپکے دوست شیخ عبدالکریم سلمان تھے۔ جب جامع ازہر کی طرف مرحوم نے توجہ کی تو اہل ازہر کے حالات زندگی ان کی طرز معاشرت انکی طریقہ تعلیم اور انکے علوم سب مرحوم کے پیش نگاہ تھے۔ سب سے اول انہوں نے انکی ظاہری اصلاح کی طرف توجہ کی۔ ان کو معلوم ہوا کہ ان کے ذریعہ معاش بہت محدود ہیں اور انکی زندگی فقرا کی طرح گزرتی ہے۔ ان کو صرف پانچہزار روٹیاں یومیہ ۳۱۰ گنی ماہوار، ۶۳ گنی سالانہ کپڑے وغیرہ کے مصارف کے لئے دئے جاتے ہیں۔ انکے حجرے نہایت تنگ و تاریک اور بوسیدہ تھے۔ پس انہوں نے ان کی باطنی اصلاح سے اول انکی ظاہری اصلاح کیطرف توجہ کی۔

ظاہری اصلاح مرحوم نے کوشش کی اور حکومت سے انہوں نے دو ہزار گنی سالانہ جامع کے لئے حاصل کیں اور یہ وعدہ بھی حکومت نے کیا کہ وہ اپنی امداد کو دس ہزار گنی سالانہ تک بعد ملاحظہ نتیجہ اصلاح بڑھا دے گی۔ پھر خدیو معظم سے عرض کرنے پر ۴ ، ۳۲۳ گنی سالانہ کا حکم محکمہ اوقاف کے نام حاصل کیا کہ وہ جامعہ کو سالانہ ادا کرے۔ اور علماء جامع احمدی و دسوقی و علماء و رباط اسکندریہ سے جن کا تعلق جامع ازہر سے تھا عام چندہ لیا۔ یہاں تک کہ اس کی میزان ۵ ، ۱۴ گنی تک پہنچ گئی اور جملہ استادوں، خادموں کی تنخواہ و وظیفہ میں بیش قرار توسیع کی۔ اور روٹیوں میں بھی عوام و خواص کے یہاں سے بجائے پانچہزار پندرہ ہزار یومیہ کی توسیع ہوئی جن حجروں میں کہ طلبہ و

استاد اور خدام رہا کرتے تھے اس کے بعد ان کی جانب توجہ کی اور خدیو معظم کے حضور میں اسکا عرض حال کرنے پر حکم ہوا کہ حجرے ممالک یورپ کے بورڈنگ ہاؤس کے طرز کے تیار کئے جاویں اور قدیم وضع کے رواق و حجرے گرا دئے جاویں اور ان میں اصول صحت عامہ کا کافی لحاظ کیا جائے۔ چنانچہ اس کی تعمیل ہوتی۔ سالانہ فرش جامعہ کے مکانات کے لئے دیا جاتا تھا اب سال میں دو مرتبہ کیا گیا۔ تیل جو طلبہ کو بغرض تعلیم شب دیا جاتا تھا اُس کی روشنی کافی نہیں ہوتی تھی اور بہت تھوڑی دیر میں ختم ہوجایا کرتا تھا اس کی مقدار بڑھائی گئی۔ پانی بڑی دقت اور محنت شاقہ کے بعد کھارا، میلا اور ناکافی دیا جاتا تھا اس کی اصلاح کی گئی اور کافی صاف کیا ہوا میٹھا پانی مہیا کیا گیا۔

شفاخانہ ازہر میں برائے نام تھا حقیقۃً اس کا کوئی وجود نہ تھا۔ متعدی امراض کے طلبہ شہر میں ادھر ادھر اور حجروں میں رہا کرتے تھے اور مرض متعدی کو پھیلایا کرتے تھے۔ مرحوم نے ایک طبیب خاص اس غرض کے لئے مقرر کیا کہ وہ اول اُس شخص کو جو ازہر میں داخل ہونا چاہتا ہے طبی اصول پر جانچ کرے اور مریضوں کا علاج کرے اور اصول صحت کا کافی لحاظ رکھے۔ رواق عباسی کو انہوں نے ازہر کا شفاخانہ بنایا جو مریض ہوتا اس میں داخل کیا جاتا اور دوا وغیرہ کا انتظام مریض کے لئے باقاعدہ کیا گیا۔ محکمہ اوقاف سے بھی ایک خاص ڈاکٹر و شفاخانہ کی منظوری جامع ازہر کے لئے حاصل کی اور جامع ازہر کے قریب ہی شفاخانہ تیار کرایا خصوصاً زمانہ امراض وبائیہ میں محافظین و خدام کے نظام و ضبط میں بھی کافی اضافہ کیا گیا۔

دفتر چونکہ جامع ازہر سے دور تھا اور شیخ الجامعہ اپنے ہی مکان میں دفتر کا کام انجام دیتے تھے اس لئے آمد و رفت میں بہت وقت ضائع ہوا کرتا تھا اور صرف ایک ہی محرر دفتر کے کام کے لئے تھا جہاں وہ جاتا تھا بیٹھ جایا کرتا تھا کوئی خاص مقام اس کے لئے اور اس کے دفتر کے لئے جامعہ میں نہیں تھا جملہ امور پر صرف اسکی ہی عام طور سے نگرانی تھی۔

مرحوم نے دفتر کے لئے ایک خاص عمارت مخصوص کرکے تیار کرائی اور پانچ محرروں کا

اور اضافہ کرکے ذمہ داریاں علحدہ علحدہ تقسیم کیں، اور اس کے لئے خدام یعنی چپراسی، چوکیدار علحدہ مقرر کرکے علماء و طلبہ کو بیکار تضیع اوقات اور آنے جانے کی مشقت سے نجات دلائی۔ تنخواہ کی تقسیم کے لئے کوئی ضابطہ مقرر نہیں تھا کسی کو ماہوار کسی کو سالانہ کسی کو یومیہ کچھ دیا جاتا تھا بعض کی تنخواہ ۱۶ قرش ماہوار تھی (یعنی تقریباً دو روپے ہندوستانی) بہت سے ایسے لوگ تھے کہ انکی کوئی تنخواہ ہی نہ تھی۔ اور بعض بعض کی تنخواہ ۶۰۰ قرش سے بھی زائد تھی اور بعض بعض علماء کی اولاد کو بغیر کسی شرط اور وجہ کے وظائف دئے جا رہے تھے اور یہ صرف جامع ازہر کے شیخ اعظم کے صوابدید پر تھا جس کو چاہا جس طرح اور جس طریقہ سے مناسب ہوا تنخواہ یا وظیفہ مقرر کر دیا۔ مرحوم نے اس کے لئے ایک ضابطہ مقرر کیا اور علماء کے درجے و مراتب مقرر کئے اور ایسے انداز سے ان کی تنخواہیں مقرر کیں اور بغیر کسی کدوکاوش کے وقت پر ترقی کا معیار رکھا۔ اسی طرح کپڑے جو مقرر تھے ان کے لئے ضابطہ بنایا کہ نہ ایسے لوگوں کو دیا جائے جن کو ضرورت نہ ہو اور نہ ایسے لوگ محروم رہیں جو حاجتمند ہیں اور نہیں پا سکتے۔ علماء کی اولاد کے لئے بھی قانون بنایا گیا کہ جو لوگ تعلیم حاصل کریں ان کو وظیفہ دیا جائے اور جو تعلیم حاصل نہ کریں وہ مفت وظیفہ نہ لے سکیں اس انتظام سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ جو لوگ بیکار روپیہ مفت ہضم کرتے اور کوئی کام نہیں کرتے تھے وہ تعلیم کی طرف اپنے وظیفہ اور معاش کی خاطر متوجہ ہوگئے اور جو لوگ بالکل ہی محروم کئے گئے انکے لئے شیخ مرحوم نے عام چندہ کیا اور انکو خیرات کے نام سے انکی معاش کی فکر کر دی گویا ازہر کے خزانہ پر بیکار بار بھی نہیں پڑا اور اہل خیر کی ہمت سے وہ محروم بھی نہ رہے اور اپنی معاش سے قدرے بے فکر ہوگئے۔ جو آمدنی موقوفہ ازہر کے لئے تھی اس کی وصولی ذخیرہ کا بھی انتظام نہایت درجہ خراب اور قابل اصلاح تھا۔

ذرائع آمدنی میں مشائخ ازہر و افسران رواق (یعنی وہ مکانات جو موقوفہ تھے اور انکی آمدنی ازہر کے لئے تھی) اور واقف کی اولاد میں بسبب حسد باہم نزاع تھا اور جن جن ضرورتوں کے لئے آمدنیاں وقف کی گئی تھیں ٹھیک ان ضرورتوں پر اس کا مصرف بھی نہیں تھا۔ اسکے

لئے شیخ مرحوم نے ایک ضابطہ مقرر کیا اور مشائخ ازہر اور ایک مجلس منتظمہ کی نگرانی میں یہ سب امور دے گئے اس مجلس کا یہ فرض تھا کہ وہ دیکھے کہ باقاعدہ رقم وصول ہوئی اور انہی ضرورتوں پر صرف کیجاتی ہے جس کے لئے واقف نے اس کو وقف کیا ہے۔ اگر کوئی نزاع پیدا ہوتا تو شرع شریف کے مطابق اس میں فیصلہ کیا جاتا۔ یہ محکمہ انتظام شیخ رافعی کی زیر صدارت دیا گیا۔

دستار بندی یعنی وہ لباس جو خاص علما کے لئے ہی مخصوص تھا اس کے لئے ایک خاص ضابطہ مقرر کیا۔ ہر شخص اس کو حاصل نہ کرسکتا تھا بلکہ جو شخص اسکا مستحق ثابت ہوتا اور مجلس اطمینان کرلیتی صرف وہی اس کو پانے کا مستحق ہوتا تھا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شخص حصول علم کے لئے کوشش کرنے لگا اور ناکارہ لوگ اس امتیاز سے محروم ہو گئے۔

معنوی اصلاح ازہر

جب شیخ مرحوم اس طرح مادی اصلاح سے فارغ ہو چکے تو اصلاح معنوی کی طرف توجہ کی اور انہوں نے ایک قانون تعلیمی مرتب کیا جس میں طریقہ تعلیم نصاب امتحان سب کا اظہار تھا یہ قانون مشائخ ازہر نے ترتیب دیا اور اس میں ظاہر کیا کہ کون کون سے علوم کس مقصد کے لئے ہیں اس کے حصول کے کیا ذرائع ہیں اور کس قدر زمانہ اس پر صرف ہوگا اور کس طرح ہو گا اور حسب ذیل علوم ازہر میں رکھے گئے۔

توحید۔ تفسیر۔ حدیث۔ فقہ۔ اصول فقہ۔ اخلاق دینیہ۔ اور اس کے حصول کے وسائل میں حسب ذیل علوم رکھے گئے۔ منطق۔ صرف و نحو۔ علوم بلاغت۔ علم اصلاح حدیث۔ حساب جبر و مقابلہ۔ تاریخ اسلام۔ لکھنا۔ املا۔ علم لغت۔ علم ہندسہ۔ جغرافیہ۔ طالب علم پر لازم تھا کہ وہ جس درجہ میں داخل ہو اس کی قابلیت کا سارٹیفکٹ حاصل کرے کہ وہ فلاں درجہ میں شامل ہو سکتا ہے یہ بھی انتظام تھا کہ طلبہ ابتدائی چار سالوں میں حواشی وتقاریر کے پڑھنے میں وقت ضائع نہ کریں۔ جو طلبہ بلاغت خاص طور سے حاصل کرتے تھے ان کو عملاً بلاغت سکھانے کا یہ التزام کیا گیا کہ اصول بلاغت کے مطابق تقریریں کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ جامع ازہر کو بالکل بدلدیا اور یہ قاعدہ تھا کہ امتحان صرف تین شخص لیا کرتے تھے اور کبھی چھ سے زائد نہیں ہوئے لیکن جدید نظام میں ۹۵

تک تعداد ممتحنین کی پہنچ گئی تھی۔ طلبہ میں حصول کامیابی کا ایک خاص جذبہ اور رغبت پیدا ہوگئی اور انکی کوششیں بھی زیادہ ہوگئیں۔ سال میں مدت تعلیم اول چار ماہ سے زائد نہ تھی جدید نظام میں عام تعطیلات کا لحاظ رکھتے ہوئے ۸ ماہ ایک سال میں مدت تعلیم رکھی گئی۔

ان جملہ امور کی ترتیب کے بعد مرحوم کو یہ فکر ہوئی کہ ان قوانین و نظام پر باقاعدہ عمل ہو اور اس کے لئے ذیلی تجاویز و ضوابط حسب ضرورت بنتے رہیں۔ چنانچہ مشائخ ازہر اور مجلس منتظمہ میں یہ عمل اس وقت تک جاری ہے اور اس وقت تک قانون و نظام مذکورہ زیر عمل ہے اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ معلم کے فرائض کیا ہیں۔ متعلم کے فرائض کیا ہیں۔ معلم کے ساتھ متعلم کا کیا برتاؤ ہوگا معلم کا شیخ کے ساتھ کیا برتاؤ ہے اور اس میں متعلمین کا کیا برتاؤ ایک دوسرے کے ساتھ ہونا چاہئے عملاً استاد کس طرح مکارم اخلاق کی تعلیم طلبہ کو دیں اور وہ کس طرح اس سے مستفید ہوں اور طلبہ کس طرح آئندہ زندگی گزارنے کے لئے تیار کئے جائیں۔ اور ہر حکم و امر میں شرع شریف کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے۔ اور اس کی کافی اتباع کیجائے۔ علوم جدیدہ کی طرف خاص توجہ کی گئی اور چھ سو گنی صرفہ مقرر کیا گیا۔ تاریخ اسلام و حساب اور جغرافیہ کا یہ حال ہوا کہ دوسرے مدارس میں یہاں کے طلبہ معلم ہو ہو کر جانے لگے اور ازہر میں کبھی باہر سے ان فنون کے معلم نہیں لئے گئے۔ ۳۶۰ گنی صرفہ خوشخطی اور املا کے لئے خاص طور پر مقرر کیا گیا اور یہ فن شل سابق کے تمام ملک میں طلبہ ازہر کے ذریعہ پھیل گیا اور اس سے بہت فائدہ ملک کو اور طلبہ کو فائدہ پہنچا۔

نتیجہ اصلاح اس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ مدارس سرکاری میں پندرہ مدرس بہترین طریقہ سے حساب سکھا رہے ہیں اور تین مدرس جغرافیہ پڑھا رہے ہیں اور ایک مدرس املاء کا بھی ہے بہت سے طلبہ ہر سال امتحان میں کامیاب ہو کر اسناد حاصل کرتے اور ملک میں پھیل جاتے اور بہت سی طلبہ نے امتحان مدرسی کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا اور سرکاری مدارس۔ مدارس اوقاف و دیگر مدارس میں ازہر کے ہی طلبہ ہیں۔ اور بہت سے لوگوں کو قابلیت کے وظائف مل چکے ہیں یہ سب مرحوم کے ہی احسانات ہیں جن کو مصر کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔

جب علوم جدیدہ کے خلاف شور مچانے والوں نے بہت شور مچایا کہ یہ جدید علوم قدیم علوم کے ساتھ نہ پڑھائے جائیں تو شیخ مرحوم نے اس کی اہمیت کو فوراً محسوس کیا۔ اور اس کے لئے ایک دن بحث و مناظرہ اور فیصلہ کا مقرر کیا۔ فریقین نے اپنے اپنے دلائل پیش کئے۔ مشائخ ازہر سب جمع کئے گئے تھے اور اس بحث کا کافی کثرت رائے سے یہ ہی فیصلہ ہوا کہ علوم قدیمہ کے ساتھ علوم جدیدہ عقلیہ شرع شریف کے سمجھنے کے لئے نہایت ضروری ہیں۔ یہ فیصلہ ایک عام جلسہ میں شیخ نے کثرت رائے کی تائید سے فرمایا۔

کتب خانہ کی اصلاح شیخ مرحوم نے پھر کتابوں کی طرف توجہ کی جامعہ ازہر کی کتابیں نہایت درجہ منتشر تھیں اور کسی خاص نظام کے تحت کتب خانہ نہ تھا۔ درس و تدریس کے لیے کتب خانہ جسقدر ضروری ہے وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں۔ اس لئے ایک خاص مکان شیخ مرحوم نے تیار کرایا اور سب کتابیں ایک جگہ حفاظت سے رکھیں اور اسکا ایک ضابطہ مقرر کیا۔

شیخ کی وصیت شیخ مرحوم نے ازہر کو حسب ذیل طریقہ سے خطاب کیا ہے کہ "جامعہ ازہر پر واجب ہے کہ اس زمانہ میں جبکہ مغربی دہریت کی سموم عقائد کو تباہ کر رہی ہے۔ کمالات دینی اور اخلاق عالیہ سے اسلام کی صداقت، اسلام کی حقانیت اور موجودہ زمانہ میں اسکی ضرورت ثابت کرتی رہے اور ہر مسلمان پر یہ فرض ہونا چاہئے کہ وہ کسب کمالات و حصول خیر کی طرف رغبت رکھے اور برائیوں سے بچتا رہے۔" مرحوم کی سب سے بڑی یہی خواہش تھی اور ہمیشہ جب وہ مشائخ ازہر میں ہوتے یا طلبہ سے گفتگو کرتے یا عوام کے جلسہ میں وعظ فرماتے یہی فرمایا کرتے تھے کہ سوائے حصول مرضی باری تعالیٰ کوئی نیکی کوئی بھلائی کوئی کام کسی اور خاص غرض کو پیش نظر رکھکر نہ کرو۔ کہ اسی کی مرضی تم کو اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج ترقی پر پہنچا سکتی ہے اور اس کے حصول کا صرف یہی ذریعہ ہے کہ ہر بھلائی کا کام صرف اس کے ہی لئے کیا جائے۔

غزل

از جناب مصورِ جذبات جانشینِ میرؔ و غالبؔ میرزا ثاقبؔ لکھنوی مدظلہ

سوائے رحمتِ رب کچھ نہیں ہے
بہت کچھ تھا مگر اب کچھ نہیں ہے

جہاں میں ہوں مگر کیا جانے کیوں
مجھے دنیا سے مطلب کچھ نہیں ہے

فقط تقدیر کا کایا پلٹ ہے
مناسب اور انسب کچھ نہیں ہے

یہ وقتِ نزع ہے کیا نذر دوں میں
اب آئی ہو یہاں جب کچھ نہیں ہے

فلک بھی کیا مرا گھر ہے شبِ غم
بجز تصویرِ کوکب کچھ نہیں ہے

نہ ہو گر شامِ ہجراں کے برابر
تو بہرِ وصل اک شب کچھ نہیں ہے

اندھیرے میں وہ سوجھی یہ نہ سوجھی
تری شب ہے مری شب کچھ نہیں ہے

نہ پوچھو دل سے اس کی راہ کا حال
سوائے عشق مذہب کچھ نہیں ہے

پسِ دل اب کہاں آبادیٔ دہر
جو سب کچھ تھا وہی سب کچھ نہیں ہے

طلسمِ دل نہ سمجھا آج تک میں
طلب ہے اور مطلب کچھ نہیں ہے

خدا کا واسطہ کیا دوں اسے میں
جہاں میں جس کا مذہب کچھ نہیں ہے

چمن تھا جب چمن تھا آشیاں بھی
وہیں تھا میں جہاں اب کچھ نہیں ہے

محصل نظمِ ثاقب کا نہ پوچھو
فقط لفظیں ہیں مطلب کچھ نہیں ہے

ماموں جان

(روس کی قصباتی زندگی کے مناظر چار ایکٹ میں)

اشخاص:-

الکزنڈر سربریاکف (ایک پنشن یاب پروفیسر)

یلنا اینڈریونا (اس کی بیوی، عمر ستائیس سال)

صوفیا الکزنڈردونا (سونیا) (پروفیسر کی لڑکی پہلی بیوی سے)

ماریا واسلیودنیا دائنتسکی (پریوی کونسل کے ایک ممبر کی بیوہ اور پروفیسر کی پہلی بیوی کی ماں)

آئوان پیٹرووچ دائنتسکی (ماریا کا بیٹا)

میہائل لوودوچ استروف (ایک ڈاکٹر)

الیا ایلیچ تلیگن (ایک تباہ شدہ دیہاتی رئیس)

مارنیا (ایک بڈھی انا)

ایک مزدور

مقام: سربریاکف کی ریاست میں

پہلا ایکٹ

باغ۔ مکان کا ایک حصہ مع برآمدے کے نظر آتا ہے۔ ایک روش پر ایک پرانے شمشاد کے درخت کے نیچے چائے کی میز چنی ہوئی ہے۔ کرسیاں اور تپائیاں، ایک تپائی پر ایک تار پڑا ہے۔ میز سے ذرا فاصلہ پر ایک جھولا ہے۔ دو اور تین بجے شام کا وقت، بادل گھرے ہوئے ہیں۔

مارنیا - ایک بھاری بڈھی عورت جو بدقت حرکت کر سکتی ہے سماوار کے پاس بیٹھی موزہ بن رہی ہے، اور استروف اُس کے پاس ہی ٹہل رہا ہے۔

مارنیا - (ایک گلاس چائے سے بھرتی ہے) لو میرے پیارے، یہ چائے۔

استروف (بے دلی سے گلاس لے لیتا ہے) کچھ جی نہیں چاہتا)

مارنیا - ووڈکا[1] پینے کو جی چاہتا ہے؟

استروف - نہیں ووڈکا روز تھوڑی ہی پیتا ہوں۔ اور پھر آج اتنی اُمس ہے (ایک وقفہ) ہم ایک دوسرے کو کتنے دن سے جانتے ہیں؟

مارنیا - (سوچتے ہوئے) کتنے دن سے؟ خدا کرے یاد آئے۔ ۔ ۔ تم یہاں آئے ہو کب؟ ۔ ۔ ۔ ہاں
ویرا پیٹرونا - سونیچکا کی ماں اس وقت زندہ تھیں۔ اُن کے مرنے سے شاید دو جاڑے پہلے تم ہم لوگوں کو دیکھنے آئے تھے ۔ ۔ ۔ تو اس حساب سے کوئی گیارہ برس ہوئے (ایک منٹ سوچتی ہے) زیادہ ہوئے ہونگے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

استروف - اس وقت سے میں بہت بدل گیا ہوں؟

مارنیا - بہت جب تم نوجوان اور خوبصورت تھے، اب تمہاری عمر ڈھل گئی ہے۔ اتنے خوبصورت بھی نہیں رہے۔ ایک بات اور ہے - اب تم ووڈکا سے بھی شغل کرنے لگے ہو۔

استروف - ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ دس سال میں آدمی ہی دوسرا ہو گیا ہوں تو وجہ کیا؟ میں کتنا کام کرتا ہوں، کتنا؟ صبح سے شام تک مجھے چلتے ہی گزرتا ہے، ایک لمحہ آرام نہیں، اور رات کے لباس میں جب سونے لیٹتا ہوں تو ڈھرکا لگا رہتا ہے کسی مریض کے پاس نہ پکڑ کے لیجائیں۔ جب سے تم مجھے جانتی ہو اُس وقت سے ایک دن خالی نہیں گزرا۔ بڈھا

---

[1] ایک قسم کی دیسی شراب جسے عام طور پر روسی خوشی سے پانی کی طرح پیتے ہیں۔ مترجم

نہ معلوم ہوں تو کیا! اور زندگی بذاتہ دشوار، بے کیف اور گندی ہے . . . . . یہ زندگی ہمیں کھا جائے گی۔ ہر وقت عجیب عجیب طرح کے آدمیوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ عجیب قسم کے لوگ ہیں، ہر شخص عجیب۔ اور جب آدمی دو تین سال اُنکے درمیان زندگی گزارتا ہے اُس میں بھی عجوبیت آجاتی ہے، چاہے اسے اسکا احساس نہ ہو۔ یہ ناگزیر ہے (اپنی لانبی مونچھیں کھڑی کرکے اور اُن پر ہاتھ پھیر کے) او ہو اتنی گھنی اور بڑی مونچھیں ہوگئیں . . . بے تکی مونچھیں . . . . . اتنا میں عجیب قسم کا انسان ہوگیا۔ ابھی میں بیوقوف نہیں ہوا خدا کا شکر ہے! میرا دماغ اپنی جگہ پر ہے لیکن میرے احساسات سرد ہونے لگے ہیں۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں، مجھے کسی کی پروا نہیں کسی کو نہیں چاہتا.... سوا تمہارے۔ شاید۔ میرے دل میں تمہاری جگہ ہے (اُس کے سر کو چومتا ہے) جب میں بچہ تھا ایک بالکل تمہاری ہی سی عورت میری انا تھی۔

مارینا۔ شاید تم کچھ کھاؤ گے؟

استروف۔ نہیں۔ لنٹ[۵۸] کے تیسرے ہفتہ مجھے مالتسکو جانا پڑا جہاں فصلی بخار وغیرہ کے مریض تھے . . . . میعادی بخار . . . . جھونپڑوں میں آدمیوں کے ڈھیر لگے تھے۔ وہاں بڑی گندگی تھی، دھنواں، تاریکی، . . . . بیماروں کے پاس ہی بچھڑے اور بیل بندھے تھے . . . . چھوٹے چھوٹے سور بھی تھے۔ دن دن بھر میں نے محنت کی۔ ایک منٹ نہیں بیٹھا۔ اور ایک نوالہ میرے حلق کے نیچے نہیں اُترا۔ اور جب گھر واپس آیا، پھر مجھے چین نہیں . . . . یہ لوگ مجھے چین نہیں لینے دیتے۔ ریل پر ایک کوئی کٹ گیا تھا اُسے اٹھا لائے۔ میں نے معائنہ کیا اور علاج کے لئے اُسے میز پر لٹایا اور وہ کلوروفارم سونگھتے سونگھتے ٹھنڈا ہوگیا۔ اور ٹھیک اس وقت جب اُسکا موقع نہ تھا میرے جذبات بیدار ہوگئے۔ اور میرا ضمیر مجھے متہم قرار دینے لگا جیسے میں

---

[۵۸] عیسائیوں کا ایک تہوار

نے ہی اُسکی جان لی۔ میں بیٹھ گیا، اپنی آنکھیں میں نے اس طرح بند کرلیں اور سوچنے لگا۔ وہ جو ہم سے سو یا دو سو برس بعد دنیا میں رہیں گے، جن کے لئے ہم جانوں پر مصیبت لے کر یہ کٹھن منزل طے کر رہے ہیں، کیا وہ ہمیں دعائے خیر سے یاد کریں گے؟ انا، نہیں یاد کرینگی جانتی ہو۔ وہ کلمۂ خیر سے ہمیں نہیں یاد کریں گے

مارینا۔ آدمی نہیں یاد کریں گے لیکن خدا یاد کرے گا۔

استراف۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔ خوب کہا۔

(وائنٹسکی داخل ہوتا ہے)

وائنٹسکی۔ (کمرے کے اندر سے نکلتا ہے۔ دوپہر کے کھانیکے بعد وہ ایک نیند لے چکا ہے اور اُسکا چہرہ خمار آلود ہے، باغ کی ایک نشست پر بیٹھ جاتا ہے اور اپنی فیشن ایبل ٹائی درست کرتا ہے) خوب . . . . . . (ایک وقفہ) خوب . . . . . .

استراف۔ خوب سوئے؟

وائنٹسکی۔ خوب . . . . . بہت (انگڑائی لیتا ہے) جس دن سے یہ پروفیسر اور اُسکی بیوی یہاں آئی ہماری زندگی دوبھر ہوگئی ہے۔ میں غلط وقت پر سوتا ہوں اور کھانے پر تمام الم غلم ہوتا ہے۔ کھاتا ہوں . . . . شراب پیتا ہوں . . . شراب پینا اچھا نہیں ہے! پہلے ہم ایک لمحہ بیکار نہیں کھوتے تھے۔ سونیا اور میں جفاکش لوگوں کی طرح کام کرتے تھے لیکن اب سونیا بیچاری اکیلی تمام کام کرتی ہے اور میں سوتا رہتا ہوں اور کھاتا رہتا ہوں اور شراب سے شغل کرتا ہوں یہ برا ہے۔

مارینا۔ (اپنا سر ہلاکر) عجب طرح دن گزر رہے ہیں! پروفیسر بارہ بجے سو کر اٹھتا ہے اور سماوار اس کے انتظار میں تمام صبح کھولتا رہتا ہے۔ پہلے ہمیشہ ایک بجے سے پہلے ہم کھانے سے فراغت حاصل کرلیتے تھے۔ آدمیوں کی طرح۔ اور اب وہ آئے ہیں تو چھ اور سات کے درمیان کھانا کھایا جاتا ہے۔ رات رات بھر پروفیسر پڑھ کر گزارتا ہے یا لکھتا رہتا ہے اور

ایکدم گھنٹی بجتی ہے۔ توبہ، توبہ کیا ہے؟ چائے پئیں گے! ساوار گرم کرنیکے لئے لوگوں کو جگاؤ عجب زندگی ہے، عجب!

آستروف۔ اور کیا وہ ابھی یہاں عرصہ تک رہیں گے؟

وائنٹسکی۔ (سیٹی بجاتا ہے) سو سال رہیں گے۔ پروفیسر تو یہیں رہنے آیا ہے۔

مارینا۔ اب دیکھو! سماوار میز پر دو گھنٹہ سے رکھا ہے اور وہ سیر کو گئے ہوئے ہیں۔

وائنٹسکی۔ آرہے ہیں، آرہے ہیں! گھبراؤ نہیں۔

(آوازیں سنائی دیتی ہیں باغ کے کنارے والے حصہ سے سریریاکف، یلنا اینڈریونا سونیا اور تلی گن تفریح سے واپس ہوکر داخل ہوتے دکھائی دیتے ہیں)

سریریاکف۔ واہ وا . . . . کیسے کیسے مناظر دیکھنے میں آئے!

تلی گن۔ کیا کہنا جناب

سونیا۔ کل جنگلات کے علاقہ کی جانب چلیں گے، ابا جان، کیوں نہ؟

وائنٹسکی۔ چائے تیار ہے۔

سریریاکف۔ میرے دوستو، اتنی مہربانی کرو کہ میری چائے میرے کمرے میں مجھے بھجواؤ مجھے کچھ کام کرنا ہے وہ آج ہی ختم ہونا چاہئے۔

سونیا۔ جنگلات کو آپ ضرور پسند کرینگے۔

(یلنا اینڈریونا، سریریاکف، اور سونیا اندر چلے جاتے ہیں۔ تلی گن میز کے پاس جاتا ہے اور مارینا کے نزدیک بیٹھ جاتا ہے)

وائنٹسکی۔ اتنی تو گرمی اور امس ہے، مگر ہمارے بڑھے طوطے نے گرم کوٹ پہن رکھا ہے اور گیلوشز[۵۱] چڑھا رکھے ہیں۔ اور خیر سے چھاتا بھی ہے اور دستانے بھی . . . . !

---

[۵۱] ایک قسم کا جوتا جسے حفاظت کے لئے برسات میں جوتے کے اوپر پہنتے ہیں۔

استروف ۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ اپنی صحت کی حفاظت کرتا ہے ۔

وائنٹسکی ۔ اور وہ اُس کی بیوی . . . . وہ کتنی حسین ہے کتنی ! میں نے ایسی حسین عورت نہیں دیکھی ۔

تلی گن ۔ ماریناپیاری، اناجانی! چاہے میں سبزہ زاروں میں سیر کروں، خواہ سایہ دار روشوں اور باغوں میں ٹہلوں یا اس میز کو دیکھوں میں بیان نہیں کرسکتا میں کسقدر مسرور اور بشاش معلوم ہوتا ہوں ۔ کیا موسم ہے . . . . . ہا ۔ چڑیاں گا رہی ہیں، ہم سب خوش حال اور بشاش ہیں ۔ آسودہ ۔ اس سے زیادہ کیا چاہئے ؟ (اپنا گلاس لیکر) میں تمہارا بہت شکریہ ادا کرتا ہوں ۔

وائنٹسکی ۔ (نشیلے طریقہ سے) اُس کی آنکھیں ! . . . . . . وہ ایک بے مثال عورت ہے !

استروف ۔ کچھ باتیں کرو . . . . . آئوان پٹرووچ ۔

وائنٹسکی ۔ (بے پروائی سے) کیا باتیں ؟

استروف ۔ کوئی نئی بات نہیں ؟

وائنٹسکی ۔ کوئی نہیں ۔ ہر چیز پرانی ہے ۔ میں بالکل ویسا ہی ہوں جیسا پہلے تھا، شاید اس سے بدتر کیونکہ مجھے کوئی کام کرنے کو نہیں ۔ کوئی کام نہیں، بڈھے کوّے کی طرح بس کائیں کائیں کرتا ہوں، اور ہماری اماں یہ بڈھی مینا کی طرح عورتوں کے حقوق حقوق چلاتی رہتی ہے ایک پیر قبر میں لٹکائے ہیں اور اب تک ان موٹی کتابوں میں نئی زندگی کے صبح کے خواب دیکھتی ہیں ۔

استروف ۔ اور پروفیسر ؟

وائنٹسکی ۔ پروفیسر، وہ بھی اسی طرح مطالعہ کے کمرے میں بیٹھا صبح سے آدھی رات تک بیٹھا لکھا کرتا ہے، کاغذ خراب کرتا ہے ! اس عمر میں اُسے اپنی سوانح عمری لکھنا چاہئے ۔ یہ موضوع اُسکے لئے زیادہ مناسب ہے ۔ بڈھا ناکارہ پروفیسر سمجھتے ہو ۔ منہ میں دانت نہیں پیٹ میں

آنت نہیں۔ علم کی پوٹ گٹھیا، بائی، بغض، رشک، حسد، ان سب نے اسکا جگر خراب کر ڈالا ہے۔ یہ بڈھا اپنی پہلی بیوی کی جائداد پر گزر کر رہا ہے۔ اپنی طبیعت پر جبر کر کے یہاں رہ رہا ہے کیونکہ شہر کی زندگی کے لئے اُس کے پاس خرچ نہیں جب دیکھو یہ بڈھا اپنی قسمت ہی کو رو دیا کرتا ہے حالانکہ ہے خوش نصیب ذرا خیال کرو کیسا خوش نصیب ہے! ایک معمولی متولی کا لڑکا جس نے یونیورسٹی میں امتیاز حاصل کیا اور پروفیسری کی کرسی پائی ایک میمبر سینیٹ کی لڑکی سے شادی ہوئی۔ وغیرہ وغیرہ مگر ان سب باتوں سے کیا فائدہ۔ سوچنے کی بات ہے کہ پچیس برس سے یہ شخص آرٹ کے متعلق تقریریں کر رہا ہے اور مضامین لکھ رہا ہے اور اُسے آرٹ کی بابت ایک حرف نہیں معلوم۔ پچیس برس تک یہ فطرت شناسی، اصلیت، صداقت وغیرہ پر دوسرے کے خیالات اگلتا رہا اور اسی طرح کے خرافات میں وقت ضائع کرتا رہا۔ پچیس برس تک یہ اُن چیزوں پر لکچر دیتا رہا اور لکھتا رہا جنہیں ہر ذی شعور آدمی سمجھتا ہے اور بیوقوف غیر دلچسپ سمجھتے ہیں۔ پس پچیس برس تک یہ محض تضیع اوقات کرتا رہا اور اس کے باوجود ذرا اسکا مغالطہ دیکھو! اب بڑھاپے میں پنشن لے کرکے آیا ہے تو نہ تو کوئی شخص اس کے نام سے واقف ہے نہ کوئی اس کی تعریف کرتا ہے۔ غرض اسے کوئی نہیں جانتا۔ بس یوں سمجھو کہ پچیس برس تک جو کچھ اس نے کیا وہ یہ کہ ایک شخص کی حق تلفی کی جو اس کی جگہ اس سے بہتر کام کر سکتا ہے۔ لیکن اُسے اسکا احساس ہی نہیں وہ خود کو خدا جانے کیا سمجھتا ہے خدا کا نائب سمجھتا ہے۔ گویا سارے علوم اس کے سینہ میں بند ہیں!

استروف۔ بس بھی کرو۔ میں سمجھتا ہوں تم اُس سے جلتے ہو؟

وائنٹسکی۔ ہاں جلتا ہوں۔ اور عورتوں کے ساتھ اُسے کیسی کامیابی ہوتی ہے! اسکی پہلی بیوی میری بہن، ایک بھولی، نیک، آسمان کی طرح ستھری، ذی حوصلہ لڑکی جس کے پاس اتنے شادی کے پیغام آئے جتنے اس بڈھے کے شاگرد بھی نہ ہونگے اس سے ایسی محبت کرتی تھی اس پر اس طرح جان دیتی تھی جیسے صرف فرشتے اپنے ہم جنسوں سے محبت کر سکتے ہیں۔ اور

اماں آج تک اُسے جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہیں اور اُسے دیکھکر اتبک اُنکے دل میں ایک معتقدانہ خوف پیدا ہوتا ہے اُس کی دوسری بیوی نے جو ایسی نیک دلکش اور ذہین ہے۔ تم نے ابھی اسے دیکھا۔ اس سے بڑھاپے میں شادی کی۔ اپنی جوانی، اپنا حسن، اپنی وفاداری، اپنی قابلیت سب اس پر قربان کر رکھی ہے۔ کس لئے؟ کیوں؟

استروف۔ پروفیسر سے وہ وفادار رہتی ہے؟ اُس سے خوش ہے؟

وائنٹسکی۔ یہی تو افسوس ہے کہ ہے۔

استروف۔ افسوس کیوں ہے؟

وائنٹسکی۔ کیونکہ یہ وفاداری شروع سے آخر تک غلط ہے۔ اس میں لطافت ہو تو ہو منطق سرے سے نہیں۔ ایک بڈھا ناکارہ شوہر جس کا وجود ہی بارِ طبیعت ہو اسے دہوکا دینا گناہ ہے لیکن اپنی جوانی اور اپنے حسن اور اپنی آرزوں کو مارنا اور گھونٹ کر رکھنا گناہ نہیں ہے۔

تلی گن۔ (غمگین آواز سے) وائنٹسکی! یہ باتیں تو نہیں سنی جاتیں۔ بس کرو! جو شخص اپنی بیوی یا شوہر کو فریب دے اسکا کوئی اعتبار نہیں۔ وہ اپنے ملک سے بھی دغا کریگا۔

وائنٹسکی۔ (غصہ میں) تو چپ رہ مفت خورے!

تلی گن۔ معاف کرنا بھائی۔ میں تمہیں بتاتا ہوں۔ میری بیوی کسی سے محبت کرتی تھی جبدن میرے گھر وہ آئی اُسی کے دوسرے دن وہ اپنے عاشق کے ساتھ نکل بھاگی۔ کیا کرتا۔ ... میاں میں اپنی وفاداری کیوں چھوڑوں۔ میں اتبک اُسے چاہتا ہوں۔ اس پر جان دینے کو تیار ہوں جہانتک مجھ سے ہوتا ہے اس کی مدد کرتا رہتا ہوں اور اس آدمی سے اس کے بچے ہوئے اُنکی تعلیم کے لئے جو میرے پاس تھا میں نے اُسے دیدیا۔ میری فراغت میری خوشی سے مجھ سے چھن گئی لیکن یہ افتخار میرے پاس باقی ہے۔ یہ افتخار بس ہے۔ اور وہ اُس کی جوانی ختم ہوگئی۔ اُس کا حسن بھی فطرت کے قانون کے موافق مرجھا گیا، اڑ گیا، جس سے

اُسے محبت تھی وہ بھی مرگیا ۔ ۔ ۔ ۔ اب اس کے پاس کیا رکھا ہے؟

(سونیا اور یلنا اینڈریونا داخل ہوتی ہیں۔ اس کے بعد ماریا واسیلیونیا ایک کتاب لئے داخل ہوتی ہے۔ وہ بیٹھ جاتی ہے اور پڑھتی ہے۔ اُسے چائے دیتے ہیں اور وہ بغیر پیالی پر نظر ڈالے اُسے پیتی ہے)

سونیا۔ (جلدی سے انا سے) انا جانی! کچھ کاشتکار آئے ہیں اُن سے ذرا باتیں کرلیں اتنے میں چائے کو دیکھتی ہوں۔

(انا جاتی ہے۔ یلنا اینڈریونا اپنی پیالی لیتی ہے اور جھولے میں بیٹھ کر چائے پیتی ہے)

استروف۔ (یلنا اینڈریونا سے) میں تمہارے شوہر کو دیکھنے آیا ہوں تم نے مجھے لکھا تھا کہ وہ بیمار ہیں۔ گٹھیا یا کونسی بیماری ہے؟ مگر وہ تو بالکل اچھے معلوم ہوتے ہیں۔

یلنا۔ پچھلی رات بڑی تکلیف سے گزری۔ وہ اچھے نہیں رہے۔ پیروں میں درد رہا۔ مگر آج ذرا اچھے ہیں۔

استروف۔ اور میں جو بیس میل سے گھوڑا دوڑائے ہوا کی مثال چلا آرہا ہوں! مگر خیر کیا ہرج ہے۔ یہ پہلا اتفاق نہیں ہے۔ اس کی عوض میں کل تک تمہارے پاس ٹھہروں گا ذرا آرام سے سونا تو نصیب ہوگا۔

سونیا۔ ضرور، ضرور کبھی کبھی تو آپ ہمارے ہاں آتے ہیں ۔ ۔ ۔ میں سمجھتی ہوں آپ نے ابھی کھانا نہیں کھایا؟

استروف۔ ہاں ابھی نہیں۔

سونیا۔ بہت خوب۔ تو بس آپ ہمارے ساتھ کھانا کھائیں گے! اب ہم چھ اور سات کے درمیان کھانا کھاتے ہیں۔ (چائے پیتی ہے) چائے ٹھنڈی ہے۔

تلی گن۔ معلوم ہوتا ہے سماوار کا ٹمپریچر گر گیا ہے۔

یلنا۔ کیا مضائقہ ہے، آئوان آئوانچ! ہم ٹھنڈی ہی چائے پئیں گے۔

تلی گن۔ معاف کیجئے میں آئوان آئوانچ ہنیں ہوں، میرا نام الیاایچ تلی گن ہے۔ آپ کے شوہر سے میری خوب شناسائی ہے۔ اب میں آپ کی جائداد ہی پر رہتا ہوں۔ اگر آپ نے غور کیا ہو تو میں آپ کے ساتھ روز کھانے میں شریک ہوتا ہوں۔

سونیا۔ الیاایچ سے ہمیں بڑی تقویت ہے، یہ ہمارا داہنا ہاتھ ہیں (شفقت سے) آپ کیلئے دوسری پیالی بناتی ہوں!

ماریا۔ ارے، رے!

سونیا۔ کیا بات؟ ننّا؟

ماریا۔ میں الکزنڈر سے کہنا بھول گئی۔ میرا حافظہ خراب ہو چلا۔ آج پاول الکزیوچ نے ہارکو سے خط بھیجا ہے . . . . اُس کی نئی کتاب بھی آئی ہے۔

استروف۔ کچھ دلچسپ ہے؟

ماریا۔ دلچسپ ہے مگر کچھ عجیب سی ہے۔ اب اُسے اُن اصولوں سے اختلاف ہے جن پر سات سال پہلے وہ خود کاربند تھا

وانشکی۔ ان لاحاصل باتوں اور رسالوں اور کتابوں کے پڑھے جانے میں تو پچاس سال گزر چکے اب تو اسے ختم ہی کرنا چاہئے۔

ماریا۔ میں جب بولتی ہوں جبھی تمہیں ناگوار ہوتا ہے۔ تم میری باتیں سننا نہیں چاہتے نہ جانے کیوں! میرا یہ کہنا معاف کرو، تم پچھلے ایک سال میں ایسے بدل گئے ہو کہ میں تمہیں سمجھ نہیں سکتی۔ تم تو بڑے اصولی آدمی تھے اور دنیا میں بہت کچھ کرنا چاہتے تھے۔

وانشکی۔ آہ، ہاں! میں بہت کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن حال یہ ہے کہ میں نے کسی ایک کے دل کو نہیں ابھارا، کسی دل میں ولولہ، حوصلہ، تڑپ نہیں پیدا کی (ایک وقفہ) . . . بہت کچھ کرنا چاہتا تھا۔ اس سے زیادہ سخت حملہ آپ نہیں کرسکتی تھیں! اب میں سینتالیس سال کا

ہوں۔ پچھلے سال تک میں نے آپ کے نمائشی اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی تاکہ زندگی کی تلخ حقیقتوں سے بے بہرہ رہوں — اور سمجھتا رہا ٹھیک چل رہا ہوں۔ اور اب۔ کاش آپ جانتیں۔ پریشانی اور خیالات اور افکار کے باعث میں راتوں کو سو نہیں سکتا۔ اس غم و غصہ افسوس میں کہ کیوں اپنی عمر کے بہترین ایام بے کار صرف کئے، ضائع کئے میں آرام نہیں کر سکتا ممکن تھا کہ اُن تمام مسرتوں پر قابو حاصل کر سکتا جن سے مجھے میری عمر اب محروم کر دینا چاہتی ہے۔

سونیا۔ ماموں جان! پھر یہ بے دلی کی داستان۔ ۔ ۔ یہ خشک تذکرے! ۔ ۔ ۔ ۔

ماریا۔ (اپنے بیٹے سے) معلوم ہوتا ہے تم پچھلی زندگی کو قابل الزام سمجھتے ہو۔ پچھلے اصولوں سے انحراف کرتے ہو۔ انہیں الزام دینے سے کچھ حاصل نہیں اپنے کو الزام دو۔ تم بھولتے ہو کہ اصول بذاتہ کوئی مفید شے نہیں ہیں۔ تمہیں عمل اور کام کی ضرورت تھی۔

وانٹسکی۔ کام؟ ہر شخص اُس بڈھے پروفیسر کی طرح لکھنے کی مشین تو نہیں ہو سکتا۔

ماریا۔ اس کہنے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟

سونیا۔ (خوشامد سے) ننّا! ماموں جان! خدا کے لئے!

وانٹسکی۔ میں اپنی زبان بند کر دوں گا۔ زبان بند کرتا ہوں۔ معافی مانگتا ہوں۔

(ایک وقفہ)

یلنا۔ کیا خوشگوار دن ہے! گرمی زیادہ نہیں ہے۔

(ایک وقفہ)

وانٹسکی۔ ایسا دن ہے کہ گردن میں پھانسی چڑھا لینے کو جی چاہتا ہے!

(تلی گن ستار کے سُر درست کرتا ہے۔ مارینا مکان کے پاس ادھر اُدھر گھومتی ہے اور ایک مرغی کو بلا رہی ہے)

مارینا۔ تی۔ تی تی!

سونیا۔ انا جانی! گاؤں والے کس کام سے آئے تھے ؟

مارینا۔ اُسی — بنجر زمین کی بابت بات چیت کرنا چاہتے تھے، تی، تی تی !

سونیا۔ کس مرغی کو بلا رہی ہو ؟

مارینا۔ یہ چتلی معہ بچوں کے کہیں غائب ہے . . . . کہیں کوّے نہ دیکھ لیں (چلی جاتی ہے)

تلی گن، ایک گیت چھیڑتا ہے۔ سب خاموشی سے سنتے ہیں۔ ایک مزدور داخل ہوتا ہے)

مزدور۔ ڈاکٹر تو یہاں نہیں ہیں ؟ (استروف سے) معاف کیجئے، آپ کا بلاوا آیا ہے۔

استروف۔ کہاں سے ؟

مزدور۔ کارخانہ سے۔

استروف۔ (گھبرا کے) تمہارا بہت ممنون ہوں۔ میں سمجھتا ہوں مجھے جانا چاہئے (ادہر ادہر اپنی ٹوپی ڈھونڈتا ہے) لاحول . . . . . .

سونیا۔ میں کہتی ہوں یہ کیا مذاق ہے! اچھا کھانے کے وقت آپ آجائیں گے۔

استروف۔ نہیں مجھے دیر ہو جائیگی، "کہیے کیونکر؟" (مزدور سے) اچھا میاں، ذرا کہیں سے مجھے ایک گلاس دود کا تو لا دو (مزدور جاتا ہے) "کہیے کیونکر . . . ؟" (ٹوپی مل جاتی ہے) استرووسکی[1] کے ایک ڈرامہ میں ایک شخص ہے جس کی بڑی بڑی مونچھیں ہیں اور وا جبی سی عقل ہے — بالکل میری طرح سے۔ اچھا، میں سب سے خدا حافظ کہنے کی عزت حاصل کرتا ہوں (یلنا اینڈریونا سے) اگر کبھی آپ معہ صوفیا کے ہمارے گھر آنیکی زحمت برداشت کریں تو مہربانی ہوگی۔ میری چھوٹی سی ریاست ہے صرف نوے ایکڑ قطعہ زمین لیکن سو میل ادہر ادہر آپ کو ہمارے ہاں کی سی پھلواری اور میرا جیسا باغ دیکھنے کو نہ ملے گا۔ اگر اس سے آپ کو دلچسپی ہو میری زمین سے ملے ہوئے سرکاری باغات ہیں جنگلوں میں درخت نصب

---

[1] ایک مشہور روسی مصنف۔ (مترجم)

کرائے جا رہے ہیں۔ وہاں کے محافظ بیمار رہتے ہیں سب کام میں کرتا ہوں۔

یلنا۔ میں سن چکی ہوں کہ آپ کو باغوں سے اور درخت نصب کرانے سے خاص شوق ہے بیشک اس سے بھی بڑے فائدے ہیں لیکن اس کی وجہ سے آپ کے اصل کام میں حرج نہیں واقع ہوتا؟ آپ ڈاکٹر ہیں

استروف۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کسی کا اصل کام کیا ہے۔

یلنا۔ دلچسپ مشغلہ ہے؟

استروف۔ ہاں، دلچسپ مشغلہ ہے

وانتسکی۔ (طنز سے) بڑا دلچسپ مشغلہ ہے!

یلنا۔ (استروف سے) آپ ابتک جوان ہیں۔ صورت سے چھبیس یا ستائیس سال سے زیادہ عمر نہیں معلوم ہوتی . . . . جتنا آپ کہتے ہیں اتنا دلچسپ کام تو یہ ہو نہیں سکتا یہاں سے وہاں تک درخت حد نظر تک درخت ہی درخت اس میں کیا دل کشی ہے؟ میں سمجھتی ہوں اس سے طبیعت اکتانے لگتی ہوگی۔

سونیا۔ نہیں! اس میں کوئی دل کشی ہی نہیں؟ ڈاکٹر ہر سال درخت نصب کراتے ہیں، نئے نئے اچھے اچھے، اس کام کے صلہ میں انہیں ایک تمغہ اور سند بھی مل چکی ہے۔ انکا یہ بھی خیال ہے کہ پرانے جنگل ضائع نہ ہوں ان کی باتیں سنو تو تم ان سے اتفاق کرنے لگوگی۔ یہ کہتے ہیں جنگل ہماری آبادیوں کی زینت ہیں یہ انسان کو فطری حسن و خوش مذاقی کی تعلیم دیتے ہیں اور اس سے انسان کے دماغ کی اعلیٰ و ارفع صلاحیتیں ترقی پاتی ہیں جنگل آب و ہوا کی حدت کو کم کرتے ہیں۔ اُن ملکوں میں جہاں کی آب و ہوا اچھی ہوتی ہے قدرت کے ساتھ جد وجہد کرنے میں کم قوتیں ضائع ہوتی ہیں اس لئے انسان زیادہ نرم اور نیک ہوتے ہیں ایسے ملک میں انسان ذی حس، خوبصورت اور نرم دل ہوتے ہیں، ان کی زبان ترقی یافتہ اور اُنکے طریقے شریفانہ ہوتے ہیں۔ آرٹ اور علم اُن لوگوں میں ترقی پاتے ہیں۔ اُنکا فلسفہ دھندلا اور غم فزا

نہیں ہوتا اور عورت کے ساتھ انکا برتاؤ اور انکے سلوک مہذب اور شریفانہ ہوتے ہیں۔

وائنسکی ۔ (ہنستے ہوئے) خوب! خوب! یہ سب دلچسپ ضرور ہے لیکن دل کی تسلی اس سے نہیں ہوتی۔ (استروف سے) مجھے تو اجازت دیجئے کہ میں لکڑیوں سے خوب انگیٹھی گرم کیا کروں اور اپنی کوٹھریاں لکڑی سے پاٹوں۔

استروف ۔ تم انگیٹھی گوبر سے گرم کر سکتے ہو اور کوٹھری اینٹ سے پاٹ سکتے ہو۔ میں اس کے لئے تیار ہوں کہ تمہیں ضرورت مجبور کردے تو لکڑی کاٹ لو مگر جنگلوں کو تباہ اور برباد کرنے سے کیا حاصل! روس کے جنگل کلہاڑیوں کا نشانہ ہو رہے ہیں۔ ہزاروں درخت تباہ ہوگئے۔ جنگلی جانور اور چڑیوں کے گھر بے نشان ہوگئے۔ دریا خشک ہوئے جا رہے ہیں۔ خوشنما مناظر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہماری نظروں سے محو ہو رہے ہیں اور یہ سب کیوں؟ اس لئے کہ کاہل انسان کو سمجھ نہیں کہ جھک کر اور ایندھن زمین سے چن لے (یلینا اینڈریوناسے) مادام! میں غلط کہتا ہوں؟ ناسمجھ اور نیم وحشی آدمی ہی فطرت کے ان مناظر کو انگیٹھی میں دفن کرنے کے لئے اُس چیز کو تباہ کرنے کے لئے جسے ہم پیدا نہیں کر سکتے آمادہ ہو سکتے ہیں۔ انسان کو عقل اور تخلیقی قوت دی گئی ہے تاکہ جو اُسے ودیعت کیا گیا ہے وہ اس کی حفاظت کرے۔ نہیں بلکہ اُس میں اضافہ کرے مگر آج تک اُس نے کوئی اضافہ نہیں کیا۔ اس کے برعکس ابتری پھیلا رکھی ہے۔ دن بدن جنگل کم ہوتے جا رہے ہیں دریا سوکھ رہے ہیں جنگلی جانور غائب ہو رہے ہیں، آب وہوا خراب ہو رہی ہے اور دن بدن یہ زمین مفلس تر اور تکلیف دہ تر ہوتی جاتی ہے (وائنسکی سے) آپ مجھ پر ہنس رہے ہیں اور جو میں کہتا ہوں اسے مذاق سمجھتے ہیں اور — شاید میں واقعی فضول بک رہا ہوں لیکن جب میں ان حصوں سے گزرتا ہوں جنہیں میں نے تباہ ہو جانے سے بچایا ہے، کاٹ ڈالے جانے سے محفوظ رکھا ہے یا جب میں اُن کنجوں اور کیاریوں کے درختوں کے پتوں کی سرسراہٹ سنتا ہوں جنہیں میں نے اپنے ہاتھ سے پروان چڑھایا ہے میں محسوس کرنے لگتا ہوں کہ آب وہوا کسی حد تک میری قدرت اور میرے مقبوضات میں

سے ہو اور یہ کہ اگر کبھی ہزار برس میں انسان کو سچی مسرت نصیب ہوئی تو اس حصول میں کچھ حصہ میرا بھی ہوگا۔ جب میں کوئی پودا نصب کرتا ہوں اور اُسے شاداب و سرسبز ہوتے اور ہوا میں خوش فعلیاں کرتے دیکھتا ہوں تو میری روح ایک جذبۂ تفاخر سے بالیدہ ہوتی ہے اور میں ۔ ۔ ۔ ۔ (مزدور کو دیکھکر جو ایک کشتی میں ایک گلاس شراب سے بھر کر لاتا ہے) خیر ۔ ۔ ۔ (پیتا ہے) اب میرے جانے کا وقت ہے یہ شاید صحیح ہے کہ میں بے حد بکواس کرتا ہوں ۔ ۔ ۔ اچھا خدا حافظ کہتا ہوں! (گھر کی طرف مڑتا ہے)

سونیا۔ (اُسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر اُس کے ساتھ چلتی ہے) اچھا اب کب آئے گا!

استروف۔ دیکھو معلوم نہیں۔

سونیا۔ کہیں پھر آپ ایک ماہ تک غائب نہ ہو جائیں۔

(استروف اور سونیا مکان میں جاتے ہیں۔ ماریا واسلیو ونیا اور تلی گن میز کے پاس رہ جاتے ہیں۔ یلنا اینڈریونا برآمدہ کی طرف ٹہلتی ہے)

یلنا۔ آئوان پٹروویچ، پھر تم بہکی بہکی باتیں کر رہے تھے۔ تمہیں ماریا واسلیو ونیا کو ناراض کرنے اور لکھنے کی مشین کہنے کی کیا پڑی تھی! آج کھانے پر پھر تم الکزنڈر سے لڑ بیٹھے۔ افسوس کیسی ذرا ذرا سی باتوں پر!

وائنٹسکی۔ لیکن میں اُس سے نفرت کرتا ہوں تو؟

یلنا۔ نفرت کرنیکی کوئی وجہ نہیں سمجھ میں آتی۔ جیسے اور سب ہیں ویسا ہی ایک وہ ہے۔ تم سے زیادہ بُرے تو وہ نہیں ہیں۔

وائنٹسکی۔ کاش تم اپنے چہرے اور اپنی اداؤں کو دیکھتیں۔ تم کتنی نڈھال اور مغموم رہتی ہو۔ آہ بُری مغموم

یلنا۔ آہ! مغموم اور خراب حال! ہر شخص اُسی کا شاکی ہے۔ ہر شخص مجھے ترحم سے دیکھتا ہے مجھ پر رحم کھانے کو آمادہ ہے آخر یہ کیا خیال کرتے ہیں" افسوس! بیچارے بڈھے کے پلے

پڑی" مجھ سے یہ ہمدردیاں! میں خوب سمجھتی ہوں۔ ابھی استروف کہہ رہا تھا۔ تم سب جنگلوں کو تباہ کر رہے ہو اور بہت جلد زمین پر کچھ نہیں رہ جائیگا۔ بالکل اسی طرح تم بے دردی سے انسانیت کو ضائع کر رہے ہو اور بہت جلد تمہارے طفیل میں دنیا کے صفحہ سے رحم مروت، شفقت، خالص وفاداری اور ایثار کے جذبات کے نشان یک قلم مٹ جائیں گے۔ کیا وجہ ہے کہ تم عورت کو جبتک وہ تمہاری نہ ہو بغیر حرص کے نہیں دیکھ سکتے؟ کیونکہ ــ ڈاکٹر نے سچ کہا۔ تم سب کے اندر ایک شیطانی ایک حیوانی جذبہ ہے۔ تم تباہی چاہتے ہو جنگلوں، چڑیوں، عورتوں کیلئے تم میں ہمدردی کا احساس نہیں

وائنٹسکی۔ یہ اخلاقی بحثیں تمہاری زبان سے اچھی نہیں معلوم ہوتیں۔

(ایک وقفہ)

یلنا۔ اس ڈاکٹر کے چہرے سے اداسی اور نرم دلی کی علامتیں ہویدا ہیں۔ دلچسپ چہرہ ہے معلوم ہوتا ہے سونیا کو اُس نے گرویدہ کر لیا ہے۔ اسے اس سے محبت ہو گئی ہے اور میں اس کے احساسات کو سمجھتی ہوں جب سے میں یہاں ہوں وہ تین مرتبہ آیا مگر میں بڑی شرمیلی ہوں۔ ایک دفعہ بھی اس سے ٹھیک طرح بات نہ کر سکی نہ اُس سے اچھے جی بولی۔ وہ سمجھتا ہے میں بداخلاق ہوں . . . .

وائنٹسکی! ممکن ہے یہی وجہ ہو کہ ہم میں تم میں ایسی دوستی ہے۔ کیوں؟ ہم دونوں کے دل اداس ہیں اور زندگی بے لطف اور تاریک ہے۔ بے لطف! میری طرف ایسی نظر سے نہ دیکھا کرو۔ مجھے ایک آن نہیں بھاتا۔

وائنٹسکی۔ اور کیسی نظر سے تمہیں دیکھوں، میری جان! تجھ سے مجھے عشق ہے۔ میری زندگی، میری جوانی، میری خوشی! میں جانتا ہوں، میرے جذبات کا جواب تمہاری طرف سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہاں! مجھے اس کی کوئی امید نہیں مجھے کیسے چاہ سکتی ہو! کیا کروں . . . . . . میں تم سے کچھ نہیں مانگتا۔ مجھے صرف تمہارا دیدار چاہئے۔ مجھے ایک نظر دیکھ لینے دو، میرے دل کو اپنے جلوے سے بھر دو۔ تمہارا دیدار، تمہاری آواز . . . .

یلنا۔ یہ کیا ہے! ہٹو بھی کوئی سن نہ لے (مکان کو جاتے ہیں)

وائنشکی۔ (اس کے پیچھے پیچھے) مجھے اپنے عشق کو برملا کہنے دو۔ مجھے یوں نہ ٹھکراؤ۔ مجھے خوشی سے محروم نہ کرو . . . .

یلنا۔ چپ بھی رہو توبہ . . . .

(دونوں مکان میں جاتے ہیں۔ تلی گن تاروں کو چھیڑتا ہے اور ایک گیت سناتا ہے ماریا واسلیوونا کتاب کو پڑھے جا رہی ہے اور حاشیہ پر پنسل سے نشان لگاتی ہے)

پردہ

(باقی)

قانونی زندگی

انسانوں کی گرفت، بازپرس، پرسش، سوال۔ ڈر خوف۔ ہراس وحشت۔ گھبراہٹ اضطراب، بےچینی۔ خطرہ۔ اندیشہ۔ دھمکی سزا۔ ڈانٹ ڈپٹ، تخویف۔ مارپیٹ۔ قید۔ بندش، نگرانی اور تعطل کے کاغذی ذریعہ کو اگر "قانون" کہا جائے یا کہتے ہیں، یا کہا ہے۔ یا کہنا چاہیے یا کہا گیا ہے یا کہیں گے یا کہا جائے گا۔ یا کہو، تو پھر شبہ، نوٹس۔ سمن، وارنٹ۔ گالی گلوج۔ دھول۔ دھپا۔ گھونسہ۔ بید۔ لاٹھی۔ ہوائی فیر۔ گرفتاری۔ ہتکڑی۔ بیڑی۔ جامہ تلاشی۔ حوالات۔ ریتلی روٹی۔ پھیکا ساگ۔ بغیر روشنی کا کمرہ مع مچھر۔ بچھو۔ سانپ۔ چالان، پیشی پر پیشی، اثبات دعوے۔ جواب دعوے۔ وکالتاً یا اصالتاً۔ پیروی۔ جواب دہی۔ تحریری بیان، جواب دینے سے انکار۔ ضمانت، فرد جرم۔ عینی گواہ۔ صرفہ خوراک۔ اقرار صالح۔ جرح۔ تنقیحات۔ فیصلہ۔ ایک درجن بید۔ جرمانہ۔ بصورت عدم ادائے جرمانہ قید محض۔ قید بامشقت۔ کال کوٹھری۔ مونج بٹوانا۔ بحالت بیڑی کھدر کا قمیص بحالت قیام جیل، تختی نمبر فلاں در گلو۔ چکی چلانا اس حالت میں کہ قیدی کا تخلص حسرت موہانی ہو حبس دوام بعبور دریائے شور اس شرط پر کہ مجرم علاقہ بنگال کا ضرور ہو۔ قصاص پھانسی۔ اور سولی جبتک کہ مر نہ جائے۔ یہ سب لوازم قانون یا اثرات قانون کہلائیں گے یا کہے جاتے ہیں۔

لیکن اگر ہم سے کوئی "قانون" کی تعریف دریافت کرے تو ہم بریلی کے میلاد خواں لوگوں کی طرح بجائے کسی لغت اور بلاغت کے قانون کو اس عملی مثال سے سمجھا دیں گے کہ "گھوڑے کی وہ لگام جس کے ذریعہ گھوڑے کو یا گھوڑے پر بیٹھنے والے کو راستہ پر ایسا سیدھا چلانا جو خطرے اور تصادم سے محفوظ رہے۔ اور گھوڑے کی دوڑ

یا چال یا رفتار کسی کے لئے اگر مفید نہو تو مضر بھی نہو۔ اب اگر یہ کہیں کہ قانون ان افلاطونی اصول کے مجموعہ کو کہتے ہیں جن کے ذریعے کبھی کبھی مجرم بھی بلا اخذ جواب رہا ہو کر مدعی کے حق میں الٹا ازالہ حیثیت عرفی بن جاتا ہے تو ہم کہیں گے کہ پھر تو افلاطون بھی ذرا بے وقوف تھا۔ کیونکہ قانون کی صحیح تعریف تو یہ ہو سکتی ہے کہ۔

ایسا طریقہ جس سے انسان آزاد رہکر بھی نقصان نہ پہونچا سکے اور نہ نقصان پائے

اب اس تعریف پر اگر کچھ اضافہ ہو سکتا ہے تو وہ صرف لفظ "ہرگاہ" کا کیونکہ اصطلاحاً ہر وہ فقرہ اور ہر وہ عبارت قانون سمجھی جائے گی۔ یا قانون کا اثر پیدا کر کے چھوڑے گی۔ جس کے سرے پر یا شروع میں لفظ "ہرگاہ" ہو اور بقیہ عبارت اس قدر پیچیدہ اور گنجان ہو کہ اپنے بڑے مولوی صاحب بھی اس کا مفہوم نہ سمجھ سکیں۔

وکیلوں کے خیال میں "قانون" وہ ہے جس سے موکل یا موکلہ تابع ہو یا بغیر پیشی نصف محنتانہ ادا کر دے یا ادا کرنے کا وعدہ کرے۔ یا ادا کرنے کی اہلیت رکھتا ہو یا رکھتی ہو۔ یا بصورت جیت جانے مقدمہ کے دس روپے علاوہ محنتانہ کے "مٹھائی" کے نام سے ان کے بچوں کے ہاتھ پر رکھدے۔ یا ان کے منشی کو دیدے۔

ان تعریفات کے بعد ہمارے نزدیک قانون کہتے ہیں اس قوت کو جو انسان کے اندر دوسرے قوی کی طرح موجود ہے۔ اور جو اس کی جملہ قوتوں پر احتساب و نگرانی کرتی ہے یہ قوت انسان کو غلط کاری اور غلط روی سے روکتی ہے۔ اور اس میں اعتدال و سلامت روی پیدا کر کے ہر مضرت سے محفوظ رکھتی ہے۔ اس قوت کا بقا منحصر ہے انسان کی اچھی صحت اور بہترین ماحول پر۔ اگر انسان کی صحت نہایت درجہ معتدل اور صحیح ہو لیکن وہ جرائم پیشہ طبقہ میں رہے یا رکھا جائے تو اس کی قانونی قوت بیکار یا مضمحل ہو جاتی ہیں لیکن اگر وہ ایسے ماحول میں رہتا ہے یا رہتی ہے جہاں سب کے سب یا اکثر لوگ "قانونی زندگی" کے خوگر ہیں تو وہ ہر قسم کی غلط کاری یا غلط روی سے محفوظ رہکر صحیح معنی کا انسان بن سکتا ہے

قانونی زندگی والے کی پہچان یہ ہے کہ وہ سوسائٹی یا قوم کی متفقہ یا مروجہ طرز زندگی سے ایک بالشت۔ ایک انچ۔ ایک ہاتھ، ایک گز۔ ایک سوت، یا ایک کلومیٹر بھی پیچھے نہ رہے۔ اور نہ آگے بڑھے اور اسی لئے یہ واضعین قانون انسانی نے جو اصول وضوابط انسانی زندگی کو منتظم اور محفوظ رکھنے کے لئے وضع کئے ہیں وہ سراسر انسان کو وحشت اور درندگی سے پاک کرکے پرامن اور سلیقہ مند۔ منتظم اور نفع بخش بنانے والے ہیں۔ یہاں آپ واضعین قانون سے کہیں، مسٹر، وی۔ جی۔ پٹیل اور سر ملک عمر حیات خاں ٹوانہ کو نہ سمجھ لیجئے۔ بلکہ وہ مافوق الفطرت انسان مراد ہیں جنہوں نے انسان کے پرامن رہنے سہنے کے طریقے وضع کئے ہیں۔

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ قوت آج ہمارے ملک کے افراد میں کہاں تک باقی ہے۔ اور جو نہیں ہے تو کیوں۔ مگر اس کے لئے پہلے ان افراد انسانی کی قانونی زندگی پر ایک نظر ڈالنا ہوگی جو صحیح معنی میں یا بڑی حد تک قانونی زندگی کے دائرے میں آتے ہیں۔ اس لئے لامحالہ ہمکو یہی سامنے والے لوگ عرف انگریزوں کی زندگی کو مثال بنانا پڑے گا۔ مثلاً آپ ایک انگریز کو لیجئے اور دیکھئے کہ وہ صبح اذانوں کے وقت نیند سے بیدار ہوگا اور ہو کر رہیگا پھر وہ صبح کی میونسپل کمیٹی کے اجلاس سے فارغ ہو کر غسل کرے گا۔ یا منہ ہاتھ دھوئیگا۔ یا کلی کرے گا۔ یا ناک میں پانی نہ ڈالیگا تو سر کے بالوں کو سنوارے گا۔ یا مسواک نکرے گا تو برش سے دانت صاف کرے گا اور صاف کر کے رہیگا۔ پھر وہ ناشتہ کرے گا اور جو ڈبل روٹی نہ کھائیگا تو انڈے کھا کر رہیگا۔ ورنہ چائے سے تو کسی حال میں نہ چوکے گا۔ پھر وہ اخبار پڑھیگا یا خطوط لکھے گا۔ پھر وہ اسکول جائیگا۔ یا دفتر یا دوکان پر یا کھیت پر یا پریڈ پر یا روئی کے کارخانے میں یا اسٹیشن پر یا جہاز پر یا کسی کارخانے میں کام سیکھے گا۔ بہرحال وہ کہیں جا کر رہیگا۔ پھر وہ عین دوپہر سے ذرا ادھر ہٹ کر کھانا کھائیگا۔ چاہے اسوقت اس کے سامنے کسی ہندوستانی کی پھانسی کا مقدمہ ہی کیوں نہ پیش ہو پھر وہ گھر آئیگا اور یہاں غسل کرکے

پھر چائے یا بسکٹ یا سیب اور انگور کھائے گا۔ پھر وہ اصالتاً یا کتے کے ساتھ سیٹی بجاتا ہوا کرکٹ، ٹینس یا ٹھنڈی سڑک یا پارک یا بازار کی تفریح کو جائیگا اور جا کر رہیگا۔ تاکہ ہلکا سا پسینہ اس کے جسم سے پیدا ہو جائے۔ پھر وہ مغرب کی اذانوں کے بعد گھر آکر غسل کرے گا پھر وہ ڈنر۔ ضیافت۔ ایٹ ہوم یا صرف اپنے ننھے میاں کی والدہ۔ کے ساتھ کھانا کھائیگا پھر کچھ دیر اخبار۔ گپ۔ تاش۔ بلیرڈ۔ قہقہہ۔ شراب۔ غور و فکر میں گذار کر پلنگ خفتہ باشد ہو جائیگا۔ یا ہو جائینگی اور دوسری صبح پھر وہ گذشتہ سے پیوستہ ہو جائیگا۔

⁂

انگریزوں کی یہ ہے وہ زندگی جسے قانونی زندگی، کہا جاتا ہے یا کہنا چاہیئے۔ بخلاف اس کے ہندوستانیوں کی زندگی میں قانون کی پابندی نظر آتی ہے کہ وہ صبح سویرے نہ اٹھا ہے نہ اٹھیگا یا کیوں اٹھے اور کیوں اٹھایا جائے۔ یا کون اٹھائے۔ اور کسے غرض یا کون اٹھاتا ہے۔ اور کس لئے اٹھائے یا اٹھائے تو اس کی جھنجھلاہٹ اور ڈانٹ ڈپٹ کون سنے اور کسے پڑی پھر اگر وہ اٹھا بھی تو نصف گھنٹہ تک وہ کروٹیں ہی لیتا رہیگا۔ یا لیکر رہیگا۔ پھر وہ پلنگ پر بیٹھ تو جائیگا مگر اس طرح کہ ابھی اسکی آنکھیں بند ہوں گی۔ پھر وہ اونگنا شروع کرے گا یہاں تک کہ ایک مرتبہ تو وہ تکیہ پر سر کو رکھ ہی دے گا۔ وہ پھر اٹھیگا۔ اور اب وہ کبھی کان پر ہاتھ مارے گا۔ کبھی ناک پر۔ مگر آنکھیں ابھی بند ہی رکھیگا۔ وہ اب پھر لیٹ جانیکی طرف مائل ہوگا۔ اور لیجئے وہ پھر لیٹ گیا۔ اب پھر وہ ہوشیار ہوگا۔ لیکن اسی گرانی کے ساتھ۔ اور جو اب بھی اس کے پلنگ پر دھوپ نہیں آئی ہے تو وہ پھر سو جائیگا اور سو کر رہیگا۔ اب دھوپ آجانے یا خمار ختم ہو جانے کی وجہ سے وہ آنکھیں تو کھول دے گا۔ مگر جنبش نکریگا صرف بہ آواز بلند جمائیاں لیگا اور پانی سے بھرے ہوئے لوٹے کو پلنگ ہی پر سے دیکھیگا اگر قریب تر نظر آگیا تو وہ اب حقے یا سگریٹ یا بیڑی کے کش لگائیگا اور پھر لوٹا لیکر میونسپل بورڈ جائیگا۔ اور وہاں سر کو دونوں ہاتھوں کا سہارا دیکر ایک مرتبہ پھر سو جانے کی کوشش کریگا

یا اونگھنے میں مصروف ہو جائیگا اور جو یہ کچھ نہیں تو صرف آنکھیں ضرور بند کرلیگا۔ اور بند کرکے رہیگا۔ اب وہ میونسپل بورڈ کے دوسرے ممبر کی کھانسی یا ڈانٹ سنکر باہر آئیگا اور بقدر نصف مشک پانی سے صرف ہاتھ منہ دھوئیگا۔ گویا تمام دنیا کا غبار اسی کے چہرے کو خراب کرگیا ہے۔ اس منہ دھلائی میں بقدر مقدرت خدام کا سہارا بھی لیا جاتا ہے۔ واضح ہو کہ ان کاموں میں دس بجے دن تک کا وقت گزر گیا۔ اب وہ گھر کے لوگوں سے گپ کرے گا یا کمرے میں آکر تاش کھیلیگا۔ یا کھانا کھا کر نوکری پر جائے گا۔ اور کوئی تین گھنٹہ کام کرکے وہ پھر لیٹ جانیکی فکر میں مصروف ہو جائیگا اور لیجئے وہ دوپہر کو کہیں لیٹ ہی گیا۔ اور اگر دکان پر ہوگا تو چاہے گاہک بغیر خرید کئے واپس چلا جائے۔ مگر وہ لیٹ کر رہیگا۔ اس طرح وہ چار بجے دن تک زندہ رہے گا۔ اور اب وہ اس طرح گھر واپس آئے گا۔ گویا چین و جاپان کو وہ اکیلا ہی فتح کرکے ابھی ابھی واپس آیا ہے۔ اسوقت گھر میں اس پر کام کرنے کی گرانی اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ اپنے کپڑے تک خود نہ اتارے گا۔ اور جو افلاس کی وجہ سے ملازم نہوگا تو خود اتارے گا۔ مگر اس طرح کہ ایک کپڑا بھی اپنی مقررہ جگہ پر نہ رکھیگا۔ وہ اب کام کرکے آیا ہے اس لئے اس کی ہر بات میں غصہ ہوگا۔ اور گھر والے آپس میں اشاروں سے کہدیں گے کہ نوکری پر سے آرہے ہیں بات نکرو۔ اب وہ انگریزوں کی تقلید میں چائے نوش کریگا اور پھر وہ حقہ لیکر مکان کے باہر بیٹھ جائیگا۔ اور تمام دوستوں کو دن بھر دفتر کے واقعات سنائیگا۔ یا پھر وہ تفریح کو جائیگا۔ اب اگر باغ کی طرف نکل گیا یا ٹھنڈی سڑک پر تو گرانی کا یہ حال ہوگا کہ کوٹ یا شیروانی کے تمام بٹن کھول دیگا۔ اور ٹوپی ہاتھ میں یا بغل میں رکھیگا قدم اس طرح اٹھائیگا۔ گویا وہ اس سے پہلے کسی تانگے کا ٹٹو تھا۔ اور اب اسے تانگہ سے کھول کر ٹہلایا جا رہا ہے۔ واپسی بجائے ٹھیک مغرب کے ٹھیک عشا کے وقت ہوگی۔ اور جو راستہ میں کسی بے تکلف دوست نے کھانا بھی کھلا دیا تو اب وہ شب کے بارہ یتیرہ بجے ہی گھر واپس آئے گا۔

اس مربوط و مسلسل زندگی کے بعد اس کی متفرق قانونی زندگی یوں ہے کہ جس راستہ سے سپاہی جانے کو منع کریگا وہ اسی راستہ سے گذرنے کی کوشش کریگا۔ اگر سواری میں روشنی لیکر جانیکا حکم ہوگا تو وہ بغیر روشنی کے سواری کو سپاہی کے سامنے سے لیکر گذر جانے کو بڑی زبردست فتح سمجھیگا۔ اگر دعوت یا نوکری کا وقت دس بجے ہوگا تو وہ ہمیشہ گیارہ بجے پہونچیگا۔ البتہ ریلوے اسٹیشن پر ٹھیک وقت پر پہونچنے کی جگہ وہ ہمیشہ دو گھنٹے پہلے پہونچ جائیگا۔ اگر ریل کے کسی ڈبے میں صرف دس آدمیوں کی نشست کا قانون ہو تو یہ اس میں بیس اور پچیس ہو کر بیٹھے گا۔ اور مسجدوں میں سیدھی صف بنا کر نماز پڑھنے کا قانون ہے تو ہمیشہ ٹیڑھی صف بنا کر نماز پڑھے گا۔ اگر اسے ایڈیٹر ہو کر کسی اخبار یا رسالہ کو پابندی سے شائع کرنا ہے تو یہ ہمیشہ ڈبل نمبر شائع کرے گا۔ اور اعتذار میں صاف لکھدیگا کہ اب دیر نہوگی۔ مگر پھر ہو گئی۔ اگر وہ ریل کے ذریعہ کسی دوسرے شہر جائیگا تو ہمیشہ مقررہ دن سے ایک دن بعد پہونچیگا۔ جب اسٹیشن پر ایک بھی استقبالی نہ آئے۔ اگر وہ کرایہ کے مکان میں رہتا ہے تو کرایہ ہمیشہ دوسرے مہینہ ادا کرے گا۔ اور جو یہ ہندوستانی ہوا کہیں کا رئیس اعظم تب تو اس کی ساری زندگی میں قانون کا وجود ڈھونڈے نہ ملا ہے نہ ملیگا۔ کیونکہ وہ تو ہے رئیس۔ اور رئیس کے لئے ویسے بھی قانون۔ کاغذ کا ایک پرزہ ہے کہ کہا ہے جرمن کے وزیر اعظم نے۔ خدا کرے اب ان لوگوں کو سوراج اور ملجائے پھر دیکھنا قانونی پابندیاں۔ !!!

اقتباسات

عمل

بہتیروں کے لئے عمل محض ایک ذریعہ ہوتا ہے لیکن بعض کے لئے یہ ایک روحانی ضرورت ہے۔

عملی آدمی کو صرف ان چیزوں سے دلچسپی ہوتی ہے جن میں تبدیلی کا امکان ہو۔

ذوقِ عمل دو چیزوں سے پیدا ہوتا ہے۔ موجودہ حالات کو بدلنے کی ضرورت سے اور اس قوت کے احساس سے کہ ہم تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں۔

عملی آدمی کا لقب صرف اس شخص کے لئے رکھنا چاہئے جو عمل کی خاطر عمل کرتا ہو نہ کہ اس کے فوائد کے خیال سے کوئی اپنے عشق سے روپیہ کمانا چاہے تو اسے سچا عاشق کون کہتا ہے؟ -

خیالات و تصورات میں محویت کی طرح ذوقِ عمل بھی دل کے تھوڑے بہت معطل ہو جانیکی علامت ہے۔

بہت سے واقعات و حالات میں سے اس سادہ سے مسئلہ کو نکال کر الگ کر لینا جو ضروری ہے اسکا نام عمل ہے۔

علمی آدمی اپنے عہد سے محبت کرتا ہے۔ جو ایام گزشتہ کی اترن پہن کر آرام سے رہ سکے وہ دنیا میں بڑائی کے لئے پیدا نہیں ہوا ہے۔ کمزور لوگ اپنے زمانہ کو برا بھلا کہتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ یہ اپنی بے بسی کو مخالفت کی شکل دیدیتے ہیں۔

جس دل میں عمل کی خواہش اور ایک اچھی اندرونی زندگی کی آرزو دونوں جمع ہوجائیں تو اسے توڑ کر ہی چھوڑتی ہیں۔

ہمارے سینوں میں دینے کو بس ایک دل ہے عمل کو اس میں سے جو کچھ دیا جاتا ہے محبت سے وہ چھیننا پڑتا ہے۔

یہ سمجھنا بڑی غلطی ہے کہ عملی معاملات میں فیصلہ واقعات وحالات کی جانچ سے اسی طرح پیدا ہوتا ہے جیسے منطق میں صغرے وکبرے سے نتیجہ۔ فیصلہ اس قسم کی تمام پابندیوں سے بالاتر ہوتا ہے۔ یہ تو دراصل جبلت کی آواز ہوتی ہے۔ یہ اپنی بات کا ثبوت نہیں دے سکتی۔ جیسے کہ اصول موضوعہ کا ثبوت نہیں ہوتا۔

اگر تم کسی عملی آدمی کو خوش کرنا چاہتے ہو تو اس کے سامنے ان کاموں کا ذکر نہ کرو جو وہ کر چکا ہے بلکہ انکا جو وہ ابھی اور کر سکتا ہے۔

سچا سردار وہ ہے جو اپنے لئے بس وہی کام رکھے جو سوائے اس کے کوئی اور نہ کر سکے

علمی آدمی اپنے بڑے بڑے ارادوں کے متعلق مشکل ہی سے زبان کھولتا ہے۔

تمام بُرے کاموں میں سادہ دلی کا کچھ نہ کچھ دخل ضرور رہتا ہے۔

برنارڈ گراسے۔ ماخوذ از نیو اڈیلفی

انسان کیا ہے؟

دنیا کے تمام مشاہیر کو لو۔ ان میں سے انہیں الگ چن لو جنہوں نے انسانوں پر سب سے گہرا اور سب سے پائدار اثر ڈالا ہے۔ پھر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ یہ لوگ واقعی تھے کیا۔ اگر تم یہ معلوم کر لو تو تمہیں یہ بھی معلوم ہو جائیگا کہ انسان دراصل کیا ہے۔ دن بھر کسی کارخانے میں کام کرنے والا جو شام کو نکل کر اپنے حواس کو شراب کے نشہ سے معطل کرنا چاہتا ہے۔ اور ان میں سے جو کچھ باقی رہتے ہیں انہیں بس اس انتظار میں ختم کر دیتا ہے کہ ۴ بجے والی دوڑ میں کون گھوڑا جیتا۔ اسے تو انسان نہیں کہتے۔ انسان تو وہ آدمی ہے جو دوسرے آدمیوں کی مخفی روح پر اپنا اثر ڈالتا ہے۔ اور وہ بھی اس مہینہ میں نہیں اس سال میں نہیں بلکہ برابر سالہا سال تک صدیوں تک۔

جدید نفسیات انسانی کا علم ہمیں ان لوگوں سے حاصل کرنا چاہئے۔ ابتک مغرب میں جو دو نفسیاتی مذہب رائج رہے ہیں انکی مصالحت اور ہم آہنگی انہی ذاتوں میں دکھائی دیتی ہے ان کی زندگیاں ہمیں بتاتی ہیں کہ انسان بیشک ایک عاقل جانور ہے لیکن ساتھ ہی کچھ اس سے زاید بھی ہے۔ یعنی ایک روح رکھنے والی ہستی۔

(مڈلٹن مری)

شذرات

اصلاحات کے متعلق جو آئینی کمیشن پارلیمنٹ نے مقرر کیا ہے اس نے اپنے کام میں مدد دینے کے لئے ایک دوسرے مددگار کمیشن کا بھی انتظام کیا ہے جو برطانوی ہند کی تعلیمی ترقی کے متعلق رپورٹ پیش کریگا۔ اس مددگار کمیشن کے صدر سر فلپ ہارٹوگ مقرر ہوئے ہیں جو کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کے رکن تھے اور اس کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی میں وائس چانسلر کے عہدہ پر مامور رہے۔ دوسرے اراکین میں سر امہرسٹ سلبی بگ کوئی ۱۴ سال تک انگلستان کے تعلیمی بورڈ کے سکرٹری رہے ہیں مسلمانوں کی نمائندگی کے لئے پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر سلطان احمد صاحب اس کمیشن کے رکن ہیں۔ صاحب موصوف وہی شخص ہیں جنہوں نے حال میں اپنے ایک معرکۃ الآرا خطبہ میں اس خیال کا اظہار فرمایا تھا کہ ہماری اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ انگریزی زبان ہی ہونی چاہئے! سر جارج اینڈرسن پنجاب میں محکمہ تعلیم کے افسر اعلیٰ تھے اور علیگڈھ یونیورسٹی کے تحقیقاتی کمیشن میں نہایت نمایاں حصہ لے چکے ہیں۔ راجہ نرندرناتھ کو جو پنجاب کی مجلس قوانین کے رکن ہیں ہندوؤں کی نمائندگی کا فخر حاصل ہوا ہے اور عورتوں کی تعلیم کے مسئلہ کی اہمیت کا خیال کرتے ہوئے ایک عورت کو بھی رکن بنایا گیا ہے یعنی مسز متھولکشمی ریڈی جو مدراس کی مجلس قانون کی نائب صدر بھی ہیں۔ یہ کمیشن اس قوم کی طرف سے مقرر ہوا ہے جو کم و بیش ۱۵ سال سے اس ملک پر حکمراں ہے۔ اور اس ڈیڑھ صدی کی روشن خیال اور فرض شناس حکومت کے بعد اس ملک میں کوئی ۲۰ لاکھ انسان ذہنی تاریکی اور مادی افلاس کے ایسے جال میں گرفتار ہیں کہ رہائی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

یہ حکمران قوم اب کمیشن بھیجتی ہے کہ ہندوستان میں تعلیمی ترقی کے متعلق رپورٹ دو۔ اور یاد رہے کہ سنہ ۱۹۱۹ء کے قانون حکومت ہند میں آئندہ اصلاحات دینے یا دی ہوئی اصلاحات کو

U1197

چھین لینے کے لئے جہاں اور چیزوں کے متعلق رپورٹ ضروری سمجھی گئی ہے وہاں اس "تعلیمی ترقی" کا بھی ذکر ہے۔ اگر ایک کمیشن اور اس بات کی تحقیقات کے لئے بھیجا جاتا کہ عام مرفہ الحالی میں ہندوستان نے پچھلے دس سال میں جو ترقی کی ہو اس پر رپورٹ دو تو یہ دونوں کمیشن متفق اللفظ ہوتے کہ نہ تعلیم میں ترقی کی ہے نہ دولت میں۔ اس لئے دی ہوئی اصلاحات بھی چھین لو! فہو المقصود!!

ہندوستان اس سے پہلے بہت سی کمیشنوں کا تجربہ کر چکا ہے جن کی تہ میں اس قسم کی مخالفانہ شہادت فراہم کرنے کی غرض کا شبہ بھی نہ تھا۔

اور جب ان سے اس بدنصیب ملک کے لئے کوئی زیادہ مفید نتائج نہ نکل سکے تو ان سرکاری گواہوں سے زیادہ کیا امید ہو سکتی ہے۔

ہمارے ملک میں "کمیشن" "کمیٹی" "بورڈ" "سب کمیٹی" وغیرہ کے لفظ اسقدر استعمال ہوئے ہیں اور انکے ساتھ فقدان عمل کا کچھ ایسا رشتہ رہا ہے کہ جہاں کسی جماعت پر انمیں سے کسی لفظ کا اطلاق کیا گیا اور لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ یہ نام ہی نام ہے کام کچھ نہ ہوگا۔ اور سچ بھی ہے۔ چیزوں کی روح کو چھوڑ کر محض انکے ناموں کو دیکھنے والوں نے ان ناموں کو اسی طرح استعمال کیا ہے کہ یہ خیال چنداں غلط نہیں۔ ہمارے قومی کاموں میں بھی یہی حال ہے جہاں کوئی کام کرنا ہوا، چھوٹا ہو یا بڑا، بس کمیٹیاں اور سب کمیٹیاں بننا شروع ہوئیں۔ پھر کوشش یہ کہ ان میں ہر ممتاز آدمی کا (جنہیں اصطلاحاً "ہستی" کہا جانے لگا ہے) نام آجائے۔ چاہے اس غریب کو کام سے دلچسپی ہو یا نہ ہو، اس میں علمی مدد یا مشورہ کی بیچارہ کو فرصت ہو یا نہ ہو۔ اسی وجہ سے کمیٹیوں کے اراکین کے نام محض رسمی سی چیز سمجھے جانے لگے ہیں اور سب جانتے ہیں کہ اصلی کام کرنے والے چند اشخاص ہوتے ہیں اور باقی نام محض نمائش۔

اس صورت حال کو اب لوگ محسوس کرنے لگے ہیں اور جا بجا اس کی کوشش ہو رہی ہے کہ اس نمائش کو ختم کیا جائے اور کام اس جماعت کے سپرد کئے جائیں جو واقعی اسے کرتی اور کرنا چاہتی ہے۔

انصار جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے خود جامعہ ملیہ کے کام کو جماعت اساتذہ اور انصار کے ان افراد کے سپرد کر دینے کا فیصلہ کیا جو بالترتیب کم سے کم ۲۰ سال تک جامعہ میں خدمت کرنے اور کبھی ایک بہت محدود رقم سے زیادہ مشاہرہ نہ لینے کا عہد کریں یا جامعہ کے لئے کم سے ۶۰۰ روپیہ سالانہ خود دیں یا دوسروں سے دلوائیں جس درسگاہ کا انتظام ایسی جماعت کے سپرد ہو جس میں کوئی فرد ایسا نہیں جو اپنے وقت یا روپیہ سے اسکی مدد نہ کرتا ہو اس کے مستقبل کے متعلق کسی تشویش کی ضرورت نہیں۔ مسلمانوں کی دوسری درسگاہوں اور تعلیمی اداروں کے لئے اساتذہ اور انصار جامعہ کی یہ مثال قابل تقلید نمونہ ہے۔

فاتح و غالب قوم کے تمدن کو بھی بہتر سمجھنا مفتوح اقوام کی افسوسناک لیکن شاید قابل معافی غلطی ہے۔ آج ہندوستان میں بھی مغربی تمدن کے مختلف شعبوں کے متعلق جو عقیدت کا اظہار ”تعلیمیافتہ“ جماعت کیطرف سے ہوتا ہے وہ اس غلطی کا ایک مظہر ہے۔ اس کے اثر سے تمدن خارجی اگر متاثر ہو تو بھی حیات قومی کے لئے کم مضر نہیں لیکن اگر زندگی کے وہ سرچشمے جن سے روح قومی کو تازگی پہنچتی ہے اس پردیسی زہر سے آلودہ ہو جائیں تو پھر اس قوم کی حیات و بقا معرض خطر میں پڑ جاتی ہے یورپ کے زیر اثر ہمارے ملک میں اور دیگر ممالک ایشیا میں لامذہبی اور بے دینی کی جو لہر اٹھی ہے وہ زندگی کے انہی سرچشموں کو مسموم بنا رہی ہے۔

اس تقلید کا عجیب حال ہے کہ ہمیشہ اچھی چیزوں اور اچھوں کو نظرانداز کر دیتی ہے۔ اور بری چیزوں اور بروں کے ساتھ ہو لیتی ہے۔ ورنہ یورپ میں آج بھی اتنا مذہب موجود ہے، اتنے دیندار لوگ ہیں انکی اصطلاح میں اسقدر ”توہم“ موجود ہے کہ اتباع مغرب میں لامذہب و بے دین اور ”روشن خیال“ بن جانا چنداں ضروری نہیں۔ یہ لوگ شاید بیخبر ہیں کہ یورپ خود اپنی بے دینی سے تنگ ہے اور اس کے بہترین دماغ طوفان حیات میں کشتی عقل کے لئے عقیدہ، یقین، مذہب کا سہارا ڈھونڈہ رہے ہیں۔

حال ہی میں انگلستان کے مشہور صحیفہ نگار مسٹر ہ۔ ج۔ ویلز نے "کھلی سازش" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہی جس کے ابتدائی حصہ کا مطالعہ ان لوگوں کے لئے شاید مفید ہو جو سمجھتے ہیں کہ قومی ترقی کے لئے ضروری ہی کہ "کم سے کم ۲۰ سال کے لئے مذہب کو ہماری زندگیوں میں بالکل دخل نہ رہے"۔ ویلز نے اپنی اس کتاب میں قومی اور جماعتی زندگی کے لئے مذہب کی ضرورت کو واضح کیا ہی۔ اس کے نزدیک "کوئی قوم یا ملت ہمیں ایسی نہیں ملتی جس میں کبھی محض روشن خیالی خود غرضی نے صحیح اور قومی اجتماعی زندگی قائم رکھی ہو" فرد اور جماعت کی زندگی کو پائیدار بنانے کے لئے ویلز کے نزدیک ضروری ہی کہ اسے کسی اعلیٰ تصور کے ماتحت لایا جائے ورنہ وہ محض آنی ہوتی ہی اور فانی۔ مذہب ہی فرد اور جماعت کی زندگی کو کسی مقصد اعلیٰ، نظام الٰہی، کسی معیار خیر و شر یا معیار تقویٰ کے ماتحت لے آتا ہی"

یورپ کی سیاسی و اجتماعی زندگی کے انتشار کو دیکھکر ویلز نے مغرب کے "اچھے لوگوں" کو اس "کھلی سازش" کی دعوت دی ہی کہ مغربی زندگی کو مذہب کے زیر اثر لا کر اس میں ربط و معنی پیدا کئے جائیں۔

یہ سب کچھ صحیح ہی۔ لیکن ویلز پھر بیسویں صدی کا انگریز ہی اسکی مذہبیت کی غایت کتاب کے ابتدائی حصہ کے بعد ظاہر ہو جاتی ہے۔ وہ مذہب سے اس طرح کام لینا چاہتا ہی جیسے کوئی انگریز کارخانہ والا انجن سے اپنا کارخانہ چلائے۔ اس کے پیش نظر عرصہ سے یورپ کی مشترکہ بین الاقوامی حکومت کا خیال ہی اور اس کے حصول کے لئے وہ مذہب کو بطور قوت استعمال کرنا چاہتا ہی۔ وہ چاہتا ہے کہ مذہبی جذبہ جب انسان میں موجود ہی ہی تو اس سے کیوں نہ ترقی صحت، درازی عمر، ارتقاء ذہنی، مظاہر قدرت پر قابو حاصل کرنے کی کوشش میں مدد لی جائے۔

ویلز کی کتاب کا یہ پہلو ہمارے "تعلیم یافتہ" لوگوں کے لئے بہت دلچسپ ثابت ہوگا کیونکہ وہ اگر کبھی بھولے سے مذہب کے وجود کو تسلیم کر لیتے ہیں تو اسی لئے کہ اس سے انکے "توہم پرست"

ابنائے جنس مفید کاموں پر لگائے جا سکتے ہیں۔ خارجی اور مادی زندگی پر مذہب کا جو اثر ہوتا ہے وہی ان کے لئے لے دے کر مذہب کو "جاہلوں" کے لئے قائم رکھنے کی ایک وجہ ہے یہ "آنکھوں کی اس ٹھنڈک" کو جو نماز میں حاصل ہوتی ہے نہیں مانتے لیکن نماز کے ورزش ہونے اور ہاضمہ پر اسکے مفید اثرات اکثر ان کی گفتگو کا موضوع ہوتے ہیں۔

اس "تعلیم یافتہ" گروہ کے غلبہ نے ہمارے مبلغین ومفسرین کو بھی پریشان کر رکھا ہے اور وہ غریب بھی اپنی اپنی دینی کتابوں کی تعلیم اور اپنی عبادات میں "حفظان صحت"، "سائنس"، "ترقی" کے پہلو ڈھونڈھنے میں مصروف رہتے ہیں اور جہاں یورپ میں کوئی ہوا باز کسی طیارہ میں اڑا، یا کسی رسالہ میں ہوا بازی کے امکانات پر کوئی پر از معلومات مقالہ نظر سے گزرا اور یہ غریب لگے اپنے اڑن کھٹولے کا ذکر کرنے۔

وہ نہیں جانتے کہ یہ تلاش دراصل ان کے مذہب کی فتح نہیں شکست ہے۔ یہ دوسرے کے معیار کو صحیح تسلیم کرکے اس سے اپنے کو تولنا ہے اور اس کا اقرار کہ ہمارے پاس خود کوئی معیار نہیں۔

اس طرز عمل سے خود ہمارے مذہبی طبقوں تک میں عجیب قسم کی قابل افسوس سطحیت پیدا ہو چلی ہے۔ مذہب کی کسی تعلیم سے خارجی دنیا میں جو اثرات رونما ہوتے یا ہو سکتے ہیں وہی مرکز توجہ بن گئے ہیں اہل مذہب کی نظر بجائے اس کے کہ اندر کی طرف ہو اور قلب کی گہرائیوں پر نگاہ رکھے باہر کی طرف ہے اور شواہد خارجی کے نظارہ میں گم۔

اس میں شک نہیں کہ نیک خیال، نیک عقیدے، خارج میں بھی اپنی نیکی کا اثر ضرور پیدا کرتے ہیں۔ لیکن کوتاہ بیں ہیں وہ جو صرف خارجی اثر کے طالب ہیں اور خود نیکی کو کوئی حیثیت نہیں دینا چاہتے۔ خارجی دنیا میں نیک کام بدلوگ بھی کر سکتے ہیں۔ کتنے بے دین اور بے ایمان دن رات مالا جپتے اور اپنی نمازوں کو دوسروں کے دکھانے کے لئے طویل کرتے

ہیں۔ کتنے بے ضمیر ہیں جو کونسلوں کے انتخاب کے وقت ہر قومی کام میں مالی مدد دینے کو تیار ہو جاتے ہیں اور ہر نیک کام کو ان بدوں کی وجہ سے مدد مل جاتی ہے۔ لیکن کیا مذہب انہیں "خارجی" اچھے کاموں کو دیکھ سکتا ہے۔ نہیں۔ اس کی فرمانروائی اس سے بہتر اور اہم تر چیز پر ہے یعنی انسان کے دل پر اور جو شخص سچی مذہبیت اپنے میں یا دوسروں میں پیدا کرنا چاہتا ہے اسے جاننا چاہیئے کہ ظاہر میں نیک کام کرنا بھی اچھا ہے لیکن باطن میں نیک ہونا اس سے زیادہ ضروری ہے۔ مذہب کا کام دنیا کی اصلاح سے شروع نہیں کیا جا سکتا بلکہ اپنی اصلاح سے۔ اور اسی سے صحیح خارجی اصلاح کی بنیاد پڑتی ہے

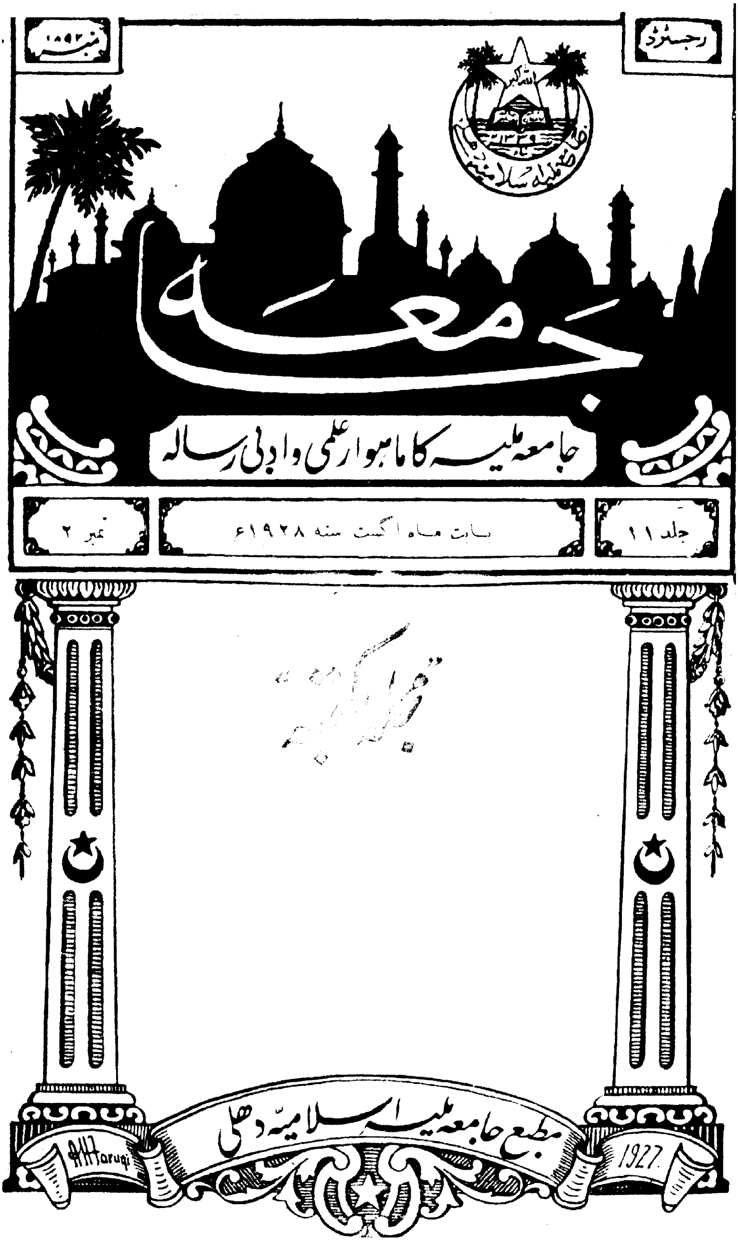

رجسٹرڈ

نمبر ۱۸۹۲

جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

جلد ۱۱

بابت ماہ اگست سنہ ۱۹۲۸ء

نمبر ۲

[illegible]

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

جامعہ ملیہ اسلامیہ
A.H. Faruqi
1927.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری   ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد ۱۱ | بابتہ ماہ اگست سنہ ۱۹۲۸ء | نمبر ۲

فہرست مضامین

۱- دیہات کی اصلاح اور ترقی   شفیق الرحمٰن صاحب   ۲
۲- تنہائی   محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن)   ۱۲
۳- سفر حج   مولانا اسلم جیراجپوری   ۲۳
۴- اور پھر کیا؟   ڈاکٹر ٹیگور   ۳۵
۵- برف سازی   ماسٹر محمد عمر صاحب   ۴۳
۶- غزل   حضرت ثاقب لکھنوی   ۴۷
۷- ماموں جان (ڈراما)   چیخوف (مترجمہ جلیل احمد صاحب قدوائی)   ۴۹
۸- تنقید و تبصرہ ۶۸
۹- اقتباسات ۷۳
۱۰- شذرات ۷۶

دیہات کی ترقی اور اصلاح

نظام سرمایہ داری کے ماتحت یورپ کی حیرت انگیز تجارتی اور صنعتی ترقی نے ہماری آنکھیں اسقدر خیرہ کر دی ہیں کہ جب کبھی اپنے وطن کی معاشی اصلاح اور ترقی کا خیال پیدا ہوا تو ترقی کا اصل راز اسی میں نظر آیا کہ ہمارے یہاں بھی بڑے بڑے کارخانے قائم ہوں، دیہات کی آبادی قصبات میں منتقل ہو جائے اور قصبات شہر بن جائیں، چنانچہ وہ تمام معاشی اصول جو یورپ کے ایک چھوٹے سے جزیرہ کی آبادی کے لئے وہاں کے مخصوص جغرافی اور معاشی حالات کی بناء پر باعث ترقی اور مفید ثابت ہوئے تھے۔ اُن تمام اصولوں کو ہم نے بھی ہر زمانہ ہر ملک اور ہر آبادی کے لئے مسلم سمجھکر اپنا رہنما بنا لیا لیکن ہمارے ملک کے جغرافی او معاشی حالات مختلف تھے، ایک اجنبی قوم کی حکومت کا جوا ہماری گردن پر تھا۔ اس لئے جب مشرق و مغرب کے دو بالکل متضاد معاشی نظام ایک دوسرے سے متصادم ہوئے تو سیاسی غلامی اور محکومیت کی وجہ سے غلبہ اور تسلط بھی غالب قوم کی معاشی نظام کو حاصل ہوا۔ ریل اور دوسرے ذرائع آمدورفت کی ترقی اور رواج آزاد مقابلہ، نظام حکومت کی مرکزیت اور مغربی انفرادیت اور خیالات کے اثر نے ہندوستان کے جماعتی اور قائم بالذات نظام کو بالکل منقلب اور منتشر کر دیا۔ اس انتشار نے کسان اور صناع دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ دیہی صنعتوں کی تباہی، آبادی کی روز افزوں ترقی، اور اراضیات کی تقسیم در تقسیم نے صناع اور کسان دونوں کی معاشی حالت کو کمزور اور نازک کر دیا۔ جہل اور تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے اگر ایک طرف وہ اپنے کاروبار کو نہ سنبھال سکے تو دوسری طرف لوگوں کو لوٹنے کا موقع ملا۔ دنیا کے بازاروں میں ہندوستان کے غلہ اور تجارتی اجناس کی مانگ بڑھی لیکن اس لین دین میں فائدہ بقول مسٹر ڈارلنگ کے دلالوں، مہاجنوں اور وکیلوں کو ہوا۔

بیرونی مقابلہ میں ضمنی صنعتوں کی تباہی کیوجہ سے دیہاتی آبادی کا تمام تر انحصار زراعت پر ہو گیا لیکن مختلف کھادوں کی بے قید برآمد اور بعض دیگر اسباب سے جن کا ذکر بعد میں آئیگا، یہ واحد ذریعہ معاش یعنی زراعت بھی ایک بڑھتی ہوئی آبادی کی گزر اوقات کے لئے ناکافی ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ براعظم ہندوستان جہاں بنی نوع انسان کا ۱/۵ حصہ آباد ہے آج غربت اور افلاس اور اسکے لوازمات یعنی تمام امراض و عوارض کا مسکن بنا ہوا ہے۔

افسوس و عبرت کا مقام ہے کہ ہندوستان کی معاشی اور تمدنی ترقی کا جب کوئی لائحہ عمل تیار ہوا تو اُس وقت صرف دس فیصدی آبادی کا مفاد پیش نظر رہا جو شہروں میں آباد ہے اور باقی نوے فیصدی دیہاتی آبادی کا کسی کو خیال تک نہیں آیا۔ اسکول کھلے تو شہروں میں، اسپتال قائم ہوئے تو شہروں میں، حفظان صحت کا انتظام ہوا تو وہ بھی شہروں میں اور ہندوستان کے سات لاکھ سے زائد دیہات کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ دئے گئے۔ نہ قوم کا تعلیم یافتہ طبقہ ان کی طرف متوجہ ہوا نہ حکومت کو اُن سے کوئی مطلب رہا سوائے اس کے کہ انکی محنت کی گاڑھی کمائی اُن سے چھین کر حکومت کے استحکام پر صرف کی گئی۔ بیشتر آبادی فاقہ کشی اور امراض و عوارض کی وجہ سے اپنی معاشی کارکردگی بالکل ضائع کر چکی ہے اور ہر سال بلا مبالغہ لاکھوں جانیں ملیریا بخار، چیچک، ہیضہ اور طاعون کے نذر ہو جاتی ہیں۔

ہندوستان کی آزادی کا خیال بیکار ہے اگر سو میں سے نوے آدمیوں کو چھوڑ کر صرف دس آدمیوں کا مفاد پیش نظر ہو! اور قوم کی اصلاح و ترقی کا ہر وہ لائحہ عمل بیمعنی ہے جس میں ۹۰ فیصدی آبادی کی اصلاح و ترقی کا کوئی لحاظ نہ رکھا جائے۔ خدا بھلا کرے تحریک ترک موالات کا کہ اسکا محسوس اثر آج زندگی کے ہر شعبہ میں نظر آتا ہے اور چرخہ پر اصرار اور حد سے زائد اصرار نے نہ صرف قوم کے بلکہ حکومت کے نقطہ نظر میں بھی ایک اہم تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ زراعت کی ترقی اور بہتری کے لئے شاہی کمیشن کا تقرر، صوبہ بنگال اور بمبئی اور پنجاب میں دیہات کی اصلاح اور ترقی کے محکموں کا قیام یہ سب اس

تبدیلی کا ثبوت ہیں جو چرخہ کی تحریک کی وجہ سے گزشتہ چھ سات برس کے اندر پیدا ہو گئی ہے۔

دیہات کی اصلاح و ترقی کے متعلق تمام مسائل پر اس مختصر مضمون میں بحث کرنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ چند ضروری باتیں بیان کیجائیں گی تاکہ جو لوگ اس مسئلہ سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ اس پر خود غور و فکر کریں۔ اور دوسروں کو متوجہ کریں۔

دیہات کی اصلاح و ترقی کی اسکیم میں سب سے زیادہ اہم چیز دیہاتی آبادی کی تعلیم کا انتظام ہے۔ بغیر تعلیم کو عام کئے کسی قسم کی اصلاح ناممکن ہے۔ قرض کی عادت بے موقع اصراف، جدید اکتشافات سے استفادہ کرنے کی نااہلیت، مقدمہ بازی، حفظان صحت کی طرف سے بے توجہی اور بے پروائی یہ سب خرابیاں محض تعلیم نہ ہونے اور جہالت کی وجہ سے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ بغیر تعلیم کے وہ عام بیداری بھی نہیں پیدا ہو سکتی ہے جو ہر اصلاح و ترقی کی کوشش کو کامیاب کرنے کے لئے ناگزیر ہے لیکن موجودہ طریق تعلیم اور نصاب تعلیم میں اس قدر خامیاں ہیں کہ اس کے رواج سے بجائے فائدے کے نقصان کا اندیشہ ہے اس لئے ضروری ہے کہ تعلیم کو عام کرنے سے قبل نصاب اور طریق تعلیم میں ایسی اصلاح کر دیجائے کہ دیہاتی مدارس کے طلبہ میں خصوصیت کے ساتھ زراعت کا شوق پیدا ہو اور دیہاتی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے ان کو دلچسپی ہو جائے اور ہر مدرسے میں مقامی حالات کا لحاظ رکھکر کم از کم ایک یا دو صنعتوں کو سکھلانے کا انتظام بھی کیا جائے تاکہ چار پانچ مہینہ جو عموماً کسانوں کے بیکار ضائع جاتے ہیں۔ ان میں بھی پیدائش دولت کا کام جاری رہے اور کاشتکار کے قلیل منافع میں ضمنی صنعت سے کچھ اضافہ ہو جائے۔

سن رسیدہ لوگوں کی تعلیم کی طرف سے بھی غفلت نہ کرنا چاہئے اور انکی تعلیم کے لئے بھی شبینہ مدارس کا انتظام کیا جائے۔ کتب خانہ اور دار المطالعہ قائم کئے جائیں۔ آلات کشاورزی مویشی

کھاد، بیج وغیرہ کی نمائش وقتاً فوقتاً کسی مرکزی مقام پر کیجائیں۔ سینما اور جادو کی لالٹین کے ذریعہ دیہاتی آبادی کی تعلیم کا طریقہ روس اور دوسرے ملکوں میں بہت موثر اور کامیاب ثابت ہوا ہے اور ہندوستان کے مخصوص حالات کا لحاظ رکھکر اسکا زیادہ سے زیادہ رواج بہت مفید اور نتیجہ خیز ہوگا۔ تعلیم کے بعد دوسری چیز جو دیہات کی اصلاح و ترقی کی اسکیم میں بہت زیادہ قابل توجہ ہے وہ حفظان صحت کا مسئلہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شہروں کے مقابلہ میں دیہاتوں کی آب و ہوا زیادہ خراب نہیں ہے لیکن پھر بھی برا بھلا کوئی انتظام بھی دیہاتوں کی طبی امداد کا ابتک نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ جہاں ڈاکخانے ہیں وہاں منشی کے ذریعہ سے ملیریا کے زمانہ میں کنین تقسیم کرنیکا انتظام کیا گیا ہے اور وہ بھی بہت ناقص۔ ہر سال لاکھوں جانیں بخار، طاعون، ہیضہ، چیچک، دق اور سیکڑوں دوسری بیماریوں اور وباؤں کے نذر ہو جاتی ہیں۔ ۱۹۲۳-۲۴ء کے اعداد و شمار پر اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ مختلف امراض میں حسب ذیل اموات اس سال صرف برطانوی ہند میں ہوئی ہیں۔

(۱) ہیضہ	۲ لاکھ ۹۳ ہزار ۷ سو ۷
(۲) چیچک	۵۵ ہزار ۳ سو ۸۰
(۳) طاعون	۳ لاکھ ۶۱ ہزار ۸ سو ۴۳
(۴) بخار	۴۰ لاکھ ۷ ہزار ۶ سو ۶۲
(۵) اور دوسری بیماریاں	۲۱ لاکھ ۶۰ ہزار ۶ سو ۹۴
کل	۶۸ لاکھ ۷۹ ہزار ۲ سو ۸۶

ان اعداد و شمار سے ہندوستان کی صحت عامہ کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اتنی قیمتی جانیں تو ہر سال بالکل ضائع ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ بلا مبالغہ کروروں ایسے ہیں جو مختلف امراض کا شکار ہو کر بالکل ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ معاشی کارکردگی بالکل ختم ہو جاتی ہے اور غربت افلاس کا پنجہ اور زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ اس حالت کا سدباب کرنے کے لئے بہت ہی

وسیع پیمانے پر اول تو صحت عامہ کے عام اصول کی نشر و اشاعت کی ضرورت ہے اور دوسرے طبی امداد پہنچانے کے لئے انتظام کی ضرورت ہے۔ شہروں میں طبیبوں اور ڈاکٹروں کی جتنی کثرت ہے اسی قدر دیہاتوں میں قلت، حکومت بمبئی نے اپنے احاطہ کے مدارس کے مدرسین کے لئے کچھ طبی تعلیم کا عملی کورس مقرر کیا ہے جس کو سیکھنے کے لئے تمام مدرسین کو ایک مدت کے لئے ضلع کے سول ہسپتال میں قیام کرنا پڑتا ہے اور مدت معینہ ختم کرنے کے بعد جب وہ دیہاتوں کو واپس جاتے ہیں تو اپنے ہمراہ ادویہ کا ایک صندوقچہ لیجاتے ہیں اور معمولی امراض میں دیہاتیوں کی طبی امداد کرتے ہیں۔ سرجن جنرل بمبئی کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسکیم بہت کامیاب ہو رہی ہے۔ اس لئے اگر دوسرے صوبوں میں بھی اسی طریقہ پر کام کیا جائے تو بہت کچھ مداوا ہو سکتا ہے

حفظان صحت کی تعلیم کے لئے مختلف جماعتیں قائم کی جائیں جو ملیریا کے خلاف کام کریں اور خصوصاً بچوں کو صاف ستھرا رہنے کی تعلیم دیں اور ترغیب کیلئے تندرست بچوں کو انعامات دئے جائیں۔ زچہ خانے قائم کئے جائیں وغیرہ وغیرہ حفظان صحت کے معاملہ میں حکومت کی توجہ سے زیادہ قوم کے تعلیم یافتہ طبقہ میں ایک قومی احساس پیدا ہونیکی ضرورت ہے اور اس طبقہ کی ذرا سی توجہ سے بہت کام اس سلسلہ میں انجام پا سکتا ہے۔ حفظان صحت ہی کے سلسلہ میں تیسری چیز جو قابل غور ہے وہ سکونتی مکانات کا مسئلہ ہے۔ عموماً دیکھا جاتا ہے کہ دیہاتی مکانات میں صرف ایک کوٹھری ہوتی ہے جس میں سوائے دروازے کے روشنی اور ہوا کے لئے اور کوئی دوسرا روزن یا راستہ نہیں ہوتا ہے۔ اس تنگ و تاریک کوٹھری میں یا تو گھر کا اساسہ محفوظ رکھا جاتا ہے یا جاڑوں میں اس کے اندر سارا خاندان گھس کر سو رہتا ہے۔ اس کوٹھری کے علاوہ ایک چھپر ہوتا ہے جس میں ایک طرف مویشی باندھے جاتی ہیں اور اسی کے بغل میں آدمی سوتے ہیں۔ اس میں بہت زیادہ اصلاح کی ضرورت ہے اور اگر زیادہ ممکن نہیں تو کم از کم مویشیوں کو گھر سے باہر تھوڑے فاصلہ پر ایک چھپر کے

نیچے باندھنے کا انتظام بآسانی کیا جا سکتا ہے۔

کچھ عرصہ ہوا مسٹر ای ایم گلبرٹ لاج نے ٹائمس آف انڈیا میں بطور نمونے ایک گاؤں کا نقشہ تیار کیا تھا، اور اس کے متعلق ایک بہت عمدہ اسکیم شائع کی تھی۔ صاحب موصوف کا اندازہ تھا کہ ۱۲ مربع فٹ کا ایک عمدہ مکان اصول حفظان صحت کے مطابق ۸۵۰ سے ۹۰۰ روپیہ تک تیار ہو سکتا ہے۔ حکومت اور قوم کو اگر دیہاتوں کی زبوں حالت کا صحیح اندازہ اور احساس ہو تو دیہاتوں کی سرنو تعمیر کا کام کوئی دشوار یا ناقابل عمل کام نہیں۔ جو روپیہ تعمیر پر صرف ہو وہ قرض شمار کیا جائے اور لگان میں معمولی اضافہ کرکے بیس بائیس سال کے اندر وصول کر لیا جائے۔ حکومت اور انجمن ہائے امداد باہمی کے تعاون عمل سے یہ کام بہت آسان ہو جائیگا۔ اور یہ مطالبہ کچھ بہت زیادہ نہیں ہے جبکہ اس کی مثالیں دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں ملتی ہیں۔

چوتھی چیز وسائل آمد و رفت اور تار و ڈاک کا انتظام ہے، لارڈ ڈلہوزی کے زمانہ سے لیکر اس وقت تک اس سلسلہ میں جو ترقی ہوئی ہے وہ یا تو شہروں اور قصبات کی ضروریات کو مد نظر رکھ کر، فوجی ضروریات کا لحاظ رکھ کر، اور اکثر دیہات ایسے ہیں کہ سڑک اور ریل نہ ہونے کی وجہ سے دنیا سے بالکل علحدہ ہیں، اس لئے اس طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ نیز ڈاکخانوں کی کمی بھی بہت محسوس کیجاتی ہے۔ اس وقت کل ۱۲ ہزار ڈاکخانے ہیں اسکا مطلب یہ ہے کہ کثیر التعداد گاؤں ڈاکخانوں کی سہولتوں سے ابتک محروم ہیں۔ مسٹر سمس ڈپٹی پوسٹ ماسٹر جنرل کا خیال ہے کہ ڈاکخانہ اور لکھنے پڑھنے میں بہت گہرا تعلق ہے۔ ڈاکخانہ کے قیام سے لوگوں میں تعلیم کا شوق خود بخود پیدا ہوتا ہے۔ ڈاکخانہ کے ساتھ سیونگ بنک بھی قائم کئے جا سکتے ہیں۔

پانچویں چیز زراعت کی ترقی ہے۔ معاشی اور قومی نقطۂ نظر سے یہ سب سے زیادہ اہم ہے اس لئے کہ ہر چار آدمیوں میں سے تین کی زندگی کا دارومدار ہی زراعت پر ہے

باوجود اس کے تمام دوسری صنعتوں کے مقابلہ میں زراعت سب سے پست حالت میں ہے حالانکہ ہندوستان میں سب سے زیادہ ترقی اور فروغ اسی صنعت کو ہونا چاہیئے تھا۔ دوسرے ممالک کی زرعی پیداوار سے اگر مقابلہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان کے مقابلہ میں ان کی فی ایکڑ پیداوار بہت زیادہ ہے۔ اس پستی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہندوستان کی زمین میں کوئی خاص خرابی ہے بلکہ بہت سے خارجی اسباب زراعت کی ترقی میں مانع ہیں۔ مثلاً اراضیات کی تقسیم در تقسیم جس کی وجہ سے ایک کھیت کا رقبہ اسقدر چھوٹا ہو جاتا ہے کہ اس میں منافع کے ساتھ کبھی کاشت نہیں ہو سکتی اور جن لوگوں نے ہندوستان کی معیشت زرعی کا مطالعہ کیا ہے مثلاً مان کنٹنگ، کیلورٹ، ڈارلنگ، گلبرٹ سلیٹر ان سب کی رائے ہے کہ اس تقسیم در تقسیم کو بذریعہ قانون روکنا چاہیئے چنانچہ بمبئی میں سر چنی لال مہتا نے حال ہی میں ایک مسودہ قانون اس کے متعلق پیش کیا ہے اور دوسرے صوبوں میں وہاں کے مخصوص حالات کا لحاظ رکھ کر اس قسم کے قانون کی ضرورت ہے۔

اس کے علاوہ آلات کشاورزی جو استعمال کئے جاتے ہیں وہ کاشت عمیق کے لئے بالکل ناموزوں ہیں اور انکی بجائے جدید آلات رائج کرنیکی ضرورت ہے جو تجربہ کے بعد ہندوستان میں کاشتکاری کے لئے مفید ثابت ہوئے ہیں۔ پھر عمدہ کھاد اور اس کی فراہمی کا انتظام بونے کے لئے عمدہ بیج کی فراہمی کا انتظام اور سہولتیں۔ آبپاشی کے لئے کنوؤں اور نہروں کی تعمیر۔ تالابوں کی مرمت تاکہ زراعت کا تمامتر دارومدار بارش پر نہ رہے۔ اس کے بعد جنس کے فروخت کرنے کے لئے امداد باہمی کے اصول پر انتظام کیا جائے تاکہ جو منافع محض کسانوں کی جہالت کی وجہ سے دلالوں کی جیبوں میں جاتا ہے وہ کسانوں کو ملا کرے۔ نیز عمدہ نسل کے مویشیوں کی پرداخت اور جانوروں کے اسپتال قائم کرنے کی ضرورت ہے قرض کا مسئلہ بھی بہت اہم ہے۔ یوں تو دنیا کے ہر ملک میں کسان عموماً مقروض رہتے ہیں لیکن ہندوستان کے کسان خاص طور پر اس بارہ میں مشہور ہیں اور مسٹر ڈارلنگ کا تخمینہ ہے کہ صرف برطانوی

ہند میں کسانوں کا قرض چھ سو کرور روپیہ سے کچھ زائد ہوگا۔ جس کا نتیجہ یہ ہی کہ کسان کبھی اپنی محنت کی پیداوار سے کما حقہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا ہے۔ ہر فصل میں جو حاصل ہوتا ہے وہ مہاجن کے ہاتھ میں جاتا ہی اور مہاجن سی قرض لیکر پھر کام چلایا جاتا ہے۔ کسانوں کی موجودہ تباہی میں اس قرض کا بہت بڑا حصہ ہی۔ تحریک انجمن امداد باہمی کی تبلیغ اور اس کے رواج پر اس مسئلہ کا حل بہت بڑی حد تک موقوف ہی۔

اسی طرح اور بہت سی چیزیں زراعت کے متعلق قابل اصلاح ہیں اور چونکہ دیہات کی خاص صنعت زراعت ہی اس لئے دیہات کی اصلاح و ترقی میں زراعت کا درجہ بہت اہم ہے ہندوستان کی معیشت زرعی اور زراعت کی کمزوریوں پر بہت سے مضامین رسالہ جامعہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ اور حال میں شاہی کمیشن نے اپنی رپورٹ شائع کی ہے جس میں تفصیل کے ساتھ زراعت کے متعلق تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ افسوس ہے کہ گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے اس مضمون میں ان تمام باتوں پر بالتفصیل نہیں لکھا جا سکتا ہے۔ جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

چھٹی اور آخری چیز گھریلو صنعت کو رواج دینا ہے۔ سال بھر میں عموماً ڈیڑھ سو سے دو سو دن تک کسانوں کو مجبوراً بیکار رہنا پڑتا ہے۔ جب فصلوں کے کٹ جانیکی وجہ سے کوئی دوسرا کام کسانوں کو نہیں ملتا۔ اس زمانہ میں عموماً کسان یا تو مزدوری کرتے ہیں یا کرایہ کی گاڑیاں چلاتے ہیں، یا اگر کوئی کارخانہ قریب ہے تو اس میں عارضی طور پر ملازمت کر لیتے ہیں لیکن اول تو سب کے سب کسان ایسا کر نہیں سکتے اور پھر یہ طریقہ موزوں بھی نہیں ہے اسلئے ضرورت ہے کہ انکے ہاتھ میں کوئی ایسی صنعت ہو جو کسان کی آمدنی میں قدرے اضافہ کر سکے۔ جاپان میں دیاسلائیاں بنانا اور ریشم کے کیڑے پالکر ریشم تیار کرنیکی گھریلو صنعت موجود ہی اسی طرح فرانس جرمنی اور اٹلی میں بھی ان کی مخصوص صنعتیں ہیں۔ ہندوستان کے لئے بھی علاوہ سوت کاتنے اور کپڑا بننے کے بہت سی اور صنعتیں ہیں جن کو رواج دیا جا سکتا ہی

مثلاً مویشی پالکر گھی دودھ، دہی تیار کرنا۔ مرغیاں پالنا۔ پھلوں کی کاشت کرنا۔ ریشم تیار کرنا۔ چٹائی بنانا۔ مٹی اور بانس کی چیزیں بنانا۔ موم کے کھلونے اور کاغذ کی دوسری چیزیں تیار کرنا۔ وغیرہ وغیرہ لیکن ان تمام صنعتوں میں یا تو کچھ سرمایہ کی ضرورت ہوگی یا کسی صنعت کو باقاعدہ سیکھنے اور مہارت پیدا کرنیکی ضرورت ہوگی۔ البتہ سوت اور ریشم کاتنے کی صنعت ایسی ہے کہ اس میں نہ سرمایہ کی ضرورت ہے اور نہ بہت زیادہ دن مہارت پیدا کرنے اور سیکھنے میں صرف ہوتے ہیں۔ اور چونکہ انسان کی ابتدائی ضرورت یعنی 'کھانے اور پہننے' میں سے ایک ضرورت اس سے پوری ہوتی ہے اس لئے جس قدر وسیع پیمانے پر اس صنعت کو ترقی دیجائے اس میں کبھی نقصان کا اندیشہ نہیں ہے۔ پچاس سال ہندوستان قبل کے امیر و غریب ہر گھر میں یہ صنعت موجود تھی۔ اس لئے بمقابلہ دوسری صنعتوں کے اس صنعت کو رواج دینے میں زیادہ آسانی بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی قوم پرور جماعت نے کسانوں کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر چرخہ کو اپنے سیاسی پروگرام میں اس درجہ اہمیت دی ہے کہ چرخہ ہندوستان کی معاشی آزادی کا نشان تسلیم کر لیا گیا ہے۔

لیکن دیہات کی ترقی اور اصلاح کے لئے تعلیم کی ترقی، حفظان صحت، مکانات کی تعمیر، ذرائع آمد و رفت۔ زراعت اور گھریلو صنعت یہ سب ناکافی ہیں اگر دیہاتوں کو تاڑی اور شراب نوشی سے محفوظ نہ رکھا گیا، اور مقدمہ بازی کی خراب عادت جو پڑ گئی اسکا کوئی علاج نہ کیا گیا، نشیات کے اجتناب کی ترغیب دینے کے لئے اول تو مذہبی جماعتوں کی طرف سے تبلیغ کی ضرورت ہے اور پھر تفریح گاہیں جہاں ورزش کا انتظام ہو اور دارالمطالعہ وغیرہ قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ اور مقدمہ بازی کا سد باب اسی طرح ہو سکتا ہے کہ قدیم پنچایتی نظام کو دوبارہ قائم کیا جائے۔

* * *

جن طریقوں پر دیہات کی ترقی اور اصلاح کا کام انجام دیا جاسکتا ہے اس کا ایک خاکہ

سطور بالا میں پیش کیا گیا ہے۔ قوم کی آئندہ ترقی کا انحصار دیہات کی اصلاح و ترقی پر ہے لیکن یہ کام عملاً اسی وقت انجام پا سکتا ہے جب حکومت قوم کی ہو اور قوم حکومت کی۔ جن ممالک نے ترقی کی ہے، انکی ترقی کا راز اسی یکجہتی میں پوشیدہ ہے لیکن ہماری قسمت سے ہندوستان کی حالت بالکل مختلف ہے۔ یہاں ہم پر ایک اجنبی قوم حکمراں ہے۔ اس لئے ہمارے قومی مفاد اور حکومت کے مفاد میں ظاہر ہے کہ کبھی ہم آہنگی نہیں ہو سکتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب حکومت اور قوم کے درمیان کشمکش شروع ہوئی ہے ظالم و مظلوم کا معاملہ ہے۔ ممکن ہے کہ خدا مظلوموں کی مدد کرے۔ اور حکومت قوم کے ہاتھ میں آجائے، دیہاتوں کی حقیقی اصلاح اور ترقی تو اسی وقت ہوگی۔ لیکن اب بھی زرعی انجمن، پنچایتیں اور انجمن ہائے اتحاد باہمی کے ذریعہ درد کا بہت کچھ مداوا کیا جا سکتا ہے۔

تنہائی

تنہائی کا ذکر کرنا تنہائی کی شکایت کرنا ہے، اور اتفاق سے ہمارے شاعروں نے اسی مضمون پر اس کثرت سے طبع آزمائی کی ہے کہ اسکا ذکر کرنا مفت کا الزام اپنے سر لینا ہے۔ معمولی نثر لکھنے اور بولنے والوں کو اس غیر معمولی کیفیت سے کوئی سابقہ نہیں پڑتا؛ جو چند گھنٹے دنیاوی ضروریات کی وجہ سے تنہائی میں گزرتے ہیں آنکا زیادہ احساس نہیں ہوتا۔ گھر والوں یا دوستوں اور عزیزوں سے جدا ہونا تحریری شکایت کے لئے کافی وجہ نہیں؛ لہذا جو کوئی تنہائی کا ذکر چھیڑے اُس پر فوراً عاشق یا شاعر ہونے کا شبہ کیا جاتا ہے۔ میں نہایت یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے ان دونوں طائفوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ میرا مقصد اس مضمون میں شب فراق کی تاریکی یا جدائی کی تکلیفیں بیان کرنا نہیں ہے۔ اور نہ میں اُس شاعری پر نکتہ چینی کرنا چاہتا ہوں جس کا یہ کل سرمایہ ہیں۔ میرے خیال میں اس وقت کچھ ادبی کارنامے ہیں۔ چند نظمیں اور تصویریں، چند شاعرانہ نظرے، جن میں تنہائی کی کیفیت مختلف طور سے بیان کی گئی ہے، اور مجھے صرف ان سے مطلب ہے۔

روزمرہ کی زندگی میں ہمیں اسکا بالکل احساس نہیں ہوتا کہ ہماری ہستی دوسری ہستیوں سے کس قدر وابستہ ہے اور ہم صحبت کے کتنے محتاج ہیں۔ لیکن جب ہم اس تنگ دائرے سے باہر نکلنے کی آرزو کرتے ہیں تو فوراً تنہائی کی ڈراونی شکل دکھائی دیتی ہے اور سوائے چند بلند ہمت لوگوں کے سب ڈر کر پھر اسی روزمرہ معمولی زندگی میں پناہ لیتے ہیں۔ مگر یہ شاعروں کی تنہائی نہیں، جو مجلسوں پر اثر ڈالنے یا شعر میں رس پیدا کرنے کے لئے استعمال کیجاتی ہے۔ یہ وہ تنہائی ہے جس کا ہر وہ شخص شکار بنتا ہے جو اپنی سوسائٹی اور مروجہ اخلاقی تعلیم سے اختلاف کرنیکی جرأت کرتا ہے۔ یہ ماحول سے جدا اور بیگانہ کر دیتی ہے

پچھلی زندگی، پرانے ارادے چھوڑا دیتی ہے۔ امیدوں سے ہاتھ دھلاتی ہے۔ دوستوں عزیزوں کو بھلا دیتی ہے، دلوں سے نقشِ محبت مٹا دیتی ہے۔ یہ تنہائی انسان کو انسانی دنیا سے بیزار کر کے ایک بے پایاں ویرانے میں پہنچا دیتی ہے جہاں اسے اپنے سوا اور کوئی نہیں نظر آتا۔ آبادیاں، اجڑی بستیاں معلوم ہوتی ہیں۔ انسان کی تاریخ مٹ جاتی ہے اور وہاں یہ تنہائی اپنے قیدی کو مجبور کرتی ہے کہ اپنی آرزوں سے ایک نئی دنیا تعمیر کرے، انسان کے لئے ایک نئی زندگی کا مژدہ لائے اور اگر پرانی دنیا اس کے نئے انداز کو پسند نہ کرے تو اپنی آرزوؤں پر اپنی جان نثار کر دے۔ یہ ہمت صرف پیغمبروں میں ہو سکتی ہے، یا ان میں جو کبھی کبھی کسی چیز میں اس درجہ تک پہنچ سکتے ہوں۔ ہمیں اتنا تو ضرور معلوم ہے کہ ہر پیغمبر نے تنہائی کے ویرانوں میں سیر کی ہے، وہاں اپنی ہمت مضبوط کی ہے اور جو خواب وہاں دیکھے انکی تعبیر اپنی ملتوں کو سنائی ہے۔

شاعروں کو بھی الہام ہوا کرتا ہے لیکن وہ اس نور کی صرف ایک جھلک دیکھتے ہیں جو پیغمبروں کے دل اور دماغ کو روشن رکھتا ہے۔ شاعروں میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ اس سے آگے بڑھ سکیں جس بلندی تک شاعر پہنچ سکتا ہے لیرمنتوف(۱) کی ایک نظم سے ظاہر ہوتا ہے، جس کا عنوان "پیغمبر" ہے۔

> "اس دم سے جب کہ منصفِ ازلی نے میرے ضمیر کو روشن کیا اور اپنا پیغام پہنچانے کا حکم دیا مجھے ہر شخص کی پیشانی پر اس کے گناہ اور اس کے برے ارادے لکھے ہوئے نظر آنے لگے (انسانیت پر سے یہ دھبہ مٹانے کے لئے) میں نے محبت اور حق پرستی کی پاک تعلیم دینا شروع کی، جس کے جواب میں میرے عزیزوں اور دوستوں نے سب سے پہلے مجھ پر پتھر مارے۔ میں نے اپنی قوم

---

(۱) روسی شاعر، ۱۸۴۱ - ۱۸۱۴ء

> کے ماتم میں سر پر خاک ڈالی اور ننگے ہاتھ ننگے بدن۔ شہر سے نکل بھاگا۔ اب میں ویرانوں میں بسر کرتا ہوں اور اس غربت میں میرا خدا کسی نہ کسی طرح مجھے روزی پہنچاتا رہتا ہے۔ میرے دل پر خدا کے احکام کا نقش ہے، چڑیاں اور جانور سب میری تابعداری کرتے ہیں، اور راتوں کو ستارے میری آواز بن کر جگمگاتے ہیں۔ لیکن جب کبھی شہر میں سے سر جھکائے قدم بڑھائے گذرتا ہوں تو بوڑھے تمام بچوں کو اپنے گرد جمع کرتے ہیں اور خود ستائی سے مسکراتے ہوئے کہتے ہیں "دیکھو بچو تمہارے لئے یہ ایک مثال ہے! یہ آدمی مغرور تھا۔ ہماری زندگی اسے نہیں بھائی ہمارے ساتھ اسے رہنا گوارا نہ ہوا۔ بیوقوف یہ ہمیں یقین دلانا چاہتا تھا کہ اس کی زبان سے خدا خود بول رہا ہے! دیکھو بچو اسے اچھی طرح دیکھو! دیکھو یہ کیسا غمگین دُبلا پتلا، مایوسی سے پیلا پڑ گیا ہے، دیکھو کیسا پھٹے حال کا فقیر ہو کر رہ گیا ہے کیسی حقارت سے سب اسے دیکھتے ہیں"

پیغمبر کے لفظ سے ممکن ہے یہاں کوئی غلط فہمی ہو جائے۔ لیکن اگر ہم سمجھ لیں کہ یہ ایک ایسے شخص کا قصہ ہے جو پیغمبروں میں سے نہیں تھا بلکہ ایک ہمت والا خدا پرست مرد جس نے جھوٹ اور مذہبی دھوکے بازی اور اپنی قوم کی بداخلاقی کا مقابلہ کرنا چاہا اور لڑائی میں شکست کھائی تو اُسکی سرگذشت ہم کو صحیح معلوم ہو گی اور اسکا بیان سچا۔ ماحول سے جدا ہونا صرف اُس شخص کے لئے مشکل نہیں جو اُس پر مجبور ہوتا ہے۔ ماحول کو اس سے زیادہ اپنی حفاظت کی فکر ہوتی ہے، اور اگر کسی کو اپنے سر پر دنیا کی سب سے بڑی مصیبتیں لانا منظور ہو تو اُس کے لئے یہ ظاہر کر دینا کافی ہے کہ اسے اپنے ماحول سے کوئی محبت نہیں، اُس کے دل میں اور ارمان ہیں، جن کی وجہ سے اُسے اپنا ماحول تنگ اور پست معلوم ہوتا ہے۔ ہر قوم یعنی ہر ماحول، اپنے پیغمبروں کو چاہے وہ چھوٹے ہوں چاہے بڑے، ہلاک کرنیکی پوری

کوشش کرتا ہے۔ پیغمبر تنہائی اور ویرانوں میں جا کر اپنی آزمائش کرتے ہیں۔ تنہائی اُن کی فطرت کا ایک جزو بن کر دنیا کی تمام غرضوں سے انہیں بے نیاز کر دیتی ہے، ویرانے انہیں آبادی کی اصلیت سے آگاہ کر دیتے ہیں اور اُنہیں ایک ایسی بلندی پر پہنچا دیتے ہیں جہاں سے وہ آنکھ اٹھا کر خدا کا جلوہ دیکھ سکتے ہیں۔ پیغمبر ویرانوں سے نکل کر آبادیاں فتح کرتے ہیں لیکن انکی تنہائی اور بے نیازی قائم رہتی ہے۔ شاعر یا تو لیرمنتوف کے "پیغمبر" کی طرح ویرانوں ہی میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ یا ناچار ویرانے اور تنہائی دونوں سے مایوس ہو کر اپنے ماحول کے آگے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔

شاعر اُسی وقت سچا شاعر ہو سکتا ہے جب وہ اپنے ماحول سے آزاد ہو کر تنہائی کے ویرانوں میں سیر کر چکا ہو اور ماحول کے مصنوعی اور بے جان عقیدوں سے گذر کر اپنے خدا تک پہنچنے کا ایک نیا راستہ دریافت کر چکا ہو لیکن یہ ہمیشہ لازم نہیں کہ وہ اپنے ماحول سے میدان جنگ میں مقابلہ کرے۔ پیغمبر نئے مذہب لاتے ہیں۔ اُنکے لئے لڑائی اور فتح شرط ہے۔ شاعر مذہب اس قدر نہیں تلاش کرتے جتنی مذہبی تسکین، اور اس کی جستجو میں ممکن ہے کہ ماحول اُنکا ساتھ دے، اور اُنکی ہمت افزائی کرے۔ شاعر کا اثر بھی اس کی شخصیت کی طرح محدود ہوتا ہے۔ اُسکا یہ ارادہ نہیں ہوتا کہ سوتوں کو جگائے، مردوں کو زندہ کرے، اور انہیں اپنا پیغام سنائے۔ وہ صرف چند لوگوں پر جو اس کے اہل ہیں یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ پرواز کرتے کرتے اُسکا تصور ایسی بلندی پر پہنچ گیا جہاں وہ بالکل تنہا تھا۔ کبھی وہ تنہائی سے ایسا پیغام لاتا ہے جس سے قوم کو تقویت ہوتی ہے۔ کبھی وہ موت کی خبر لاتا ہے۔ اگر اس کے ماحول سے اسے زیادہ مناسبت ہوتی ہے تو وہ اپنے تمدن اور تہذیب کی تنہائی میں ایک اعلی تفسیر کرتا ہے، اور یہ تفسیر اس کے تمدن اور تہذیب کی روح رواں بن جاتی ہے اگر ماحول سے اسے عداوت یا شکایت ہوئی تو وہ خودکشی کو عام مشرب بنا کر ماحول کی بنیاد کمزور کر دیتا ہے۔ اس بلندی پر اور اس تنہائی میں جو کچھ اسے نظر آتا ہے، جو اس کی

کیفیت ہوتی ہے اُسے لوگوں پر واضح کرنا اُس کے فن کا کمال ہے۔ اور اسی واسطے یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کے تمام ادبی کارنامے تنہائی کی دین ہیں۔ ہر قوم اور تہذیب کی عظمت کا اندازہ انہیں کارناموں سے کیا جاتا ہے اور انہیں سے ہر قوم اور اُس کی زندگی کے ہر دور کا رنگ اور اُس کی خصوصیت معلوم ہو سکتی ہے۔ مثلاً فن مصوری میں یورپ کے ادبی پوتر جنم کے دو کارنامے ہیں جن میں اُسی زمانہ کے یورپین تمدن اور تہذیب کی حقیقت ہم پر پوری طرح واضح ہو جاتی ہے، رافائل (Raphael) کی "مدونا سِستینہ"(1) اور لیونار دو داونچی (Leonardodarinci) کی "لاجیوکونڈا"۔ رافائل کے معصوم مصور نے تنہائی کے ویرانوں میں بہت سیر کی، رومن کلیسائی مذہب کے اعلیٰ ترین جذبات اُس کے ہمراہ تھے اور ایک لڑکی کی محبت نے اسے تنہائی کی سیر کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ اپنے ماحول سے الگ روزمرہ کے ناپاک پھندے سے رہا ہو کر اس نے جب حقیقت پر غور کیا تو اسے ہر طرف صرف امومت کا جلوہ نظر آیا۔ "مدونا سِستینہ" میں یہی امومت جلوہ افروز ہے۔ ایک ماں اپنے بچے کو لئے کھڑی ہے، کہاں کھڑی ہے مصور نہیں بتلاتا۔ لیکن وہ بادلوں کے اوپر ہے اور اُس کے پیچھے آسمان کچھ دھندلا سا نظر آتا ہے۔ ماں کے قدموں کے پاس ایک طرف کلیسا کا ایک سردار التجا کی انداز سے اُسے دیکھ رہا ہے اور انگلی سے غالباً دنیا کی طرف اشارہ کر رہا ہے دوسری طرف ایک عورت ہے، اس نظارہ میں اس قدر محو کہ اشارہ کی طاقت بھی نہیں۔ تصویر کے نیچے دو فرشتوں کے بچے اپنی بھولی بھولی آنکھوں سے ماں کو تک رہے ہیں اور اُنکے چہرے خوشی سے لال ہو گئے ہیں لیکن دیکھتے دیکھتے ہماری نظر ایک پردہ پر پڑتی ہے۔ اسوقت وہ کھنچا ہوا ہے مگر کسی وقت بھی وہ گر کر تصویر اور نظارہ کو ہم سے چھپا سکتا ہے۔ امومت کو رونق افروز دیکھنے کے لئے نظر چاہئے اور آرزو، ورنہ اُس پر ایسا پردہ پڑ سکتا ہے کہ ہمیں کبھی خیال بھی

نہ ہوگا کہ اُس کے پیچھے تصویر بھی ہے، اور اگر یہ پردہ گر گیا تو کلیسا میں مذہب نہ رہے گا۔ عورتوں کی عزت نہ رہے گی، اور ہم بچوں کے معصوم چہروں کے دیکھنے سے بھی محروم ہو جائیں گے۔

”مدونا سِستینہ“ رافائل کی جوانی کا کام ہے۔ لیونارڈو دا ونچی نے جب ”لاجیوکوندا“ بنائی تو وہ بڈھا تھا، دنیا میں جو کچھ اُسے کرنا تھا کر چکا تھا، اب وہ اپنے تمدن کے مستقبل پر غور کر رہا تھا۔ رومن کلیسا اور عیسائی مذہب سے اُسے نہ کوئی دلچسپی تھی نہ کوئی امیدیں، اس کے تصور نے ایک انسان ایجاد کیا تھا جس کی قسمت میں خدائی لکھی تھی، اور اپنی ہستی اور اپنے امکان کے علاوہ کسی کا ممنون ہونا نہیں چاہتا تھا، اسے یہ انسان صرف آئندہ نہیں بلکہ گذشتہ زمانہ میں بھی نظر آیا، اور اس نے اس انسان کی تاریخ ایک مسکراہٹ میں لکھ دی ہے۔ یہ مسکراہٹ تھکی ماندی، بھوکی، پیاسی، مایوس اور ایمان شکستہ ہے، اس میں ہزاروں بدمستیاں، ہزاروں وجد، صدیوں کی امنگیں ہیں،، اس نے گہرے سمندروں میں غوطہ لگایا ہے ،، ویرانوں میں ماری ماری پھری ہے، یہ تمام کیفیتیں اس پر اپنا نشان چھوڑ گئی ہیں، اور مسکرانے والی انہیں مٹانا نہیں چاہتی، کیونکہ وہ مٹ نہیں سکتے، جسے یقین نہ آئے وہ اُن پہاڑوں اور غاروں کو پھر سے غور کر کے دیکھے جن میں سے وہ نمودار ہوئی ہے۔ یہ غار اور کھنڈر اور تاریکیاں انسان کی قسمت میں ہیں، یہیں سے وہ نکلا ہے، یہیں اُس نے بستیاں بسائی ہیں اور بسا کر اجاڑ کر دی ہیں۔ یہیں سے اس نے حقیقت کی جستجو شروع کی، اور بھٹک کر یہیں واپس آیا اور غائب ہو گیا ہے۔ لاجیوکوندا اپنی مسکراہٹ کا راز کیوں چھپائے! بعض عورتیں آرائش اور ادا کے ذریعہ سے اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں، بعض کا بھروسہ اپنے حسن پر ہوتا ہے، لاجیوکوندا صرف مسکراتی ہے۔ ہم اُسے دیکھتے دیکھتے خود مسکرانے لگتے ہیں جیسے آپس میں دوست جو بن بولے بات کہتے ہیں۔ رفتہ رفتہ اُسی مسکراہٹ کا راز بھی ہمیں معلوم ہو جاتا ہے، اور لاجیوکوندا ایک عورت نہیں بلکہ ہماری دنیا بن جاتی ہے اور اس دنیا میں ہماری کہانی۔

مشرقی تصور عموماً مخصوص مسئلوں سے گھبراتا ہے، اور تنہائی میں وہ رازِ ہستی کے سوا بہت کم کسی اور سوال کو اپنی توجہ کے لائق سمجھتا ہے۔ یہ تو ضرور صحیح ہے کہ اگر ہمیں اپنی ہستی کا راز معلوم ہو جائے تو ہماری ساری مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔ ہم "مدونا سستینہ" کے جلوے کو پاک نظروں سے دیکھ سکیں گے۔ "لاجیوکوندا" کی مسکراہٹ ہم پہ جادو نہ کر سکے گی، لیکن اگر ہم اس جستجو میں ناکامیاب ہوئے تو بالکل خالی ہاتھ رہیں گے اور سوا اس بے فائدہ کوشش کی یادگار کے ہمیں تسکین دینے کے لئے اور کچھ نہ ہوگا اور جب کبھی ہمیں یہ تسکین ناکافی معلوم ہوگی تو ہم پھر اسی بڑے حوصلہ سے جستجو شروع کریں گے اور یونہی خالی ہاتھ واپس آئیں گے۔ مشرقی انسان اپنی کوششوں میں ناکامیاب نہیں ہوا ہے لیکن پھر بھی اس کی ذہنی اور روحانی جدوجہد کی تاریخ کا بہترین دیباچہ ایک قدیم چینی استاد کے قلم نے لکھا ہے۔ تصویر کا عنوان "گرمی کا موسم" ہے۔ گرمی کے موسم میں غالباً شام کے وقت ایک آدمی درخت کے نیچے بیٹھا ہے۔ کسی دلکش نظارہ نے اُسے اپنی طرف ایسا متوجہ کر لیا ہے کہ اس میں جنبش کی طاقت نہیں۔ وہ جس طرح سے بیٹھا ہے صدیوں تک بیٹھا رہ سکتا ہے۔ اگر گرمی کا موسم رہا اور شام میں یہی تاثیر رہی اور تقدیر نے اس کی فطرت یہی رکھی جس نظارہ میں وہ محو ہے مصور ہمیں نہیں بتلاتا۔ اس کے بتلانے کی ضرورت بھی نہیں۔ جو کوئی بھی گرمی کے موسم میں شام کے وقت بیٹھ کر اپنی ہستی پر غور کر چکا ہے اسے سمجھ جائیگا۔ ایسی حالت کو "ہستی پر غور کرنا" بھی نہیں کہنا چاہئے۔ یہ ایک کیفیت ہے، اور اس سے زیادہ تشریح کرنا غلط ہوگا۔ مگر یہ ایک دائمی کیفیت ہے جو اُس وقت تک قائم رہے گی جب انسان انسان ہے۔

غالب کے بھی تین شعر ہیں(۱) جن میں یہ کیفیت تو نہیں دکھائی گئی ہے مگر اسی کی آرزو۔

---

(۱) "رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو" وغیرہ

ظاہر ہوتی ہے، اور ایسی آرزو جو آسانی سے اس کیفیت کو پیدا کر سکتی ہے۔ چینی مصور نے اپنے انسان کو عالم بے پایاں میں بالکل تنہا رکھا ہے، وہ ایک چھوٹے، پتلے تنے والے درخت کے نیچے بیٹھا ہے، ایک درخت جس پر ہوا کو چھیڑنے کے لئے ایک پتی تک نہیں جس کی حالت زمانہ نے ایسی بگاڑی ہے کہ وہ بھی اب مجسمہ حیرت ہو کر رہ گیا ہے۔ غالب کو بھی تنہائی مقصود ہے، ایک گھر جو عمارت، مکانیت کا ویسا ہی نمونہ ہو جیسے چینی مصور کا درخت درختوں کا ہے۔ اس تنہائی میں ایسے مکان کے زیر سایہ رہ کر غالب کا ارادہ وہی ہے جو چینی مصور کے انسان کا ہے۔ اگر اس کیفیت میں محو ہو جانا "ارادہ" یا "مقصد" کہا جا سکتا ہے۔ غالب نے اپنے اشعار میں صرف ایک خاص ماحول کی آرزو کی ہے ایک ماحول جس میں قطرہ کی طرح دریا میں فنا ہو جانے کا لطف اٹھایا جا سکے اور ان اشعار کی خوبی یہی ہے کہ وہ شاعر کا مقصد بالکل واضح نہیں کر دیتے اور ہم سے تقاضا کرتے ہیں کہ اس ماحول کی آرزو کر کے وہی کیفیت پیدا کر لیں جسکا نام رکھنا اسکی عریانی اور رسوائی ہے۔

مشرقی تصور کا عام رجحان جنگ جوئی کی طرف نہیں چاہے وہ اپنے ماحول سے غیر مطمئن بھی ہو، ماحول سے ناسازگی اس کے لئے ایک دعوت سی ہوتی ہے کہ اپنے پرواز کو بلند کرے اور ماحول کیطرف کوئی توجہ نہ کرے۔ اور اگر کرے تو اسی ارادہ سے کہ دوسروں کو اپنا ہمخیال بنائے اور انہیں بھی ماحول سے بےتعلق کر دے لیکن بعض ہستیاں ایسی بھی ہیں جو اُسے غلط سمجھتی ہیں، بعض تصور جنکو بے تعلقی سے کوئی تسکین نہیں ہوتی ان کو اس کی شکایت ہوتی ہے کہ آبادیوں میں مردے بسے ہیں اور تنہائی بالکل ایک ویرانہ ہے وہ زندگی کا راز فاش کرنے پر آمادہ ہیں اور کوئی انکی بات سمجھنے کا اہل نہیں۔ اقبال کی شاعری اس تصور زندگی کا بہترین نمونہ ہے، اگرچہ اس کی ایک جھلک سی اور شاعروں کے کلام میں بھی نظر آتی ہے۔

اقبال نے اپنے تصور زندگی کو بہت مفصل بیان کیا ہے لیکن ہمیں یہاں اُن کی

رف ایک نظم "تنہائی" سے مطلب ہے۔ اس نظم میں تخیل کو بہت کم دخل ہے، لیکن یہ اقبال ے مجموعی فلسفہ کو نہایت پرلطف اور صحیح طور پر بیان کرتی ہے صرف اس وجہ سے کہ اسکا وضوع تنہائی ہے، اور وہ تنہائی جس میں انسان اپنے ماحول کا سہارا نہیں لے سکتا، ور اسکا ماحول اس کی نظر محدود نہیں کر سکتا۔

"تنہائی" کی تمہید انسان کا ماحول سے جدا ہونا، اور ایسی ہستی کی تلاش میں نکلنا ہ جس کی محبت اور اثر سے وہ پھر ماحول میں شامل ہو سکے۔ یہ تمہید نظم میں داخل نہیں، لیکن انسان فطرت کی طرف اسی وقت رخ کرتا ہے جب اسے اپنے ماحول سے شکایت ہو۔

"تنہائی" میں شاعر اپنی شکایت اور آرزو لیکر" دریوزہ دلہائے پریشاں کے ارادہ سے ادھر ادھر گھومتا پھرتا ہے، اور اسے ہر طرف مایوسی ہوتی ہے، فطرت میں ہر شے کا ایک مقصد، ایک مقررہ مسلک ہے، موجیں ساحل سے ٹکراتی رہتی ہیں، پہاڑ اپنی متانت اور شاہانہ وقار میں محو رہتے ہیں، چاند و ستاروں کی تقدیر میں سفر لکھا ہے۔ اس نظام یں انکار یا بغاوت یا خودرائی کی کوئی گنجائش نہیں، اور ظاہر ہے کہ اگر انسان اپنے ماحول اور مقررہ فرائض اور مسلک کو بیزار ہو کر چھوڑ دیگا اور "حضرت یزدان" میں تنہائی کا گلہ لیکر جائیگا تو "حضرت یزداں" کو مسکرانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں، مگر انسان کا اس طرح بیزار ہونا نظام عالم میں کوئی خلل یا بے آہنگی نہیں پیدا کرتا۔ دریا بہتے رہتے ہیں سیارے گردش میں رہتے ہیں یہ انکی فطرت ہے۔ انسان آرزوؤں میں تڑپتا ہے یہ اسکی فطرت ہے "آن غم دیگر کہ ہر غم را خورد" کے سوا انسان کو کوئی تسکین نہیں پہنچا سکتا، "حضرت یزداں" کو یہ خوب معلوم ہے، اسی وجہ سے شاعر کو انکے چہرے پر مسکراہٹ بھی نظر آتی ہے۔

آرزوؤں میں تڑپنا انسان کی فطرت کا تقاضا ہے مگر ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان تڑپتا ہے اور اسے اپنی کیفیت بیان کر سکنے کی بھی تسلی نہ ہو، آرزوئیں بہت سے دلوں میں ہوتی

ہیں، انکے پورا کرنے کا سرمایہ صرف چند برگزیدہ ہستیوں کو نصیب ہوتا ہے۔ دل کی بیماریوں میں سب سے مہلک اور تکلیف دہ یہی ہے کہ امنگیں بہت ہوں اور ہمت کم۔ ایسے انسان کی تنہائی میں وہی حالت ہوتی ہے جو ایک جدید جرمن مصور ہانز تھوما Hons Thoma نے اپنی تصویر ”تنہائی“[۱] میں دکھائی ہے۔ ایک نہایت مضبوط، خوبصورت جسم کا جوان مایوسی میں اپنے گھٹنوں پر سر رکھے ایک چٹان پر بیٹھا ہے۔ دھوپ اس قدر تیز ہے کہ چٹان لال ہوگئے ہیں، اور ایک سمندر کا پانی کھولتا ہوا نظر آتا ہے۔ کہیں ایک درخت بھی نہیں جس کے سایہ میں پناہ مل سکے۔ نہ کوئی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کی امید ہے۔ یہ گرم دھوپ اور جلتی ہوئی چٹانیں اور کھولتا ہوا پانی سب تنہائی کی مصیبتیں ہیں جنھوں نے دنیا میں دوزخ کی تاثیر پیدا کردی ہے۔ اگر وہ قوی ہیکل جوان تنہائی میں اس قدر مایوس نہ ہوتا تو اس کی بے بسی بھی جاتی رہتی وہ انہیں چٹانوں اور دھوپ اور سمندر کو ایک دلکش فضا بنا دیتا، اور تمام عمر اُن پر فخر کرتا رہتا۔ لیکن تنہائی میں تخلیقی کام کرنے کے لئے بہت ہمت چاہئے، اور یہ ہمت ہر آرزومند میں نہیں ہوتی۔

یہی تنہائی کی وہ ڈراونی شکل ہے جو ہر اس شخص کو نظر آتی ہے۔ جو انسان بننے اور بنانے کا ارادہ کرتا ہے۔

---

(۱) Die Einsamkit یہ تصویر میونش کی Pinakothek. میں ہے

سفرِ حج

یوں تو کئی سال سے دل میں خیال تھا کہ حج ایک اسلامی فریضہ ہے اس کو ادا کرنا چاہئے ورنہ قیامت میں بازپرس کا خوف ہے لیکن یہ خیال ارادہ تک بھی نہیں پہنچتا تھا چہ جائیکہ عزم بالجزم تا آنکہ اس سال جاذبہ رحمت الٰہی نے اس گنہگار کو کھینچا ارادہ پیدا ہوا اور فوراً عزم صمیم بن گیا یہانتک کہ اسی ہفتہ میں سامان سفر ٹھیک کرکے دہلی سے روانہ بھی ہوگیا اور وطن میں والدہ مکرمہ اور نانی صاحبہ سے ملنے کے لئے بھی نہیں گیا۔ اور انکی خدمت میں معذوری کے خطوط بھیجدئے۔

رفیق طریق میرے مکرم خواجہ عبدالحی صاحب تھے جن کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ مولانا عبدالقادر صاحب قصوری بھی عازم حجاز ہیں اس لئے ان کی خدمت میں خط بھیجا گیا اور جہاز کے ٹکٹ کا بندوبست بھی انہیں کے ذمہ کیا گیا۔

میں اور خواجہ صاحب دونوں ۲۶ اپریل سنہ ۲۸ء کو بمبئی پہنچ گئے اور مولانا عبدالقادر صاحب قصوری کے انتظار میں انکے بیٹے مولوی محمد علی صاحب (کنٹبٹ) کے یہاں قیام کیا مولانا کے بمبئی آنے کے بعد وفد محمل بھی پہنچا جس میں مولانا عبدالواحد صاحب غزنوی مولوی داؤد صاحب غزنوی اور مولوی اسمٰعیل صاحب غزنوی شامل تھے۔ نیز دہلی کے حاجی بشیرالدین صاحب اور حافظ حمیداللہ صاحب بھی۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اسی جماعت کے ذیل میں ہم دونوں کے نام بھی شامل کردئے گئے ہیں اور روزانہ انقلاب و زمیندار میں شائع کئے جاتے ہیں اور مولانا عبدالقادر صاحب اس وفد کے امیر قرار دئے گئے ہیں۔ نمازی کمپنی کے جہاز انگلستان سے روانگی قرار پائی تھی۔ اور کمپنی مذکور کے مینجر نے ۳ مئی کو اس کی روانگی کی امید دلائی تھی مگر وہ وقت پر نہیں آسکا اس لئے ۷ مئی تک انتظار کرنا پڑا اور آٹھویں کو

ہم لوگ "محمل" کے اس جہاز سے حجاز کو روانہ ہوئے۔ بمبئی میں حاجیوں کو لانے اور لیجانے والی تین کمپنیاں ہیں۔ ایک نمازی کمپنی جس کے غالباً چھ جہاز ہیں انگلستان تنگستان سروستان گرجستان وغیرہ۔ دوسری شوستری کمپنی جس کے صرف دو جہاز ہیں سلطانی اور زیانی۔ تیسری مغل لائن کمپنی ہے جو پہلے مسلمانوں کی تھی اب ایک انگریز ٹرنر ماریسن کے ہاتھ میں ہے اس کے پاس متعدد جہاز ہیں ہمایوں۔ اکبر۔ جہانگیر۔ دارا اور شجاع وغیرہ

ہماری گفتگو نمازی کمپنی کے ساتھ تھی لیکن محمل کی شہرت سے جو کمپنی کے لئے ایک اشتہار کی شکل رکھتی تھی مغل کمپنی کے ایجنٹ نے آکر ارکان وفد سے ملاقات کی اور کہا کہ اگر ہمارے جہاز سے محمل لیجائے تو آپ لوگوں سے بجائے ساڑھے پانسو کے فی کس چار سو روپیہ لیکر ہم اول درجہ کا واپسی کا ٹکٹ دیدیں گے۔ یہ سنکر بعض لوگوں کی طبیعت مائل ہوئی مگر بالعموم لوگوں نے اس کو مناسب نہ سمجھا کہ کمپنیوں کی باہمی رقابت سے ناجائز فائدہ اٹھایا جائے۔ اس لئے نمازی ہی کمپنی سے گفتگو جاری رکھی گئی۔ اس نے نصف قیمت پر واپسی کے بھی ٹکٹ اول درجے کے دیدیئے۔

نمازی کمپنی کی یہ بھی خواہش تھی کہ محمل کا جلوس نکالکر تمام بمبئی میں گشت کرایا جائے اور جس کے اخراجات کمپنی برداشت کرے گی۔ لیکن اہل حدیث جماعت نے اس کو پسند نہ کیا۔

اہل بمبئی چاہتے تھے کہ برقعہ اور حزام جو دہلی میں تیار ہوئے ہیں ان کو دکھا دئے جائیں لیکن وفد نے اس کو پسند نہ کیا۔ یہانتک کہ آخر میں یہ دھمکی بھی پہنچی کہ مسافرخانہ سے جہاز لیجاتے وقت بمبئی والے ان صندوقوں کو چھین لیں گے۔ پولیس نے امداد کا بھی قصد کیا لیکن وفد نے اس کو گوارا نہ کیا۔ آخر کچھ نہ ہوا۔ اور اطمینان و سلامتی کے ساتھ وہ صندوق جہاز پر پہنچ گئے۔

حاجیوں کے جہازوں میں انگلستان اچھا جہاز ہے۔ اس میں تقریباً ۷۰ فرسٹ کلاس کے اور ہزار گیارہ سو تھرڈ کلاس کے مسافروں کی گنجایش ہے لیکن چونکہ یہ سب سے

آخری جہاز تھا اس وجہ سے اس پر حاجیوں کی تعداد بہت کم تھی۔ تھرڈ کلاس کا کرایہ ۹۵ ار ۳ آ۔ سے گھٹاکر ۸۰ روپے تک کمپنی نے کردیا تھا مگر پھر بھی ۵۴۰ آدمیوں سے زائد نہ ہوئے۔

بہت سے لوگ اہل حدیث میں سے جن کا ارادہ بھی حج میں جانے کا نہ تھا کچھ تو کرایہ کی کمی اور کچھ اہل حدیث وفد کی کوشش سے سوار ہوگئے۔ جہاز پر جگہ خالی ہونے کی وجہ سے باقاعدہ پنجوقتہ نمازوں کی جماعتیں ہوتی تھیں۔ اور دو دو۔ ایک غیر مقلدوں کی دوسری مقلدوں کی۔

میرا یہ پہلا بحری سفر تھا۔ اور میں نے ہر وہ چیز جو کسی نے بحری سفر کے لئے ضروری بتائی تھی۔ رکھ لی تھی۔ لیکن سمندر اس قدر ساکن ملا کہ کوئی اثر کسی قسم کا میرے اوپر نہیں ہوا بلکہ بہت فرحت اور خوشی حاصل ہوئی۔ سقوترہ میں جہاں ہمیشہ کچھ نہ کچھ طوفانی کیفیت رہتی ہے وہاں بھی میں خوش رہا۔ حالانکہ بعضوں کو چکر بھی آئے قے بھی ہوئی۔ خواجہ صاحب تو ایک دن اپنے بستر سے اٹھ بھی نہ سکے۔

پانچ روز تک نیچے جہاں تک نظر جاتی تھی نیلا سمندر تھا اور اوپر نیلا آسمان چھٹے روز سرزمین عرب کا ساحل نظر آنے لگا۔ رات کو ہم عدن کے سامنے سے گزرے وہاں کے چراغ دکھائی دئے۔ ساتویں روز افریقہ کا ساحل بھی نظر آنے لگا۔ اور ہم باب المندب پر پہنچ گئے جہاں عربی اور افریقی ساحلوں میں بہت کم فاصلہ رہجاتا ہے۔ آٹھویں روز قمران پہونچے۔ وہاں قرنطینہ کے لئے حاجیوں کے ہر جہاز کو ۲۴ گھنٹے رکنا پڑتا ہے۔ ہم لوگ بھی اترے لیکن چونکہ نہ کوئی جہاز میں بیمار ہوا تھا نہ مرا تھا اس لئے غسل اور بھپارا دینے کے بعد ہم کو جہاز پر واپس جانیکی اجازت مل گئی اور صرف ۶ گھنٹے وہاں صرف ہوئے۔

حاجیوں کی تذلیل و توہین کا سلسلہ بمبئی ہی کے بندرگاہ سے شروع ہو جاتا ہے۔ قمران اس کا بدترین منظر ہے۔ پہلے ایک سائبان میں بیٹھے۔ پھر ایک ٹولی کم و بیش سو آدمیوں کی ایک ہال میں داخل ہوئی۔ اس میں سارے کپڑے جو جسم پر تھے اتروائے گئے اور ایک لنگی

باندھنے کو دیدی گئی۔ وہاں سے دوسرے حال میں گئے جہاں تعداد شماری ہوئی۔ پھر تیسرے میں گئے جہاں سلیمانی۔ ہندی اور بنگالی وغیرہ الگ الگ کھڑے کئے گئے۔ اس کے بعد نہلانے کے ہال میں پہونچے۔ وہاں اوپر سے پانی گرنا شروع ہوا۔ غسل کرکے پانچویں کمرے میں پہنچے۔ وہاں اتارے ہوئے کپڑے بھپارہ سے نکالکر ملے۔ غرض یہ تمام مراحل طے کرکے لوہے کی جالیوں سے گھرے ہوئے احاطے میں پہونچے جہاں چھپر ہیں یہاں پہنچنے پر راحت نصیب ہوئی کیونکہ یہ صاف ستھرے ہیں اور ان میں خوشگوار ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں۔

یہاں حاجیوں کو پانی اور لکڑی سرکار دیتی ہے۔ اور باقی ضروریات کے لئے بازار لگ جاتا ہے۔ چیزوں کا نرخ معین ہے۔ گوشت سستا ملتا ہے۔ مرغ ایک روپئے کا جوڑا آم بھی ہم نے یہاں خریدے لیکن صرف انکی شکل آم کی سی تھی۔ مزہ کسی قسم کا نہ تھا۔ نہ کھٹے نہ میٹھے۔

یہاں کے ڈاکٹر صاحب سے مفصل گفتگو رہی وہ توقع ظاہر کرتے تھے کہ قرنطینہ جلد ٹوٹنے والا ہے۔ غالباً اس کی بجائے جدہ میں قرنطینہ ہوا کریگا۔

سلطان ابن سعود اس زمانہ میں جدہ میں تھے۔ وفد کی آمد کی اطلاع انکو پہنچ چکی تھی وائرلیس سے وقت بھی تبلا دیا گیا۔ جس وقت جہاز جدہ میں پہنچا سلطانی کشتیاں اور انکے آدمی ہم کو لینے کے لئے جہاز پر آگئے سارا سامان انکے سپرد کر دیا گیا اور ہم لوگ موٹر بوٹ میں بیٹھکر ساحل پر آئے۔ جہاں جدہ کے حاکم جو قائم مقام بولے جاتے ہیں مع ایک دستہ فوج کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ چند موٹریں تھیں جن پر سوار ہوکر ہم ایک مکان میں پہنچا دئے گئے جو بالکل اس محل کے سامنے تھا جس میں سلطان ٹھہرے ہوئے تھے۔

بعد مغرب سلطان نے ملاقات کے لئے ہم لوگوں کو طلب فرمایا۔ اس وقت وہ پانچویں منزل کی چھت پر تشریف رکھتی تھی۔ معمولی دری کا فرش تھا اور امراء جدہ اور بعض ارکان سلطنت

موجود تھے۔ سلطان نے کھڑے ہوکر ہم میں سے ہر ایک کے ساتھ مصافحہ کیا۔ مولانا عبدالقادر صاحب قصوری تعارف کراتے تھے۔ مولانا عبدالواحد صاحب غزنوی کو سلطان نے احترام کے ساتھ اپنے پاس بٹھالیا۔ انہوں نے پہلے مولوی ثناء اللہ صاحب کا ذکر کیا کہ ابتک وہ اپنی غلطیوں سے رجوع نہیں کرتے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سلطان کو اس جھگڑے سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ کیونکہ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ رجوع کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ اس کے بعد موضوع سخن بدلکر مسلمانوں کے باہمی تفرقوں پر افسوس کا اظہار کرنے لگے۔ پھر ہندوستان کے موسم اور یہاں کی پیداوار وغیرہ کی نسبت پوچھنے لگے۔ چائے اور قہوہ کے دور گزرجانیکے بعد ہم کو واپسی کی اجازت ملی۔

دوسرے دن کی دعوت کسی قدر تکلف کی تھی۔ شام کو سلطان کے ملازم موٹریں لائے ہم لوگ مغرب کے وقت مکہ مکرمہ کو روانہ ہوئے۔ وسط راہ میں مقام بحرہ میں تقریبًا ایک گھنٹہ ٹھہرے۔ پھر وہاں سے روانہ ہوکر گیارہ بجے حرم شریف کے پاس جاکر ہمارا موٹر کھڑا ہوا۔ راستہ میں بعض بعض مقامات پر ریت میں موٹر کے پھنس جانیکی وجہ سے اس قدر دیر ہوئی ورنہ جدہ سے مکہ دو گھنٹہ سے زیادہ کا راستہ نہیں ہے۔ اور سڑک تعمیر ہو جانے پر جو نصف بن چکی ہے صرف ڈیڑھ گھنٹہ کا راستہ ہو جائیگا۔

حرم میں پہنچکر طواف اور پھر سعی سے فارغ ہوکر تقریبًا دو بجے شب کو معلم نے ہم کو اس مکان میں پہنچایا جو محلہ جیاد میں ہمارے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔ وہ مکان اگرچہ پنج منزلہ اور عالیشان تھا لیکن صبح کو اٹھکر ہم کو حبس اور گرمی کی تکلیف معلوم ہوئی۔ سامنے ہی متصل جبل ابوقبیس تھا حبس کی وجہ سے ہوا رکتی تھی۔ اس وجہ سے ہم لوگ سویرے ہی اس مکان سے نکلکر کسوۃ خانہ میں آگئے جو قلعہ مکہ کے نیچے پہاڑ کے دامن میں موتمر کے سامنے غلاف کی تیاری کے لئے اسی سال پچاس ہزار روپیہ کی لاگت سے تعمیر ہوا ہے۔

یہ مکان کشادہ ہوادار۔ صاف ستھرا اور آرام دہ ہے اور حرم سے صرف تین منٹ کے

فاصلہ پر واقع ہے۔ جبتک رہے اسی میں رہے نہ اس میں بدبو تھی نہ مچھر جو مکہ کے مکانات میں عام ہیں ہمارا سارا سامان وہیں ہمارے پاس پہنچ گیا۔

مولوی ظفر علیخاں اڈیٹر زمیندار دو روز ہم سے پیچھے پہنچے۔ اور وہ بھی ہمارے ساتھ اسی مکان میں ٹھہرے۔

حج کے قریب ہونیکی وجہ سے سلطان بھی ہمارے پہنچنے کے دوسرے دن مکہ میں تشریف لائے۔ تیسرے دن شام کو ہم کو اطلاع دی گئی کہ سلطان برقع اور حزام کو دیکھنے کے لئے ابھی موتمر میں تشریف لا رہے ہیں۔

موتمر ترکوں کے زمانہ کی شاہی عمارت ہے جس میں دربار کے لئے بڑے بڑے ہال ہیں ہماری فرودگاہ اور موتمر میں صرف ایک سڑک کا فاصلہ تھا۔ ہم لوگ بھی پہنچ گئے۔ سلطان تشریف لائے۔ انکے ساتھ ان کے بھائی امیر محمد اور قاضی مکہ شیخ عبداللہ بن حسن بھی تھے اور بعض اعیان سلطنت۔

سلطان کے آنے کے بعد ایک دور شربت کا چلا۔ اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ مناسب یہ ہے کہ ممالک اسلامیہ سے جو نامی اور ممتاز لوگ حج میں آئے ہوئے ہیں وہ بھی بلائے جائیں تب یہ صندوق کھولے جائیں۔ ہم لوگوں نے کہا کہ یہ رائے انسب ہے۔ چنانچہ معائنہ کل پر رکھا گیا اور سلطان تشریف لے گئے۔

دوسرے دن حکومت کی طرف سے دعوتی خطوط شائع ہوئے اور تقریباً پانسو معززین حجاج کو جس میں مصری۔ ٹیونسی، یمنی، شامی، ترکی، ایرانی، تورانی، ہندی اور جاوی وغیرہ سب شامل تھے بھیجے گئے۔ شام کو موتمر میں مجمع ہوا اور برقع اور حزام کھولا گیا۔ جملہ حاضرین نے اس کو بہت پسند کیا اور تعریف کی۔ خاصکر مصریوں نے حالانکہ وہ ایک قسم کے حریف تھے سلطان نے کہا کہ میرا خیال تھا کہ اچھا بنا ہوگا لیکن یہ میں نہیں سمجھتا تھا کہ اس قدر اچھا بنا ہوگا۔ اس کے بعد ایک عرب نے تقریر کی اور سلطان کی اور انکے عہد حکومت کی تعریف کی۔

پھر ایک دوسرے شخص نے نظم پڑھی۔ اور مولوی اسمٰعیل غزنوی نے غلاف کی تیاری کے متعلق مفصل کیفیت پڑھکر سنائی۔

پھر یہ سارا مجمع اُٹھ کر چھت پر گیا جہاں چائے کی دعوت کا انتظام کیا گیا تھا۔ ہر قسم کے انگریزی بسکٹ وغیرہ اور فواکہ جو اس وقت مل سکتے تھے میز پر تھے۔ مکھن اور پنیر بھی۔ عربی بھی اور انگریزی بھی۔ اور مختلف قسم کے مربے اور زیتون۔

سلطان کے پاس شعب مصری کا ایک نمائندہ بیٹھا تھا اس نے نہایت دلکش تقریر میں اپنی جماعت کی طرف سے اصلاحات حجاز پر سلطان کا شکریہ ادا کیا۔ اس کی تقریر اس قدر بے تکلف اور لطیف تھی کہ سلطان بھی عش عش کر گئے۔ اور فرمانے لگے کہ میں بدو ہوں اس قدر عمدہ اور لطیف تقریر نہیں کر سکتا مگر تاہم مجکو اپنے بدو ہونے پر فخر ہے۔ میرا دل زبان کے ساتھ اور زبان دل کے ساتھ ہے۔ میں مصری قوم کو محبوب رکھتا ہوں کیونکہ مسلمانوں میں وہ علمی حیثیت سے ایک ترقی یافتہ جماعت ہے۔ اور جو کوئی کسی حیثیت سے اسلام اور توحید کی خدمت کرتے ہیں اسکا غلام ہوں۔

شیخ سنوسی بھی اسی جگہ موجود تھے شعب مصری کے نمائندے نے سلطان کو ان کی تعظیم و تکریم کی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ دلائی۔ اس نمائندے کی عمر تقریبًا پچاس سال تھی اور داڑھی بالکل خشخشی۔

دوسرے دن اسی ٹکٹ پر محل شاہی میں دعوت تھی۔ ہر محلہ میں حکومت کی طرف سے مہمانوں کو اطلاع دیدی گئی کہ فلاں فلاں مقامات پر سرکاری موٹریں موجود رہیں گے مہمان بعد نماز مغرب ان پر سوار ہو کر قصر شاہی میں پہنچیں۔

سلطان اپنے نو تعمیر محل میں جو جنت المعلےٰ کے سامنے مکہ کی آخری حد پر ہے مہمانوں کے منتظر تھے۔

ہمارے لئے جو موٹروں کی جگہ مقرر تھی وہ حمیدیہ تھی جو کوتوالی ہے اور احرام سے بالکل متصل۔

مغرب کی نماز سے فارغ ہوتے ہی ہم سوار ہوگئے اس وجہ سے دوسرے مہمانوں سے کسی قدر پہلے پہنچے۔ سلطان جس ہال میں تشریف رکھتے تھے۔ تقریباً ۷۰ فٹ لمبا اور ۴۰ فٹ چوڑا اور سادہ تھا۔ مگر قالینوں کے فرش اور ترکی نشست وغیرہ کے انداز سے خاصی شاہانہ عظمت نمایاں تھی۔ سلطان اس کے ایک گوشہ میں بیٹھے تھے اور جا بجا قرینہ سے محافظ دستہ کے سپاہی کھڑے ہوئے تھے جن کی سرخ قبائیں پنڈلیوں تک تھیں۔ کمر میں پیٹی سینہ پر پرتلہ جن میں کارتوس لگے ہوئے اور ہاتھوں میں بندوقیں۔ سر پر سرخ رومال جو نجدیوں کا خاص شعار ہے اور اُنپر سیاہ عقال۔

ان سپاہیوں کا قد بالعموم ساڑھے پانچ فٹ کا تھا۔ اور اہل نجد کا اغلباً یہی قد ہوتا ہے جسم چھریرا اور رنگ خالص عربی یعنی زرد سیاہی مائل۔ اپنی سرخ قباؤں میں بت کی مانند غیر متحرک کھڑے ہوئے گھونگچی کی طرح یہ ہال کا ایک سامان آرائش معلوم ہوتے تھے کسی طرح کا سپاہیانہ رعب ان سے نمایاں نہ تھا۔ اکثر یہ لڑکے تھے۔ اور نجدیوں کے چونکہ داڑھی مونچھ بھی کم ہوتی ہے اس لئے زیادہ عمر والے بھی لڑکے ہی معلوم ہوتے تھے۔ چستی اور نشاط ان سے بے شک ٹپکتی تھی اور انکی تیز نگاہیں ہر وقت اپنے آقا کی طرف لگی رہتی تھیں۔

مہمان جب پہنچتے تھے تو درباری آگے ہوتا تھا اور ایک سپاہی پیچھے پیچھے ساتھ ساتھ اس طرح سلطان تک اس کو پہنچاتے تھے۔ سلطان اٹھکر اس سے مصافحہ کرتے تھے۔ پھر درباری اسکو مناسب جگہ بٹھاکر واپس جاتا اور نجدی الٹے پاؤں اپنی جگہ جاکر کھڑا ہوجاتا۔

میری کرسی سلطان کے سامنے متصل ہی تھی۔ اور ظفر علیخاں بھی میرے ساتھ ہی تھے سلطان کے دائیں پہلو پر سلطان مکلہ انکے بعد شیبی اور پھر مولانا عبدالقادر صاحب قصوری تھے۔ بائیں طرف شیخ سنوسی تھے۔ اور امام ادریسی کا بیٹا جو سوٹ بوٹ اور ترکش کیپ میں تھا۔ سامنے نجدی اور ترکی اور مصری رؤسا تھے۔ خالد لوئی بھی تشریف لائے تھے اور اس وقار اور متانت سے بیٹھے تھے کہ احنف بن قیس کی تاریخی شخصیت ان کو

دیکھکر یاد آتی تھی۔ انکے متصل یمنی وفد کے ارکان تھے جو اپنی سفید عباؤں اور بڑے بڑے عماموں سے ممتاز نظر آتے تھے۔

جب ہال بھر گیا تو سلطان نے جو نہایت سادہ لباس میں سنجیدہ سکون کے ساتھ بیٹھے تھے فرمایا کہ مسلمانوں کو دو چیزوں کے جاننے کی ضرورت ہے۔ ایک تو چاہئیے کہ وہ اسلام کو پہچانیں دوسرے خود مسلمانوں کو۔ کیونکہ ہم میں باہمی تعارف نہ ہونیکی وجہ سے بہت غلط فہمیاں ہیں۔ اس کے بعد وہ اس دردناک تفریق کا مرثیہ پڑھتے رہے۔ جو بدقسمتی سی مسلمانوں میں اس وقت واقع ہیں۔

مجھے سلطان کے طور طریق اور انکی باتوں سے یہ اندازہ ہوا کہ وہ ایک وسیع القلب اور روادار سلطان ہیں۔ تعصب سے انکا رتبہ بالاتر ہے اور اس اخوت اور مساوات کے طلبگار ہیں جس کی اسلام تعلیم دیتا ہے۔ وہ مذہبی تفریق سنیت اور شیعیت۔ مقلدی اور غیر مقلدی وغیرہ سے بیزار ہیں۔ اور گو نام کے لئے حنبلی کہلاتے ہیں مگر حنبلیت اور حنفیت اور شافعیت وغیرہ کو بھی بہرصورت تفریق ہی سمجھتے ہیں۔ انکے نزدیک اچھا مسلمان بنانیکے لئے صرف کتاب وسنت کافی ہے۔ محفل میں ہر پندرہ منٹ کے بعد قہوہ یا چائے کا دور حسب معمول چلتا رہا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ یہ محفل رہی۔ اس میں سوائے سلطان کے اور کسی نے کم گفتگو کی۔ انکی تقریر بھی کسی ایک موضوع پر نہ تھی۔ عشاء کے وقت ضیافت کی تیاری کی اطلاع پاکر وہ مہمانوں کو لیکر اٹھے۔

میرا خیال تھا کہ بدویانہ سادی دعوت ہو گی لیکن کھانا میزوں پر چنا ہوا تھا اور نشست کرسیوں پر تھی۔ چھری کانٹا اور چمچہ بھی تھا۔ سالن متعدد قسم کے تھے اور کوفتہ شامی کباب اور مرغ مسلم بھی۔ اچار اور مربے بھی کئی قسم کے تھے پڈنگ بالکل انگریزی وضع کی اور کئی طرح کی تھی۔ خربوزے مشمش اور مالٹے بھی تھے۔ اور عرب کا خاص شاہی کھانا یعنی کوزی جو مسلم

دنبہ کا پلاؤ ہوتا ہے اور قیمتی کھانا سمجھا جاتا ہے۔ خدام میزوں کے آگے کھڑے ہوئے تھے کہ کھانے سامنے بڑھائیں اور برف آب پلائیں۔

مہمانوں کا کچھ حصہ ایک بڑے حال میں تھا جس میں برقی روشنی اور برقی پنکھے تھے بقیہ ہال سے باہر کھلی ہوئی چھت پر تھے۔ ضیوف کی تعداد میرے خیال میں ایک ہزار سے کم نہ تھی مگر کھانے کی مقدار اتنی تھی کہ جب ہم اُٹھے ہیں تو میزیں پر تھیں۔ غالباً نجدی فوجوں نے ان کو ختم کیا ہوگا۔

کھانے سے فارغ ہوکر ہم اوپر کی چھت پر گئے جہاں نشستوں کا انتظام کر دیا گیا تھا سلطان وہاں بھی ایک گوشہ میں بیٹھ گئے۔ مہمان کرسیوں اور بازؤں کی نشستوں پر۔ پہلے چائے اور پھر قہوہ کا دور چلا۔ اس کے بعد کسی قاری نے ایک رکوع تلاوت کیا۔ پھر حرم کے امام شیخ ابو سمح عبدالظاہر نے ایک مختصر تقریر کی جس کا مضمون یہ تھا کہ مسلمانان عالم کو اصلاحات حرم میں سلطان کا ہاتھ بٹانا چاہیے اس کے بعد مولوی ظفر علیخاں نے اپنی اُردو نظم سنائی۔ میں نے اس کا عربی میں ترجمہ لکھدیا تھا اور ایک تمہید بھی۔ نظم سنانے کے بعد انہوں نے اس تمہید اور ترجمہ کو سنایا کہ سامعین سمجھ سکیں۔

مولوی صاحب موصوف نے یہ نظم دراصل اس جلسے کے لئے لکھی تھی جو اس سے اگلے دن موتمر میں ہوا تھا۔ جلدی میں یہ نظم میرے نزدیک کچھ موقع کے حسب حال نہ ہوسکی۔ میں نے ظفر علیخاں سے کہا بھی لیکن انہوں نے جواب دیا کہ اب جو کچھ بھی لکھی گئی ہے اس کو پڑھ دینا چاہیے۔ اس روز موقع نہ مل سکا اس لئے ڈنر میں سنائی۔ اس کا مطلع یہ تھا۔

جب اٹھاتا ہے حرم میں آستیں ابن سعودؔ   جیب سے لاتا ہے نذر گوہریں ابن سعود

تقریباً دس بجے اور عربی حساب سے ۴ بجے واپس آئے کیونکہ وہاں غروب آفتاب کے وقت بارہ بجائے جاتے ہیں۔

سلطانی ضیافت خانے سے جو کھانا ہمارے لئے آتا تھا وہ ہمارے موافق نہ تھا اس وجہ

سے ایک باورچی وہاں سے طلب کرلیا گیا۔ اور خام رسد منگوا کر اس سے اپنے حسب منشا کھانا پکوانے لگے۔

۲۸ مئی کو ذالحجہ کی آٹھویں تاریخ تھی اس روز حج کو روانگی ہوئی۔ موٹروں کی اجازت نہ تھی۔ خود سلطان اور شاہزادے اونٹوں پر گئے۔ ہمارے لئے بھی اونٹ ہی آئے مگر انکے شغدفوں پر بجائے ٹاٹ کے معمولی پردوں کی نئی دریاں سلطان کے حکم سے خرید کر ڈالی گئی تھیں۔ سب کے عدیل مقرر ہوگئے ظفر علیخاں نے مجھکو منتخب کیا۔ مگر شغدف پر اپنا ٹفن بکس اور بستر رکھکر بگٹٹ پیدل روانہ ہوگئے۔ میں نے کہا یہ کیا؟ کہنے لگے کہ پا پیادہ حج کروں گا۔ اب ہم بیعدیل رہ گئے۔ اور شغدف کا توازن قائم نہ رہ سکا۔ جنت المعلیٰ سے آگے نکل کر ایک پہلو نیچا اور ایک اونچا ہوگیا۔ جمال چلایا کہ یا شیخ المیزان۔ اتنے میں ظفر علیخاں نظر پڑے کہ ایک نہایت چھوٹے گدھے پر جنکو میں مکہ کی بائیسکل کہا کرتا تھا تیزی کے ساتھ منا کی طرف بھاگے جا رہے ہیں اور پیچھے پیچھے مولوی اسمٰعیل غزنوی بھی ہیں۔ ٹانگیں اس خوف سے کہ زمین سے نہ بھڑ جائیں دونوں نے گدھوں کی گردنوں کے برابر اٹھا رکھی تھیں۔ غرض ایک دلچسپ تماشا تھا۔ میں نے جمال سے کہا کہ دیکھ المیزان وہ گدھے پر بھاگا جا رہا ہے۔ اس نے کہا کہ پھر کیا کروں۔ میں نے کہا کہ میرے ہم وزن ایک پتھر لاکر رکھدے۔ اس تدبیر سے کچھ توازن ٹھیک ہوا۔

رات منا میں گزار کر صبح کو روانہ ہوئے اور دس بجے دن کے اس مقدس میدان میں پہونچے جہاں حج ہوتا ہے۔ سلطانی خیمہ کے متصل مہمانوں کا خیمہ تھا اور ایک دن کی ضروریات کا پورا سامان کر دیا گیا تھا۔ جاتے ہی ہاتھ منہ دہونے کے بعد فطور (ناشتہ) ملا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہمارے بعض ساتھیوں نے مسجد نمرہ کا قصد کیا جہاں ظہر اور عصر دونوں نمازیں ظہر ہی کے وقت جمع کرکے پڑھی جاتی ہیں۔ گرمی اور طبیعت کی کمزوری سے ہم سے یہ سنت ادا نہ ہوسکی سلطان اور شاہزادے اور بعض احباب ہمت کرکے وہاں پہنچ گئے۔ واپسی کے بعد کھانا ملا۔ اب وقوف کا وقت آیا۔

سلطان نجد اور اس کی فوج نیز یمنی اور بدوی اعراب جنکی تعداد لاکھ سوا لاکھ ہوگی جامۂ احرام پہنے سر کھولے ہوئے اس آتشیں دھوپ میں جبل عرفات پر اور اسکی وادی میں جاکر تقریبًا دو ڈہائی بجے دن کے کھڑے ہوگئے۔ کچھ اونٹوں پر تھے اور کچھ پیدل۔ اسی طرح غروب آفتاب تک ان لوگوں نے وقوف کیا۔ کسی ہندی یا جاوی کی یہ ہمت نہ تھی کہ وہاں جاکر کھڑا ہوتا۔ حقیقت میں وقوف عرفات کا حق عربوں ہی نے ادا کیا۔ دور سے یہ پہاڑ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تصویر کا ایک مرقع ہے۔ ہم لوگ خیموں سے سر نکالکر کبھی کبھی دیکھتے تھے اور پھر دھوپ کی تپش سے اندر کھینچ لیتے تھے۔

چار بجے کے بعد آندھی آئی جس میں خیمہ گر گیا۔ خفیف بوندیں بھی پڑیں جن سے کسی قدر تپش کم ہوگئی۔ اس وقت میں نے ایک عرب کو ساتھ لیا اور جبل عرفات پر پہنچا۔ دیکھا کہ نجدی کھڑے ہوئے ہیں۔ تسبیح اور تہلیل اور دعاؤں میں مشغول ہیں۔ انکی ناکوں میں روئی کی بتیاں پڑی ہیں اور خون جاری ہے۔ غالبًا رعاف کی عربوں میں کثرت ہے کیونکہ میں نے طواف میں بھی انکو ناکوں میں بتیاں ڈالے دیکھا جو خون سے تر تھیں۔

وہاں سے جبل رحمت کی طرف آیا اور پھر میدان عرفات کا ایک نظری جائزہ لیا۔ میرا اندازہ یہ تھا کہ وہاں کم وبیش تین لاکھ آدمی ہوں گے۔

بعد غروب آفتاب وہاں سے کوچ ہوا۔ پھر ہم اونٹ پر بے عدیل تھے اور ظفر علیخاں پیدل ایک پہر رات گئے مزدلفہ میں آئے۔ وہاں بستر لگا دئے گئے۔ مغرب اور عشا کی نماز ایک ساتھ ادا کی گئی۔ اور کچھ کھا پی کر سو رہے۔

مشعر حرام کے متصل خصوصیت کے ساتھ قرآن میں حکم ہے کہ ذکر الٰہی ہو لیکن حجاج نے اسکا مطلق خیال نہ کیا الا ماشاء اللہ۔ عام طور پر قہوہ نوشی اور کھانے پینے ہی میں لوگ مشغول رہے۔

صبح کو مزدلفہ سے منا میں آگئے جو ایک میل کے فاصلہ پر ہے یہاں خیمہ لگا ہوا تھا آرام کے ساتھ اس میں ٹھہر گئے۔ ناشتہ اور کھانا سلطانی مطبخ سے آتا تھا۔ دوپہر کے قریب قربانی سے

فارغ ہوئے۔ سنت یہ ہی کہ اسی دن مکہ میں آکر طواف وسعی کریں لیکن گرمی کی حدت نے پھر ہماری ہمتیں پست کر دیں اور یہ سنت نہ ادا کر سکے۔ بارہویں تاریخ کو جب واپس آئے اس وقت اس کو ادا کیا۔

ارکان وفد میں سے کچھ مکہ میں رہنا چاہتے تھے کچھ مدینہ کا ارادہ رکھتے تھے۔ میں اسی آخری جماعت مین تھا مگر طبعیت یکایک ناساز ہو گئی۔ اس لئے اس گرمی میں تاب سفر نہ لا کر اکیلا جدہ واپس چلا آیا اور اسی جہاز میں جس میں گیا تھا بلکہ اسی کیبن میں پھر واپس آیا۔ ۴ر جون کو مکہ سے روانہ ہوا تھا۔ ۸ روز جدہ میں رہا۔ ۱۲ر جون کو جہاز پر سوار ہو کر ۲۲ر جون کو بمبئی میں اُتر گیا۔

میرے سفر حج کے یہ سرسری واقعات ہیں۔ مزید حالات انشاء اللہ آئندہ نمبر میں لکھوں گا۔

اور پھر کیا؟

جسم ناپاک ہے، دنیا فریب ہے، اس لئے نجات کے واسطے جسم کو تکلیف دینا اور دنیا کو ترک کرنا ضروری ہے۔ یہ تھا قرون وسطےٰ میں یورپ کا روحانی مطمح نظر۔ لیکن جدید یورپ فطری خواہشات کی انسانی دنیا اور جماعتی مقاصد میں ایک طرف اور روحانی زندگی اور اس کے ضبط نفس اور مدارج و مقامات میں دوسری طرف مستقل جنگ کو تسلیم نہیں کرتا اور اسے مضرت اثر جانتا ہے۔ ہم اگر اس دنیا کے فریب ہونے پر بہت زور دیں تو اس کے نزدیک اپنے وجود کے اخلاقی مقصد کو بہت کمزور کر دیتے ہیں۔ اس کی نظر میں سب سے شاندار موت یہ ہے کہ آدمی زندگی کی گھوڑ دوڑ میں سرپٹ دوڑتے دوڑتے گر کر مر جائے۔

یہ ممکن ہے کہ اس دنیا پر اپنا عقیدہ جما کر، اس کی ناپائداری اور موت کے یقینی ہونے سے قطع نظر کر کے اور اپنے خیال کے مخالفوں کو مریض بتلا کر یورپ نے کچھ قوت حاصل کر لی ہو۔ شاید اس کی وجہ سے اس کے فرزند مقابلہ میں زیادہ کارگزار اور اس کشمکش میں فتح حاصل کرنے کے زیادہ قابل ہو گئے ہیں جس سے زندگی انکے خیال میں عبارت ہے۔ اس زندگی کو اس طرح گذار کر کہ گویا اسکا رشتہ دنیا سے کبھی ٹوٹنے والا ہی نہیں عملی فائدے چاہے جو کچھ حاصل ہو جائیں لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔

بیشک، قدرت نے خود اپنے حیاتیاتی مقاصد کی خاطر ہمارے اندر زندگی پر بڑا مضبوط عقیدہ پیدا کر دیا ہے اور وہ ہمیں موت سے بیخبر رکھتی ہے۔ لیکن پھر بھی ہمارا وجود ہی نہیں بلکہ وہ سارا ماحول جو وہ اپنے گرد تیار کرتا ہے عین فتح و کامرانی کے وقت ہمارا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ بڑی سے بڑی دولت ختم ہو جاتی ہے اور منتشر ہو کر اپنی جگہ خلا چھوڑ جاتی ہے۔ جشن فتح و ظفر کی روشنیاں ابھی جھلملاتی ہی ہوتی ہیں کہ بڑی سے بڑی سلطنتوں پر موت

کی نیند چھا جاتی ہے۔ اس حقیقت کو یاد دلائے تو جی اکتا آتا ہے۔ لیکن ہے یہ پھر بھی سچ۔

مگر پھر یہ بھی اسی قدر صحیح ہے کہ ہر چند ہمارے دنیاوی تعلقات سب کے سب ختم ہونے والے ہیں تاہم جبتک ہیں انہیں پس پشت نہیں ڈالا جا سکتا۔ ان کی ناپائیداری کی وجہ سے اگر ہم یہ سمجھنے لگیں کہ انکا وجود ہی نہیں تو پھر بھی یہ اپنا حق وصول ہی کر لیں گے اور بطور جرمانہ اور سے اور بہت کچھ بھی وصول کر لیں گے۔ ہم ریل کے کرایہ کی معافی کا دعویٰ اس بنیاد پر نہیں کر سکتے کہ ریل گاڑی میں سکونتی مکان کی سی پائداری نہیں۔ حقیقی لیکن عارضی بندھنوں کے وجود کو نظر انداز کرنیکی کوشش انکی بندش کو زیادہ تنگ اور زیادہ طویل بنا دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تعلق اور بے تعلقی میں ہم آہنگی پیدا کرنا ضروری ہے اور جب یہ ہو جائے تب ہی جا کر یہ حقیقت تک ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں۔ تعلق تو وہ قوت ہے جو ہمیں حقیقت کے محدود پہلو سے وابستہ کرتی ہے یعنی اس کے مظاہر کے پہلو سے۔ بے تعلقی ہمیں حقیقت کے عینی پہلو یعنی اس کی لامحدود بے پایانی میں آزادی تک پہنچاتی ہے۔ ہندوستانی تخیل کی علامات میں شیوا یعنی اصل مردانہ آزادی کی روح کا نشان ہے اور شیونی یعنی اصل نسائی ظہور کی روح کی علامت ہے۔ انکے میل اور اتحاد میں عین تکمیل ہے۔

ان متضاد قوتوں میں ہم آہنگی حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے تو انسان کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کی ضرورت ہے یعنی اسے کسی خاص مقصد کے ماتحت کاٹنا چھانٹنا نہ چاہیئے۔ درختوں کو صرف ایندھن کی حیثیت سے دیکھنا پورے درخت سے بیخبر رہنا ہے۔ اسی طرح انسان کو محض اپنے ملک کے محافظ یا دولت کے پیدا کرنیوالے کی حیثیت سے دیکھنا اسے سپاہی یا تاجر بنا دینا ہے اور ان حیثیتوں سے انکی کارکردگی کو اس کی انسانیت کا معیار بنا دینا۔ یہ تخیل محدود ہی نہیں تباہ کن ہے۔

ہندوستان انسان کو ہر اس مقصد سے برتر و بلند تر جانتا تھا جن کا وہ خادم ہو جکیا

چنگٹ کے اس قول سے ظاہر ہے کہ "خاندان کے لئے فرد کو قربان کردو، برادری کے لئے خاندان کو، ملک کے لئے برادری کو، اور روح کے لئے ساری دنیا کو۔"

ہمارے رشیوں نے واقعی انسانی روح کی عظمت کو خوب سمجھا تھا۔ انکے نزدیک اس کی شان کی حدود و نہایت ہی نہ تھی، اس لئے انسان کا ہر محدود تخیل غلط تخیل تھا۔ وہ نہ صرف شہری ہے، نہ محض وطن پرست کیونکہ اس کی غیر فانی روح نہ شہر میں سما سکتی ہے نہ ملک میں اور نہ اس بلبلے میں جسے "دنیا" کہتے ہیں۔

بھرتری ہاری نے، جو کبھی بادشاہ تھا کہا ہے؛

" مانا کہ تم نے تمام خواہشات کے سرچشمہ، خود لکشمی کو حاصل کر لیا لیکن پھر کیا؟ اپنے دشمن کو سرنگوں کر کے اس کی گردن پر اپنا قدم رکھ دیا لیکن پھر کیا؟ یا اگر خوش قسمتی سے اپنے گرد دوستوں کا ایک مجمع کر لیا تو کیا؟ مانا کہ اپنے فانی جسموں کو قرنوں تک زندہ رکھ سکے مگر آخر پھر کیا؟ آخر پھر کیا؟"

* * *

یورپ آج آزادی کے گیت گاتا ہے۔ اور اس کی نظر میں آزادی کہتے ہیں دولت کمانے کی آزادی کو، لطف اٹھانے کی آزادی کو، کام کر سکنے کی آزادی کو۔ یہ آزادی بھی کوئی چھوٹی سی چیز نہیں۔ اور دنیا میں اسے قائم رکھنے کے لئے بہت محنت اور توجہ کی ضرورت ہے۔ لیکن ہمارے دانشور اس سے مطمئن نہ تھے اور ہمیشہ یہ سوال انکے سامنے تھا کہ آخر پھر کیا؟ یہ آزادی انکے لئے آزادی نہ تھی۔ ہندوستان تو خواہشات سے اور کام سے بھی آزادی چاہتا ہے۔

آزادی حاصل کرنے کے لئے اپنے ارادے کو پابند کرنا ہوتا ہے تاکہ اس کی قوت میں انتشار نہ پیدا ہو اور اس میں وہ زور پیدا ہو سکے جو صرف پابندی سے پیدا ہوتا ہے۔ جو لوگ سیاسی آزادی کے طالب ہوتے ہیں وہ برابر اسے پابند بھی کرتے ہیں اور خیال اور عمل کی آزادی

کو بھی اس حد تک کم کرتے ہیں جہاں تک سیاسی آزادی کو محفوظ رکھنے کے لئے ضروری ہے اور اکثر ضمیر کی آزادی کو اس پر قربان کیا جاتا ہے۔

انگلستان کے سپاہی آزاد انسان ہیں یا محض چلتی پھرتی بندوقیں؟ اور اس کی کانوں اور کارخانوں کے مزدور؟ ان مشینوں کے ضمیمے جن پر وہ کام کرتے ہیں اور اپنے خون جگر سے سلطنت برطانوی کے نقشہ کو سرخ رنگنے میں مدد دیتے ہیں۔ کتنے گنتی کے انگریز ہیں جو انکی سیاسی آزادی سے متمتع ہوتے ہیں۔ یورپ نے انفرادیت کا وعظ بہت کچھ دیا ہوگا اور اس کے لئے بہت کچھ کوشش کی ہوگی اور دنیا میں کسی جگہ فرد یورپ سے زیادہ غلام ہے؟

اسکا ایک ہی جواب ہے۔ اور وہ چیستان ہے جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے یعنی آزادی پابندیوں سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ ایک نفع ہے جو اسی وقت ملتا ہے جب غلامی کا کافی سرمایہ لگایا جائے۔

ہندوستان کی جستجو کا مقصد بھی یہی انفرادیت تھی لیکن اس محدود قسم کی انفرادیت نہیں کیونکہ وہ پھیل کر کامل آزادی و نجات تک پہنچتی ہے اسی لئے اس نے اس انفرادی آزادی کو زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل میں، خاندان اور سماج کے ہر تعلق میں حاصل کرنا چاہا اور جس طرح یوروپ میں آزادی کے مطمح نظر نے میکانکی اور فوجی پابندیوں کی شکل میں ظہور کیا ہے اسی طرح ہندوستان کے مطمح نظر نے روزمرہ زندگی کی ہر جزوی بات میں پابندیاں پیدا کر دیں۔ اگر ہم اس مطمح نظر کو نہ دیکھیں جو ان پابندیوں کے پیچھے ہے اور صرف خارجی مظاہر پر نگاہ رکھیں تو ظاہر ہے کہ ہندوستان میں آزادی کا فرد پوری طرح پابہ زنجیر نظر آتی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جب کسی ملک میں انحطاط شروع ہوتا ہے تو اصلی چیز سے نظر ہٹ جاتی ہے اور اس کی جگہ وہ فضول جزئیات لے لیتی ہیں جو اس اصل کے گرد جمع ہو جاتی ہیں

چڑیا اڑ جاتی ہے۔ خالی پنجرہ رہجاتا ہے۔ یہی ہمارے ملک میں بھی ہوا ہے۔ ہم آج ہر قسم کی سماجی پابندیوں کو مانتے ہیں لیکن وہ آزادی وہ نجات جو اس سے مقصود تھی نہ ہمارے سامنے ہے نہ خیال میں ہے نہ عمل میں۔ میرا مقصد اس جگہ اپنے زوال کا مرثیہ پڑھنا نہیں ہے میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہندوستان نے شروع میں اپنے سماجی نظام کی پابندیاں اس لئے تسلیم کی تھیں کہ سماج سے بالاتر ہو جائے۔ جیسے سوار گھوڑے کے لگام لگاتا ہے اور اپنے پیروں کو رکاب میں روکتا ہے تاکہ منزل مقصود کی طرف اس کی رفتار اور تیز ہو جائے۔ ہندوستان جانتا تھا سماج مقصود آخر نہیں۔ نہ انسان کی آخری جائے پناہ ہے بلکہ اس کی نجات کا محض ایک ذریعہ ہے۔ اور اگر اس کی پابندیاں ان سے کٹھن تھیں جو یورپ نے اپنے اوپر عاید کر لی ہیں تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس سے بہتر آزادی کی تلاش تھی۔ اس کی موجودہ حالت تو صرف یہ بتاتی ہے کہ جھیل جتنی گہری ہوتی ہے سوکھنے پر غار اسی قدر خطرناک معلوم ہوتے ہیں۔

پابندی و آزادی۔ مقصود و ذریعہ کے اس تضاد میں ہم آہنگی کی طرف ایشا اپانشد نے یوں اشارہ کیا ہے، "ظلمت میں ہیں جو محض محدود دنیا کی پرستش کرتے ہیں۔ لیکن اس سے تاریک تر ظلمت میں ہیں جو صرف غیر محدود کے پرستار ہیں جو دونوں کو قبول کرے وہ پہلے کے علم سے موت سے اپنے کو بچاتا ہے اور دوسرے کے علم سے حیات ابدی حاصل کرتا ہے۔"

یعنی آخرت کے حصول کے لئے بھرپور دنیاوی زندگی درکار ہے۔ خواہشات کی گردن پر کام کا جوا اس لئے رکھنا چاہئے کہ انسان خواہش سے اور کام دونوں سے بلند تر ہو جائے . . . محض ترک دنیا سے بقائے دوام حاصل نہیں ہوتی۔

* * *

یورپ میں انسان کی دنیاوی زندگی کے صرف دو حصے ہیں؛ تیاری کا زمانہ اور

کام کا۔ کام ہی میں یہ زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن کام کسی چیز کا خاتمہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کوئی فائدہ کسی چیز کا کسی مقام کا حصول اس کا مقصد نہیں رکھا۔ جہاں پہونچکر کام کا قدرتی خاتمہ ہو اور آرام ملے۔ تحصیل کے لئے چاہے دولت کی ہو چاہے علم کی کوئی حد نہیں۔۔۔۔ اس لئے یورپ والوں کا خاتمہ بیچ ہی میں آجاتا ہے۔ انکی منزل کوئی نہیں سفر ہی سفر ہے۔

*

ہندوستان یہ نہیں چاہتا کہ جب کام خوب زوروں میں ہو رہا ہو تو اسی کے درمیان میں دفعتاً اسے روکدیا جائے۔۔۔۔ اس لئے ہندوستان میں دنیاوی زندگی کی جو تقسیم کی گئی تھی اس میں کام بیچ میں آتا تھا۔ اور آزادی خاتمہ پر۔۔۔۔ سب سے پہلے برہمچار یعنی تعلیم کا زمانہ آتا ہے۔ اس کے بعد گرہست یعنی دنیاوی کام کا زمانہ، پھر دان پرستھ یعنی علایق کو توڑنے کے لئے دنیا سے علحدگی، اور سب سے آخر میں پروراجیہ یعنی موت کے ذریعہ آزادی کا متوقعانہ انتظار

آج کل ہم زندگی کو سمجھتے ہیں کہ موت سے جنگ کا نام ہے جو مداخلت بیجا کرنے والی دشمن ہو۔ نہ کہ فطری خاتمہ۔ اسی سے بے معنی و بے اثر مقابلہ میں ہم زندگی کے تمام منازل قطع کرتے ہیں۔ جوانی کے جانے کا زمانہ آتا ہے تو اسے جبریہ روکنا تھامنا چاہتے ہیں، خواہشات کی تیزی کم ہونے لگتی ہے تو طرح طرح کے ایندھن تجویز کرکے ہم انکی آگ کو بھڑکانا چاہتے ہیں حواس کمزور ہونے لگتے ہیں تو انہیں اکسایا جاتا ہے کہ اپنا کام کئے جاؤ۔ گرفت کمزور پڑ جاتی ہے لیکن ہم قبضہ چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔

ہم زندگی کی صبح اور اس کی دوپہر کے علاوہ اور سب حصوں کو نظرانداز کردیتے ہیں اور جب ہمیں اس کی سہ پہر اور شام سے واسطہ پڑتا ہے تو یا تو ہم بغاوت کرتے ہیں یا دل چھوڑ دیتے ہیں اور اس لئے ان سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ ہم ناگزیر کو فطری تسلیم کرنا نہیں سیکھتے اور اس لئے خوش سلیقگی کے ساتھ اسے نہیں چھوڑ سکتے جو بہرحال ہاتھ سے

جانے والا ہے حقیقت ہمارے پاس فاتح کی حیثیت سے اسی لئے آتی ہے کہ ہم نے مہمان کی طرح اس کو بلانا چھوڑ دیا ہے۔

* * *

روح کی ترقی کے زینے یہ ہیں: فرد سے برادری، برادری سے کائنات، کائنات سے لامکاں!

ہمارے رشیوں نے اسی ترقی کی آخری منزل پیش نظر رکھ کر زندگی کی پہلی منزل میں محض کتابوں کا پڑھنا اور اشیاء کا پہچاننا نہیں رکھا بلکہ برہمچاریعنی ضبط نفس کے ساتھ رہنا تاکہ مضبوط سیرت کو لذت کا حصول اور اسکا ترک دونوں آسان معلوم ہوں . . . . تعلیم کے بعد دنیا کے کاموں کا زمانہ آتا ہے۔ منو نے کہا ہے کہ اس حالت میں ضبط نفس حاصل کرنا اتنا آسان نہیں اگر ہم دنیا سے بالکل بے تعلق ہوں جتنا کہ دانشمندی کے ساتھ دنیاداری میں . . . . جب زندگی کی دوسری منزل یوں ختم ہو جائے اور قوی میں انحطاط شروع ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ اب اسکا فطری خاتمہ قریب ہے۔ اس پر اس شخص کی طرح رنجیدہ نہ ہونا چاہئے جو کسی عہدہ سے برطرف کر دیا گیا ہو اور اسے چھوڑنا نہ چاہتا ہو بلکہ اس پر اسطرح خوش ہونا چاہئے جیسے اعلیٰ مراتب و فرائض کی انجام دہی کے لئے ترقی کی نوید . . . . . یہ شام زندگی ہے۔ کام کے میدان کو چھوڑ کر سڑک پر ہو لینے کا وقت، اپنے حقیقی گھر کا رخ کرنیکا وقت جہاں امن و سکون ہمارے منتظر ہیں، زندگی کی ساری کاوش تمام تگ و دو اسی گھر کی خاطر ہے۔ یہی سب بڑائیوں کا ملجیٰ ہے۔ سب خوشیوں کا ماویٰ . . . بچہ ماں کے پیٹ سے جدا ہو کر بھی ماں کے پاس رہتا ہے اور باوجود علحدگی کے جدا نہیں ہوتا جبتک کہ اپنی نئی آزادی کو خوب سمجھ بوجھ نہ لے یہی حالت آدمی کی اس تیسری منزل میں ہوتی ہے کہ آدمی دنیا سے الگ ہوتا ہے لیکن پھر اس میں ہوتا ہے۔ وہ دنیا کو اپنی عقل و دانش کے خزانہ سے بہت کچھ دیتا ہے۔ اور خود بھی دنیا کا سہارا لیتا ہے۔ لیکن اب اسکا تعلق ویسا

گہرا نہیں رہتا جیسا کہ گرہست کا انمیں ایک نیا فصل پیدا ہو جاتا ہے۔

آخر کار ایک دن آتا ہے جب کہ یہ آزاد تعلقات بھی ختم ہو جاتے ہیں اور روح اپنے تمام بندھنوں کو کاٹ کر روح اکبر کے سامنے جا کھڑی ہوتی ہے۔ جیسے اچھی بیوی اپنے کاموں کے دوران میں ہزاروں آدمیوں اور چیزوں سے سروکار رکھتی ہے اور کام اپنے شوہر ہی کے گھر کا ہوتا ہے اور ہر ہر قدم پر اس تعلق کا اعتراف ہوتا ہے تاہم جب دن ختم ہوتا ہے تو سب کام اٹھا کر رکھ دیتی ہے، منہ ہاتھ دھوتی ہے کچھ بنتی سنورتی ہے اور خوشی خوشی اپنے خلوت کدہ میں اپنے شوہر کے پاس جاتی ہے۔ اسی طرح روح جسکا دنیاوی کام ختم ہو چکتا ہے ان محدود معاملات کو چھوڑ کر تنہا اپنے محبوب سے ملنے نکلتی ہے اور اسی کی ذات میں اپنی زندگی کی تکمیل پاتی ہے

صرف اس طریقہ سے انسان دنیا میں اپنی زندگی کو شروع سے آخر تک اس طرح گزار سکتا ہے کہ ہر ہر قدم پر موت سے کشتی نہ ہو اور جب موت آئے تو یہ نہ معلوم ہو کہ کسی فاتح دشمن نے غلبہ پا لیا۔ اسکے علاوہ اگر ہم کوئی بھی دوسرا مقصد اپنے سامنے رکھیں۔ حب وطن ہو یا حب انسانیت، اسکا نام کتنا ہی بڑا ہو لیکن وہ ہمیں آخر منزل تک نہیں پہنچاتا ہمیشہ بیچ میں چھوڑ دیتا ہے۔ یکایک کام کے دوران میں چھوڑ دیتا ہے اور ہمارے کاموں میں یہ سوال گونجا کرتا ہے کہ آخر اب کیا ؟ اب کیا ؟

اسپر ایک شبہ وارد ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ کسی ملک کے تمام باشندوں کی زندگیاں اس سانچہ میں کیسے ڈھل سکتی ہیں ؟ میرا جواب یہ ہے کہ جب ہم کوئی لیمپ جلاتے ہیں تو اسمیں نیچے سے لیکر اوپر تک آگ نہیں لگا دیتے۔ اگر بتی اوپر جل رہی ہو تو کہتے ہیں کہ لیمپ روشن ہے۔ اچھی اور نیک زندگی کا کوئی مطمح نظر ہو اسکی روشن مثالیں چوٹی ہی کے چند انسانوں میں ملتی ہیں۔ کسی ملک میں اگر چند ہی آدمی کسی بڑے تخیل کو پورا کر سکیں تو یہ بھی کل قوم کے لئے بہت بڑے فائدہ کی بات ہے۔ اگر ہندوستان میں وہ دن پھر آیا جب اسکے ممتاز اشخاص سچائی اور نیکی کو اور سب چیزوں پر فوقیت دینے لگیں تو وہ اپنی تمام قوم کی مساعی میں خاص قوت پیدا کر دینگے اور اسے ایک خاص راہ پر لگا سکینگے۔

برف سازی

قبل اس کے کہ ہم اصل مضمون کی طرف رجوع ہوں ہم حرارت کے چند خاص اصول اور کلیہ بیان کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ کیونکہ بغیر انکے اکثر ناظرین اس مضمون کو نہ سمجھ سکینگے۔

موجودہ سائنس کا دار و مدار صحیح ناپ تول پر ہے اور ہر چیز کے اوزان اور ناپ مقرر ہیں۔ چنانچہ حرارت کے بھی اوزان ہیں (حرارت کیلئے) تھرمامیٹر وہ آلہ ہے جس سے حرارت ناپی جاتی ہے۔ اور ہر شخص اس سے واقف ہے۔ ہندوستان میں فارن ہائیٹ کا رواج ہے اس میں نقطہ انجماد ۳۲ درجہ اور نقطہ جوش ۲۱۲ ف درجہ ہے۔ جس طرح انگریزی میں تمام اوزان اور ناپ بے اصول خلاف عقل اور غیر ریاضی ہیں ویسے یہ بھی ہے۔ شاید افریقہ کے وحشی اقوام کے ہی اوزان اور ناپ انگریزی اوزان سے کم ہوں ورنہ مہذب ملک میں یہ کسی طرح جگہ پانیکے قابل نہیں۔ دوسرا وزن جو ریاضی داں سائنس داں اور عقلا پسند کرتے ہیں وہ طریقہ اعشاریہ ہے یعنی ہر چیز دس سے برابر تقسیم ہو جائے اور نو پر انتہا ہو اور بعد کو دس سے ضرب کھاتی ہوئی بڑھتی جائے۔ اسی میں سنٹی گریڈ پیمانہ ہے جس میں نقطہ انجماد صفر ہے اور نقطہ جوش ۱۰۰ س ہے۔ اور پورا پیمانہ ۱۰۰ پر تقسیم ہے۔ ہندوستان میں عموماً گرمی چونکہ اسی پیمانہ سے ناپی جاتی ہے جسے انگریزوں کی حکومت یہاں ساتھ لائی ہے۔ لہذا ہم یہاں بھی اسی پیمانہ سے گفتگو کریں گے۔

یہ تو تھرمامیٹر یعنی حرارت پیما کا حال تھا۔ اب ہم کو مقدار حرارت کے لئے ایک وزن قائم کرنا چاہئے۔ اگر ایک پاؤنڈ پانی کا درجہ حرارت ۳۹ ف ہو اور ہم حرارت پہنچا کر اُسے ۴۰ ف تک گرم کر دیں تو مقدار حرارت ایک برطانی طپش اکائی ہوگی۔ اُسے B.Th.U یا ہم اُردو میں بطا کہیں گے۔ اگرچہ مضمون سے تعلق نہیں ہے مگر ناظرین کی دلچسپی کے لئے یہ بتا دیتے

ہیں کہ ایک پونڈ لکڑی میں تقریباً سات ہزار بطا ہوتے ہیں۔ پتھر کے کوئلے میں ایک پونڈ جلنے میں ۱۲ ہزار سے ۱۴ ہزار بطا تک مقدار حرارت حاصل ہو سکتی ہے۔

اس پیمانہ کے سمجھنے کے بعد اب ایک دوسرے کلیہ کی طرف توجہ کریں جس طرح ہر چیز کی ایک خصوصیت نوعی ہوتی ہے اسی طرح ہر چیز کی حرارت جذب کرنے کی قابلیت نوعی بھی الگ ہوتی ہے۔ مثلاً ہر شخص جانتا ہے کہ آگ پر سیر بھر پانی رکھا جائے اور سیر بھر لوہے کا ایک ٹکڑا اتنی ہی آگ پر دوسری طرف رکھدیا جائے تو ظاہر ہے کہ آگ کی مقدار حرارت تو برابر ہے مگر لوہا تو جلد سرخ ہو جائیگا اور اسکا درجہ حرارت کئی سو ف ہو جائے گا۔ اور پانی میں درجہ حرارت ۲۱۲ ف بڑی دیر کے بعد آئیگا۔ یہ بھی ایک عام کلیہ ہے کہ جب کوئی چیز گرم کیجاتی ہے تو اسکا جسم پھیلتا ہے۔ اور سردی سے سکڑتا ہے۔ پانی اور دھاتوں میں حجمی تغیر بہت کم ہوتا ہے جو بعض صورتوں میں محسوس نہیں ہوتا۔ پارہ زیادہ ذکی الحس ہے اسی وجہ سے اس کا تھرمامیٹر بناتے ہیں۔ مگر ہوائیں یا گیسیں بہت جلد گرمی اور سردی سے متاثر ہو سکتی ہیں، چنانچہ گرمی سے انکے جسم پھیلنے کی کوئی انتہا نہیں۔ ایک مکعب انچ لوہے کو اگر گرم کیا جائیگا انچ کا ناقابل حس ادھر ادھر بڑھیگا مگر ایک مکعب انچ ہوا کو گرم کرتے کرتے آپ تمام عالم میں پھیلا سکتے ہیں۔ اور اسی طرح تمام عالم کی ہوا کو سردی سے جما کر ایک مکعب انچ میں مقید کر سکتے ہیں بشرطیکہ آپ کے پاس اتنی سردی اور گرمی پہنچانے کے ذرائع ہوں۔ اس کلیہ سے ایک نتیجہ اور نکلا کہ اگر ہوا کو مقید کرکے گرم کریں تو اس کی کوشش تو پھیلنے کی ہوگی جس کے نتیجہ میں اس ظرف کے اطراف پر جس میں وہ مقید ہے۔ اس کا پھیلاؤ کا اثر پڑے گا۔ اور خود کوشش کرے گی کہ اس ظرف کو توڑ دے۔ یہی اصول ہے جس کی وجہ سے توپ کا گولہ کئی میل جاتا ہے اور تیل اور گیس کے انجن چلتے ہیں۔ بارود دراصل گیسوں کی منجمد شکل کا نام ہے۔ جس وقت یہ گیسیں مشتعل ہوتی ہیں تو تھوڑی مقدار ایک دم کئی لاکھ گنا پھیلنا چاہتی ہے۔ اس کے سامنے گولا ہوتا ہے اسے پھینک دیتی ہے۔ یا متحرک اسطوانہ ہوتا ہے اسے حرکت دے دیتی ہے۔

اس کی الٹی مثال لیجیے۔ یعنی اگر سو مکعب فٹ ہوا کو ہم کسی میکانکی ذریعہ سے دباکر ایک مکعب فٹ جگہ میں قید کر دیں تو اسکا درجہ حرارت کئی سو گنا زیادہ ہو جائے گا اور یہ شعلہ کی مانند گرم ہوگی۔ چنانچہ بعض انجنوں میں صرف یہ دبی ہوئی ہوا ہوتی ہے جو کئی سو درجہ تک گرم ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے تیل مشتعل ہو کر اس انجن کو چلاتا ہے۔ فرض کیجیے ہم نے سو مکعب فٹ ہوا کو دباکر ایک مکعب فٹ جگہ میں قید کر دیا تو اسکا درجہ حرارت کئی سو بڑھ جائے گا۔ اگر اس حرارت کو ہم کسی ذریعہ سے خارج کر دیں مگر اس طرح کہ اس ایک مکعب فٹ ہوا کی مقدار کم نہ ہو اور جسامت بھی قائم رہے کہ صرف حرارت کم ہو جائے اور پھر اس ہوا کو بڑے ظرف میں چھوڑ دیا جائے کہ یہ اپنی اصلی جسامت یعنی سو مکعب فٹ میں پھیل جائے تو یہ کئی سو درجہ سرد ہوگی اور آس پاس کی حرارت کو جذب کر کے انہیں منجمد کر دے گی۔ اگر اس کے متصل پانی رکھدیا جائے گا تو وہ برف بن جائیگا کیونکہ اس کلیہ کے تحت میں کہ جب دو جسم مختلف درجہ حرارت کے متصل ہوتے ہیں تو گرم جسم سے حرارت سرد جسم میں منتقل ہو جاتی ہے اور یہ فطرتی کوشش ہوتی ہے کہ دونوں کا درجہ حرارت یکساں ہو جائے۔

یہانتک تو وہ نظریہ تھا جس سے برف سازی کے اصول ناظرین کو معلوم ہو گئے ہیں۔ بجائے ہوا کے ایسی گیس عام طور سے استعمال کیجاتی ہے جس میں معمولی درجہ حرارت ہر وقت ہو کیونکہ ہوا ۴۵۹ ف درجہ یعنی صفر سے نیچے پہنچکر منجمد ہو سکتی ہے۔ یہ صرف نظریہ ہے ایسا درجہ حرارت پہنچانا بہت مشکل ہے اور اسے حرارت مطلق کہتے ہیں۔ گلامونیا ایسی چیز ہے جو معمولی درجہ حرارت یعنی جو ہندوستان میں عام طور سے رہتی ہے مثلاً ۸۰ یا ۹۰ اس میں وہ منجمد شکل میں ہوتا ہے تھوڑی سی حرارت پہنچانے سے وہ رقیق ہو جاتا ہے اور اور تین سو بارہ درجہ پر ہوائی یا گیس کی شکل میں تبدیل ہو سکتا ہے، اس لئے اسکا استعمال نسبتہً مشین کے چلانے کے لئے آسان ہے۔ یعنی ایسا جسم جو معمولی درجہ حرارت پر ٹھوس ہو۔ ذرا سی زیادہ حرارت پر رقیق ہو اور ذرا گرم کرنے پر گیس بن جائے۔ اسے ایک بڑے ظرف میں رقیق شکل میں بھر دیا جاتا ہے، ایک

جذب کرکے اس کی موجودہ جسامت کو دباکر کئی سوگنا کم کردیتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ گیس کی شکل میں ہوکر اس کا درجہ حرارت کئی سوگنا بڑھ جاتا ہے۔ اسے اسی حالت میں لے جاکر نلکیوں کے ایسے جال میں پہنچا دیتے ہیں جس کے چاروں طرف پانی بہتا رہتا ہے جس سے حرارت تو ہوا اور پانی کے ذریعہ خارج ہو جاتی ہے اور یہ گیس تھوڑی جگہ میں قید رہتی ہی اب صرف فرق یہ رہتا ہے کہ اسکا درجہ حرارت کم ہو جاتا ہے۔ اسے ایک اور سلسلہ نالیوں کے ذریعہ ایسے حوض میں پہنچاتے ہیں جہاں اس کی جسامت پھیل کر اپنی اصلی حالت پر آجائے۔ اس حوض میں نمکین پانی ہوتا ہے۔ کم درجہ حرارت پر نمکین پانی کا درجہ حرارت معمولی پانی کے مقابلہ میں زیادہ کم ہوتا ہے۔ اس حوض کا پانی درجہ انجماد سے کئی درجہ کم ہوتا ہے۔ ایسی حوض میں ٹین کی قفلیوں میں پانی بھرا ہوتا ہے۔ وہ امونیا جو اب کم درجہ حرارت پر پھیل گیا ہی اس نے نمکین حوض کی حرارت جذب کی اور یہ جذب حرارت اسکی نوعی جذب حرارت پر منحصر ہے۔ لہذا جب نمکین حوض کی حرارت کا بڑا حصہ امونیا میں جذب ہو جائیگا تو اس کا درجہ حرارت انجماد سے کم ہو جائے گا یہ اس پانی کی قفلی کی حرارت کو جذب کریگا جو اس حوض میں لٹکتی ہیں جسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ پانی جو خالص اور مقطر ہوتا ہے منجمد ہوکر ایک برف کی سل بن جائیگا۔

علاوہ امونیا سے برف بنانیکے اور بہت سے طریقہ بھی ہیں۔ اور بہت سی گیسیں ہیں جن سے برف بنتی ہی۔ مثلاً کاربن گیس یا محض معمولی ہوا۔ وغیرہ۔ انکی خاص صنعتی اور اقتصادی خصوصیات ہیں جن کا ذکر عام دلچسپی کے خلاف ہی اور خاص انجنیروں کے واسطے ہی دلچسپی کا باعث ہو سکتا ہی

غزل

از جناب مصور جذبات جانشین میر و غالب مرزا ثاقب لکھنوی مدظلہ

ہو کے بے حس اور کیا پایا دل رنجور نے
روشنی اپنی اٹھا رکھی چراغ طور نے

ڈھونڈتا ہوں خون کی اک بوند لیکن اب کہاں
چھان ڈالا دل ترے ڈالے ہوئے ناسور نے

اب کہ جب کوئی تعلق ہوش سی مجھکو نہیں
میکدے کے در کو کھولا دیدۂ مخمور نے

دیکھئے تو آ کے شام ہجر کے نقش و نگار
بخت کی تصویر کھینچی ہے شب دیجور نے

المدد اے خضر میری ناتوانی دیکھ کر
کچھ زیادہ پانوں پھیلائے ہیں راہِ دور نے

عشق کی معراج تو حق تھی مگر تقدیر سے
جا کے تھوڑی دور ہمت ہار دی منصور نے

نیند کب آئی کہ وا ہوتا درِ راز و نیاز
خواب وصلت بھی نہیں دیکھا دلِ مہجور نے

کیا ہوئی وہ خنکی دل اے صباحِ شامِ وصل
آگ زخموں میں لگا دی مرہم کافور نے

زورِ سیلِ غم نہ پوچھو دیکھتے ہی دیکھتے
دیدۂ یعقوب سے بستر اٹھایا نور نے

دہر میں سنگ حوادث کی خبر دنیا ضرور
کاسۂ چینی سی باتیں کی نہیں فغفور نے

قبر کے تاریک گھر میں روشنی آنے لگی
کوئی روزن کر دیا شاید جمال حور نے

لگ نہ جائے آگ ناصوروں کی صورت میں کہیں
گھر بنایا کیوں مری دل کی طرح زنبور نے

وہ گئے دن حشر تک ثاقب پلٹ سکتے نہیں
گو بہت امید دلوائی ہے نفخ صور نے

ولہ

حسن کی ایک فصل ہے عشق کا ایک باب ہے
دیکھ چکے ہیں ہم اسے دہر نما کتاب ہی
آب عذار آتشیں دیکھ کے میری آنکھ دیکھ
ایک طرف سراب ہی دوسری سمت آب ہی
عقل حقیقت آشنا اور ہے قلب اور ہے
عشق نہیں ہی ضعف ہی حسن نہیں شباب ہی
رسم و رہِ قدیم ہے شرع صنم نئی نہیں
جس میں وفا گناہ ہی راحتِ دل عذاب ہی
طاقت دید ہو تو خیر ورنہ وصال کچھ نہیں
جلوۂ طور سے کھلا حسن خود اک نقاب ہی
اِک کفِ خاک کی بساط کیا جو ہو راہِ سیل میں
جب سے بہے ہیں اشک غم خانۂ دل خراب ہی
راہ بری نہیں سہی چل سیر میں کیا مضائقہ
سارے جہاں کو دیکھ ڈال پھر یہ سمجھ کہ خواب ہی
بیٹھا ہی دل لگائے کیوں سبزۂ باغ دہر سے
دیکھ ورق الٹ نہ جائے دفترِ انقلاب ہی
شکر گذارِ درد ہو دل کی خبر پہنچ گئی
تو جو نہیں نہیں سہی نالہ تو باریاب ہی
معترفِ کمال ہیں شعر و سخن کے جو مری
ثاقبِ خوش بیان تری ہر غزل انتخاب ہے

ماموں جان

(گذشتہ سے پیوستہ)

دوسرا ایکٹ

سربریاکف کے مکان میں کھانے کا کمرہ ۔ رات ۔ باغ سے چوکیدار کے دستک کی آواز سنائی دیتی ہے ۔ سربریاکف ایک آرام کرسی پر بیٹھا ایک کھلی کھڑکی کے سامنے اونگھ رہا ہے۔ اور یلینا اینڈریونا بھی اُس کے پاس ہی بیٹھی اونگھ رہی ہے۔

سربریاکف (چونک کر) کون ہے؟ سونیا، کیا تم ہو؟

یلینا۔ نہیں میں ہوں یلینا۔

سربریاکف۔ تم ہو..... مجھے بڑی تکلیف ہے۔

یلینا۔ کمبل فرش پر گر گیا ہے (اُسے اس کی ٹانگوں سے لپیٹتی ہے) کھڑکی بند کر دوں؟

سربریاکف۔ نہیں ہوا بند ہو جائے گی...... ابھی ابھی میری آنکھ لگ گئی اور میں نے خواب میں دیکھا کہ میری بائیں ٹانگ نہیں ملتی ہے کہیں غائب ہو گئی۔ درد کی تکلیف سے آنکھ کھل گئی۔ نہیں یہ گٹھیا نہیں یہ شاید بائی کا درد ہے۔ کیا وقت ہو گا؟

یلینا۔ بارہ بج کے بیس منٹ (ایک وقفہ)

سربریاکف۔ صبح ذرا لائبریری میں دیکھنا۔ مجھے خیال پڑتا ہے میرے پاس باتشکف کی کچھ تصنیفیں تھیں۔

یلینا۔ کیا؟

سربریاکف۔ صبح کو باتشکف کو تلاش کرنا۔ مجھے یاد ہے کہ اس کی تصانیف میری لائبریری

میں تھیں۔ لیکن مجھ سے سانس کیوں نہیں لی جاتی؟

یلنا۔ تھکے ہو۔ یہ دوسری رات ہے کہ تم نہیں سوئے۔

سربریاکف۔ میں نے سنا ہے ٹرگنیف کی پنڈلیوں میں گٹھیا کی وجہ سے ناسور پڑ گئے تھے۔ ڈرتا ہوں کہیں میرا بھی یہی حال نہ ہو۔ بڑھاپا بھی کیا تکلیف دہ زمانہ ہے۔ خدا اسے غارت کرے۔ جب سے ضعف غالب آیا ہے خود سے نفرت کرنے لگا ہوں اور تم سب کو میری صورت سے نفرت ہوا چاہتی ہے

یلنا۔ تم تو بڑھاپے کا ذکر یوں کرتے ہو جیسے ہم سب نے ہی تمہیں اس بلا میں مبتلا کیا۔

سربریاکف۔ سب سے زیادہ نفرت تم کرتی ہو۔

(یلنا اینڈریونا اٹھتی ہے اور دور جا کر بیٹھ جاتی ہے)

سربریاکف۔ ہاں ہاں اس میں تمہارا کیا قصور ہے۔ میں بیوقوف نہیں ہوں۔ میں سمجھتا ہوں تم جوان، قوی اور حسین ہو۔ تم زندگی چاہتی ہو اور میں بڈھا ہوں، ایک لاش سے بدتر۔ تم جانتی ہو میں کچھ نہیں سمجھتا؟ اور بیشک میرا زندہ رہے جانا حماقت ہے۔ کچھ ہی دن کا جھگڑا اور ہے۔

یلنا۔ میں تنگ آ گئی . . . . . خدا کے لئے یہ باتیں نہ کرو۔

سربریاکف۔ مجھ سے تو سبھی تنگ آ گئے ہیں۔ ہر شخص پریشان، خستہ حال اور مجروح ہے اور اپنی جوانی ضائع کر رہا ہے۔ میں ہی صرف ایک ہوں جو زندگی کا لطف اٹھا رہا ہوں اور مطمئن ہوں . . . . . بے شک!

یلنا۔ چپ رہو کیوں دل دکھانے کی باتیں کرتے ہو؟

سربریاکف۔ میں سبھی کا دل دکھاتا ہوں۔ بیشک۔

یلنا۔ (آنسو بھر لا کے) افسوس افسوس . . . . آخر مجھ سے کیا چاہتے ہو؟

سربریاکف۔ کچھ نہیں۔

یلنا۔ اچھا تو اس دل آزار تذکرے سے کیا حاصل۔ میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں۔

سربریاکف۔ یہ عجیب بات ہے۔ وائنٹسکی آئوان پیٹرووچ بولے اور وہ بڑھیا ماریا بولے تو کچھ نہیں ہر شخص خوشی سے سنتا ہے۔ لیکن میری زبان سے ایک لفظ بھی نکلے تو لوگوں کے دل دکھتے ہیں۔ میری آواز سے سب کو نفرت ہو گئی . . . . مانا میں برا ہوں، ناکارہ، مصیبت زدہ قابل نفرت تو کیا اس بڑھاپے میں مجھے یہ حق نہیں کہ اپنا خیال کروں؟ کیا میں نے اسے کمایا نہیں۔ زندگی اور جوانی کو کھو کر اسے حاصل نہیں کیا ہے؟ میں تم سے پوچھتا ہوں کیا مجھے یہ حق نہیں ہے کہ خاموشی اور سکون کے ساتھ تم لوگوں کی مدد کے بھروسہ اپنی زندگی کے باقی دن گزاروں؟

یلنا۔ آپ کے حقوق سے کون اختلاف کر رہا ہے (کھڑکی کا پٹ ہوا کے زور سے بند ہو جاتا ہے) ہوا چل رہی ہے کھڑکی بند کر دوں (کھڑکی بند کر دیتی ہے) معلوم ہوتا ہے پانی برسے گا۔ تمہارے حقوق سے کون بحث کرتا ہے۔

سربریاکف۔ اپنی تمام زندگی ایک طالب علم کی طرح گزار کر اپنے کتب خانہ اور لکچر کے کمروں کا عادی ہو کر باعزت اور تعلیم یافتہ احباب کی صحبت میں رہ کر۔ اکدم اپنے کو اس گوردہ میں ایک کوٹھری میں محبوس پانا۔ روزانہ بیوقوف اور گنوار لوگوں کی صورتیں دیکھنا۔ جہالت کی باتیں سننا! میں زندگی چاہتا ہوں۔ زندگی، کامرانی، شہرت، عزت، امتیاز اور ہیجان — معلوم ہوتا ہے مجھے جلاوطنی کی سزا دی گئی ہے۔ ہر لمحہ ماضی پر کف افسوس ملنا۔ دوسروں کو مشہور ہوتے دیکھنا اور موت کا انتظار کرنا، کیسے اسے برداشت کروں! یہ بڑی زیادتی، ناانصافی ہے . . . . . اور پھر یہ لوگ میری ضعیفی کو قابل معافی نہیں سمجھتے۔

یلنا۔ ذرا ٹھہریے، کچھ دیر اور صبر کیجیے، پانچ یا چھ سال میں میں بھی بڈھی ہوئی جاتی ہوں۔

(سونیا داخل ہوتی ہے)

سونیا۔ ابا جان! خود ہی تو آپ نے کہا کہ ڈاکٹر استروف کو بلا بھیجو اور وہ آئے تو آپ انہیں بلاتے بھی نہیں۔ یہ اچھا نہیں ہے۔ آپ نے بیکار انہیں زحمت دی۔

سربریاکف ۔ تمہارا استروف میرے کس کام کا ہے۔ وہ دواؤں کی بابت اتنا ہی جانتا ہے جتنا میں نجوم کی بابتہ جانتا ہوں۔

سونیا۔ آپ کی گٹھیا کے لئے ہم روس کے بڑے ڈاکٹر کیسے جمع کرلیں۔

سربریاکف ۔ اُس ناکارہ سے تو بات نہ کرنا ہی اچھا ہے۔

سونیا۔ آپ کو اختیار ہے (بیٹھ جاتی ہے) میرا کوئی حرج نہیں ہے۔

سربریاکف۔ کیا وقت ہے؟

یلنا ۔ ایک کے قریب ہوگا۔

سربریاکف۔ میرا دم گھٹتا ہے . . . . . سونیا، ذرا میز سے میری دوا اُٹھانا۔

سونیا۔ ابھی لاتی ہوں (اُسے دوا دیتی ہے)

سربریاکف (جھلاکے) ارے یہ نہیں! تم لوگوں سے کسی کام کو کہنا بیکار ہے۔

سونیا۔ خفا نہ ہوجئے۔ کوئی اسے پسند کرتا ہو مگر مجھے معاف کیجئے۔ میں اسے پسند نہیں کرتی اور میرے پاس وقت نہیں ہے۔ مجھے سویرے اُٹھنا ہے۔ کل ہم گھاس کٹوا رہے ہیں

(وانٹسکی ایک ڈرسنگ گون پہنے اور ایک موم بتی ہاتھ میں لئے داخل ہوتا ہے)

وانٹسکی ۔ طوفان آرہا ہے (بجلی چمکتی ہے) یہ دیکھو! یلنا اور سونیا، تم جاکر سو رہو۔ میں یہاں ٹہرتا ہوں۔

سربریاکف (ڈرکے) نہیں نہیں مجھے اس پر نہ چھوڑنا۔ نہیں یہ باتیں کرکے میرا دماغ چاٹ جائے گا۔

وانٹسکی ۔ لیکن آخر تم انہیں آرام بھی کرنے دوگے یا نہیں؟ یہ دوسری رات ہے کہ وہ نہیں سوئی ہیں۔

سربریاکف۔ دونوں جاسکتی ہیں اور تم بھی جاؤ۔ تمہارا بڑا احسان مانوں گا۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں یہاں سے چلے جاؤ۔ پچھلی دوستی اور محبت کا واسطہ مجھے چھوڑ دو، ہم پھر باتیں

کریں گے۔

وائنٹسکی۔ (اُس کی نقل کرکے) پچھلی دوستی اور محبت . . . . پچھلی دوستی . . . .

سونیا۔ میرے ماموں جان خدا کے لئے۔

سربریاکف۔ (اپنی بیوی سے) میری پیاری! مجھے اس کے ساتھ چھوڑ کے جاتی ہو۔ یہ باتیں کرکے میرا دماغ خالی کردے گا

وائنٹسکی۔ اس بڈھے کی عقل ماری گئی ہے۔

(مارنیا ایک موم بتی لئے آتی ہے)

سونیا۔ انا جانی۔ تم جاکے سو رہو۔ بہت رات آئی۔

مارنیا۔ ابھی سماوار نہیں صاف ہوا ہے۔ کوئی کیسے سو سکتا ہے

سربریاکف۔ کوئی نہیں سو سکتا، سبھی کو جاگنا پڑ رہا ہے۔ میں ہی عیش سے زندگی گزار رہا ہوں

مارنیا۔ (سربریاکف کے پاس جاکر پیار سے) میرے لال۔ میرے میاں! خفا نہ ہو کیا بہت درد ہے؟ میری ٹانگوں میں بھی درد ہے، بہت درد ہے (کمبل بیٹھتی ہے) تمہیں برسوں سے یہ شکایت ہے۔ ویرا پٹرودنا، سونیا کی ماں رات رات بھر تمہارے لئے مضطرب اور سراسیمہ رہتی تھی۔ وہ تمہیں کیسا چاہتی تھی! (ایک وقفہ) بڈھے اور بچے برابر ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ کوئی انکے لئے رنجیدہ ہو مگر بڈھوں کا کوئی خیال نہیں کرتا (سربریاکف کے شانہ پر بوسہ دیتی ہے) لیٹ جاؤں میاں . . . . (چمکار کے) پیارے میاں۔ آئیے . . . . میں آپ کو تھوڑی سی چائے پلاتی ہوں اور آپ کے پیر گرم کرونگی . . . . اور دعا کرونگی۔ . . .

سربریاکف (متاثر ہوکے) ہاں مارنیا!

مارنیا۔ میری پنڈلیوں اور گھٹنوں میں بھی درد ہو رہا ہے۔ بہت درد ہے (سونیا اور وہ اُسے سہارا دے کر چلتے ہیں) ویرا پٹرودنا رویا کرتی تھی اور تمہاری خاطر اپنا دل کڑھاتی تھی . . . . .

سونیا۔ تم اس وقت چھوٹی سی تھیں اور تمہیں کچھ سمجھ نہ تھی ۔ ۔ ۔ ۔ آؤ ۔ ۔ ۔ چلے آؤ میرے لال ۔ ۔

(سریریاکف، سونیا اور ماریناباہر جاتے ہیں)

یلنا۔ میں اس سے بالکل تنگ آگئی ہوں۔ مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جاتا۔

وائنٹسکی۔ تم اس سے اور میں اپنی زندگی سے تنگ ہوں یہ تیسری رات ہے کہ میں نہیں سویا۔

یلنا۔ اس گھر میں رہتے مجھے ڈر لگتا ہے۔ تمہاری اماں یا رسالے پڑھتی ہیں یا پروفیسر سے محبت کرتی ہیں۔ پروفیسر کو ہر وقت غصہ آتا ہے۔ اسے مجھ پر اعتبار نہیں اور وہ تم سے ڈرتا ہے سونیا اپنے باپ سے اور مجھ سے خفا ہے اور دو ہفتہ سے مجھ سے نہیں بولی۔ تم میرے شوہر سے نفرت کرتے ہو اور اپنی اماں سے کھلی لڑائی لڑتے ہو۔ میں بدنصیب ہوں۔ خستہ حال پریشان اور آج کوئی بیس دفعہ رو چکی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ اس گھر میں رہتے مجھے ڈر لگتا ہے۔

وائنٹسکی۔ یہ اخلاقی بحث تمہاری زبان سے اچھی نہیں معلوم ہوتی۔

یلنا۔ وائنٹسکی، تم تعلیم یافتہ اور ذہین ہو اور مجھے خیال کرنا چاہئے کہ تم سمجھتے ہو کہ دنیا آگ یا ڈاکہ زنی سے نہیں تباہ ہو رہی ہے بلکہ نفرت۔ دشمنی اور ذرا ذرا سی بغاوتوں سے ۔ ۔ ۔ ۔ یہ تمہارا کام ہونا چاہئے کہ ہر ایک کو صلح پسندی سکھاؤ نہ کہ خفگی اور بیزاری۔

وائنٹسکی۔ پہلے دل کی بغاوت سے میری صلح کرا دو، اے میری جان! ۔ ۔ ۔ ۔ (جھک جاتا ہے اور اسکا ہاتھ چومتا ہے)

یلنا۔ یہ کیا! (اپنا ہاتھ چھڑا لیتی ہے) بس رہنے دیجئے!

وائنٹسکی۔ ابھی بارش ختم ہو جائے گی اور قدرت کی ہر چیز تازہ ہو جائے گی اور تازہ فضا میں آسودگی سے سانس لے گی۔ لیکن یہ طوفان میرے دل کے لئے کوئی آسودگی نہیں لایا رات دن یہ خیال کہ میری زندگی بے کار اور بے مقصد کے ضائع ہو رہی ہے مجھے ہلاک کئے ڈالتا ہے۔ یہ خیال میرے ذہن کے پردوں پر ایک بھوت کی طرح چھایا ہوا ہے۔ میرا ماضی خالی ہے وہ بیوقوفانہ فروعی اور خرد چیزوں پر ضائع ہوا اور حال اپنی بے معنویت

کے لحاظ سے اُس سے کم خطرناک نہیں ہے۔ میری زندگی اور محبت تمہارے قدموں پر نثار ہیں۔ زندگی کا میں کیا کروں؟ یہ دونوں میرے لئے بیکار ہیں۔ میری چاہت سورج کی ایک کرن ہے جو کسی اندھے کنوئیں کے منہ میں جا پڑے اور ضائع ہو۔

یلنا۔ جب تم مجھ سے اپنی محبت کا تذکرہ کرتے ہو تو میں احمقانہ تمہارا منہ تکتی ہوں میں تمہیں کیا جواب دوں.... میری سمجھ میں نہیں آتا تمہیں کیا پیش کروں۔ معاف کرو میرے پاس تم سے کچھ کہنے کو نہیں (باہر جانے کو ہوتی ہے) خدا حافظ!

وانتشکی۔ (اُسکا راستہ روک کر) اور کاش تم جانتیں کہ یہ خیال کر کے کہ میرے ساتھ ساتھ اسی گھر میں ایک اور کی بھی زندگی اور جوانی خاک میں مل رہی ہے مجھے کتنا ملال ہوتا ہے... تمہیں کیا انتظار ہے؟ کس کمبخت خیال نے تمہیں روک رکھا ہے؟ سمجھتی ہو؟ خدا را سمجھ جاؤ؟...

یلنا۔ (اُسے غور سے دیکھتی ہے) تم نے شراب پی ہے؟

وانتشکی۔ شاید، شاید!

یلنا۔ ڈاکٹر کہاں ہے؟

وانتشکی۔ اندر... آج کی رات وہ میرے مہمان ہیں ممکن ہے... کچھ ممکن ہے؟

یلنا۔ آج تم نے پھر پی کس لئے؟

وانتشکی۔ اس میں زندگی کی لہر معلوم ہوتی ہے۔ یہ حقیقت سے قریب کر دیتی ہے.... میری جان! مجھے اس سے نہ روکو۔

یلنا۔ تم کبھی نہیں پیتے تھے اور اتنی باتیں نہیں کرتے تھے... جاؤ سو جاؤ! میرے دل کو دکھانے سے کیا فائدہ؟

وانتشکی۔ (اسکے ہاتھ چومتا ہے) میری پیاری.... میری زندگی.... میری جوانی....

یلنا۔ (تنگ آ کے) ارے ارے! خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو (باہر چلی جاتی ہے)

وانتشکی۔ (تنہائی میں) گئی.... (ایک وقفہ) دس سال ہوئے میں اس سے اپنی بہن کے ہاں

ملتا تھا۔ اس وقت یہ سترہ برس کی تھی اور میں سینتیس کا تھا۔ افسوس کیوں مجھے اس وقت ہی اس سے محبت نہیں ہوگئی، اُس وقت میں نے شادی کا پیغام دیا ہوتا تو آج یہ میری ہو چکی ہوتی اُس وقت یہ کتنا آسان تھا۔ میری زندگی، میری جوانی کا بچانا اس وقت کتنا سہل ہوتا۔ .... ہاں .... یہ بارش اور یہ بجلی اور یہ طوفان ... یہ وقت ہوتا۔ ہم دونوں اس وقت جاگے ہوتے۔ وہ بجلی سے ڈر گئی ہوتی اور میں اپنے آغوش میں اسے لٹاتا اور کہتا "اے میرے چاند! میں تیرے پاس ہوں" آہ خیالات کی دنیا کیسی خوش رنگ ہے۔ کیا کیا خوشی مجھے نہ ہوتی۔ اب اس خیال سے مجھے ہنسی آتی ہے۔ لیکن خدایا! .... میں کیا بڈھا ہوں۔ وہ میرے شوق اور احتراص کو کیوں نہیں سمجھتی۔ اس کی سلیقہ کی گفتگو، اُس کے لاحاصل اخلاق، کائنات کی بربادی یا تحفظ کے لئے اس کے نظرئے۔ اب ان سے مجھے کیا کام۔ (ایک وقفہ) ہائے مجھے کیا دھوکا دیا گیا۔ اس پروفیسر میں جان دیتا تھا۔ اس مریض کی خاطر میں نے دن و رات بیل کی طرح کام کیا۔ سونیا اور میں دن دن بھر آرام نہیں کرتے تھے۔ اس کی جائداد سے ہم نے ایک ایک پائی نچوڑی، جمع کی۔ رینڈی کے تیل، امرود اور دہی کے لئے لالچی کسانوں کی طرح ہم لڑے۔ پیٹ بھر کے ہم نے روٹی نہیں کھائی اس لئے کہ کسی طرح پیسہ جمع ہو اس طرح ہم نے ہزاروں روبل اسے یہاں سے بھیجے۔ میں اس پر اور اس کے علم و شرافت پر فخر کرتا تھا۔ وہ میری زندگی تھا۔ میرے وجود کے سانس، اُس کی تحریریں اور اس کے الفاظ معلوم ہوتے تھے کہ عطیۂ فطرت ہیں ..... خدایا! .... اور اب! وہ یہاں نوکری ختم کرکے آئے پڑا ہے اور اب اس کی زندگی کے ماحصل پر غور کرتا ہوں تو رنج ہوتا ہے۔ اپنے پیچھے وہ ایک صفحہ نہیں چھوڑے جا رہا ہے۔ ایک شخص بھی اسے نہیں جانتا۔ اُسکا وجود کیا ہے۔ صابن کا ایک بلبلہ جس سے بچے کھیلتے ہیں! میں نے فریب کھایا .... اس فریب خوردگی سے کب آگاہ ہوا ہوں جب مجھ میں سکت نہیں ہے ....

(استروف اپنا کوٹ پہنے اور ٹائی باندھے داخل ہوتا ہے۔ واسکٹ اس کے جسم

پر نہیں ہے۔ چہرے سے معلوم ہوتا ہے تھوڑی پی ہوئے ہے۔ اس کے پیچھے تلی گن ستار لئے آتا ہے)

استروف۔ ستار پر کچھ بجاؤ!

تلی گن۔ سب سو رہے ہیں۔

استروف۔ بجاؤ!

(تلی گن آہستہ آہستہ تاروں کو چھیڑتا ہے)

استروف۔ (وائنشکی سے) اکیلے ہو؟ عورتوں میں سے کوئی نہیں ہے؟ (اپنی کہنی کھڑکی میں ٹیک کر آہستہ آہستہ گاتا ہے) بارش اور بجلی کے طوفان نے مجھے بیدار کر دیا۔ خوب پانی برسا۔۔۔۔ کیا بجا ہو گا؟

وائنشکی۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

استروف۔ مجھے خیال ہوتا ہے ابھی میں نے ییلنا اینڈریونا کی آواز سنی تھی۔

وائنشکی۔ ایک منٹ گذرا وہ یہیں تھی۔

استروف۔ کیا عورت ہی (میز پر دواؤں کی شیشیوں کو دیکھتا ہے) دوائیں! کتنے نسخے ہیں۔ ہارکو سے ایک، ماسکو سے ایک، ٹیولا سے ایک، ریٔ گٹھیا سے اس نے ہر شہر کو پریشان کر رکھا ہے۔۔۔۔۔ بیمار بھی ہے یا بنتا ہے؟

وائنشکی۔ بیمار ہے۔ (ایک وقفہ)

استروف۔ آج تم اس قدر اداس اور بدمزہ کیوں ہو؟ پروفیسر کی وجہ سے رنجیدہ ہو۔

وائنشکی۔ مجھے تنہا چھوڑ دو۔

استروف۔ یا شاید اس کی بیوی سے محبت ہو گئی ہے؟

وائنشکی۔ وہ میرے ایک عزیز دوست کے برابر ہے۔

استروف۔ اوہو!۔۔۔۔ اتنی جلدی؟

وانشکی۔ اوہو! ..... اتنی جلدی سے تمہارا کیا مطلب ہے؟

استروف۔ عورت ایک عزیز دوست کی برابر اس ترتیب مدارج سے ہوتی ہے، پہلے شناسائی پھر دوستی۔ پھر عزیز دوستی .....

وانشکی۔ عجیب مہمل نظریہ ہے۔

استروف۔ کیا؟ ..... ہاں ہاں میں اقبال کرتا ہوں کہ میرے بیان میں اب مہملیت کافی ہونے لگی ہے۔ تم دیکھتے ہو اس وقت میں شراب بھی تو پیئے ہوں۔ اصولاً میں مہینہ میں ایک مرتبہ ایسی مدہوشی کا قائل ہوں جب اس حالت میں ہوتا ہوں تو میں بے انتہا غیر مہذب اور لایعنی باتیں کرنے لگتا ہوں۔ ایسی حالت میں ایک ہی چیز کا ہوکر میں نہیں رہ سکتا۔ ذہن میں نہ معلوم کتنے خیالات آتے ہیں۔ مشکل سے مشکل آپریشن ایسے وقت میں نے کئے اور کامیابی حاصل کی۔ مستقبل کے لئے بڑی امید افزا تدابیر سوچی ہیں۔ ایسے وقت میں اپنے کو پاگل نہیں سمجھتا ہوں بلکہ مجھے محسوس ہونے لگتا ہے کہ میں انسانیت کے لئے ایک برکت ہوں۔ بڑی! اور ایسے وقت میں اپنا ایک علیحدہ فلسفہ تخلیق کرتا ہوں اور تم لوگ اے میرے دوستو، مجھے ننھے ننھے جاندار کیڑے ..... مکوڑے معلوم ہوتے ہو! (تلی گن سے) ارے بھائی کچھ سناؤ!

تلی گن۔ جناب والا۔ آپ کے لئے ہر کام خوشی سے کرسکتا ہوں مگر سمجھ لیجئے، سب سو رہے ہیں!

استروف۔ کچھ سناؤ!

(تلی گن آہستہ آہستہ ستار بجاتا ہے)

استروف۔ شراب کہاں ہے۔ میرا خیال ہے تھوڑی برانڈی ابھی باقی ہے۔ صبح ہوتے ہوتے ہم اپنے اپنے گھر چلے جائیں گے۔ کیوں نہ؟ میرا ایک اسسٹنٹ ہے جو "کیوں نہ؟" کو "کونا؟" کہتا ہے۔ عجب خبیث ہے! تو ہم چلے جائیں گے کیوں؟ (سونیا کو آتے دیکھتا ہے) معاف کرنا میں پورے لباس میں نہیں ہوں (جلدی سے نکل جاتا ہے اس کے پیچھے تلی گن جاتا ہے)

سونیا۔ ماموں جان! ڈاکٹر کے ساتھ تم پھر شراب پینے لگے۔ دونوں کا خوب جوڑ ہے۔ وہ تو ہمیشہ

سے پیتے ہیں آپ کو کیا ہوگیا۔ اس عمر میں شراب کا کوئی تک نہیں ہے۔

وائنٹسکی۔ عمر سے کوئی فرق نہیں پڑتا جب ایک شخص کو اصلی، حقیقی زندگی نہ نصیب ہو تو وہ خیالی زندگی گزارنے پر مجبور ہے بیکار پڑے رہنے سے تو شراب پینا بہر حال اچھا ہے۔

سونیا۔ کھیت کٹے پڑے ہیں۔ روزانہ پانی برستا ہے۔ ہمیں نقصان کا اندیشہ ہے اور آپ خیالی زندگی گزار رہے ہیں۔ آپ اب کسی کام میں ہاتھ نہیں لگاتے ... مجھے اکیلے ہی کام کرنا پڑتا ہے اور میں تو اب کام سے تنگ آگئی (چونک کر) ماموں جان! آپکی آنکھ میں آنسو ہے

وائنٹسکی۔ آنسو نہیں ..... سچ کہتا ہوں آنسو نہیں ... تم نے اس وقت مجھے بالکل اپنی مرحوم ماں کی طرح سے دیکھا۔ میری بیٹی۔ پیاری ... (شفقت سے اس کے ہاتھوں اور چہرے کو چومتا ہے) میری بہن ... پیاری بہن .... وہ اب کہاں ہے؟ کاش وہ دیکھتی۔ کاش وہ ہوتی!

سونیا۔ کیا دیکھتیں ماموں جان!

وائنٹسکی۔ آہ! ... مجھ سے ضبط نہیں ہوتا کیوں تم نے یاد دلایا ... افسوس ... کچھ نہیں .... جاتا ہوں (نکل جاتا ہے)

سونیا۔ (دروازے پر دستک دیتی ہے) ڈاکٹر میہائل استروف! آپ ابھی سوئے نہیں ایک منٹ!

استروف۔ (دروازے کے اندر سے) آتا ہوں (ایک منٹ بعد واسکٹ پہن کر اور ٹائی باندھ کر آتا ہے) کہو۔

سونیا۔ خدارا، آپ کو موافق آتی ہے تو شراب شوق سے پیجئے مگر ماموں جان کو معاف ہی رکھئے۔ یہ انکے لئے برا ہے۔

استروف۔ ہاں ہاں اب ہم نہیں پئیں گے (ایک وقفہ) مجھے جانا ہے۔ گھوڑے کستے کستے صبح ہوجائے گی۔

سونیا- پانی برس رہا ہے صبح تک ٹھہر جائے۔

استروف- پانی ختم ہوا جاتا ہے۔ پانی ختم ہونے میں کیا دیر لگتی ہے۔ میں جاتا ہوں اور اب براہ مہربانی اپنے ابا جان کے لئے مجھے نہ بلائے گا۔ میں اُن سے کہتا ہوں یہ گٹھیا ہے وہ کہتے ہیں نہیں۔ میں اُن سے بستر پر پڑے رہنے کو کہتا ہوں وہ کرسی پر بیٹھتے ہیں اور آج وہ مجھ سے بولے ہی نہیں۔

سونیا- بیماری نے اُنکا مزاج بگاڑ دیا ہے (سائڈبورڈ کی طرف دیکھ کے) آپ کچھ کھائیں گے؟

استروف- کیا۔

سونیا- مجھے رات میں کھانا پسند ہے میرا خیال ہے سائڈبورڈ میں ضرور کچھ ہوگا ... لوگ کہتے ہیں، عورتوں میں ابا جان کو بڑی مقبولیت تھی۔ عورتوں نے اُنہیں خراب کیا ہے....

(دونوں سائڈبورڈ کے پاس کھڑے کھاتے ہیں)

استروف- دن بھر کچھ کھانے کو نہیں ملا، شراب ہی پر گزری۔ تمہارے باپ نے عجب مزاج پایا ہے (ایک بوتل اٹھاتا ہے) پیوں؟ کیا کہتی ہو؟ (ایک گلاس پیتا ہے) یہاں کوئی نہیں ہے اور ہم آزاد ہو کر باتیں کر سکتے ہیں۔ میں ایک مہینہ مسلسل تمہارے ہاں ٹھہر نہیں سکتا۔ اس فضا سے میرا دم گھٹتا ہے.... تمہارے ابا جان کے پاس گٹھیا ہے یا کتابیں۔ ماموں جان کو غموں سے فرصت نہیں ملتی۔ تمہاری نانا اور سوتیلی ماں.....

سونیا- ہاں میری سوتیلی ماں کو کیا کہتے ہو؟

استروف- حسن انسان کی بہترین صفت ہے۔ ہر چیز میں، چہرہ حسن، لباس، خیالات اور روح ہر چیز میں وہ حسین ہے اس سے انکار نہیں ہو سکتا مگر.... جانتی ہو انہیں کھانے ہونے گھومنے اور حسن سے سب کو تسخیر کرنے کے سوا کچھ نہیں آتا... جھوٹ کہتا ہوں؟ پھر ایسی بے معنی اور کاہل زندگی بے داغ نہیں رہ سکتی (ایک وقفہ) لیکن شاید میں بہت سختی سے انہیں جانچ رہا ہوں۔ میں ماموں جان کی طرح زندگی سے تنگ ہوں اور ہم دونوں چڑچڑے ہوتے

جلتے ہیں۔

سونیا۔ تو آپ زندگی سے تنگ ہیں۔

استروف۔ میں تو زندگی کو ایک بڑی قیمتی چیز سمجھتا ہوں، زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ مگر ہماری قصباتی زندگی اس سے میں بیزار ہوں۔ میرا بال بال اس زندگی سے متنفر ہے۔ رہی میری اپنی زندگی سو یقین کرو اسکا کوئی روشن پہلو نہیں۔ ایک تاریک رات میں کسی جنگل سے گزرو اور دور سے ایک روشنی نہیں دکھائی دے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر تمہیں کیا نظر آتا ہے۔ نہ اپنی سراسیگی نہ خود تاریکی اور نہ وہ چھوٹے چھوٹے خاردار پودے یا جھاڑیاں جن کے کانٹوں سے تمہارا دامن الجھتا ہے یا جو تمہارے چہرے کو نوچتے ہیں اور تمہارے رخساروں پر طمانچہ مارتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں اس قدر کام کرتا ہوں۔ ضلع بھر میں مجھ سے زیادہ کام کوئی کرنے والا نہیں۔ قسمت ہمیشہ طمانچہ مارتی ہے۔ میں انتہائی تکلیفیں، اذیتیں اُٹھاتا ہوں مجھے دور سے کوئی روشنی دکھائی نہیں دیتی۔ مجھے اپنی کوئی امید نہیں۔ اپنے دوستوں سے محبت نہیں۔ برسیں گزر گئیں میں نے کسی سے محبت نہیں کی۔

سونیا۔ آپ کو کسی سے محبت نہیں؟

استروف۔ کسی سے نہیں مجھے کسی قدر انس انا جانی سے ہے۔ پچھلے دنوں کی یاد میں بس! کسان سب بالکل یکساں ہیں، غیر مہذب خاک اور کوڑے میں پڑے اپنی زندگی گذارتے ہیں اُن سے نباہ مشکل ہے، اور تعلیم یافتہ طبقہ یہ ان سے بھی گیا گزرا ہے۔ کسی سے نباہ نہیں ہوسکتا۔ سب تکلیف دہ ہیں، یہ بڑے بڑے لوگ بڑے تنگ نظر ہیں انکے خیالات میں، احساسات میں وسعت اور گہرائی نہیں۔ اپنی ناک سے آگے نہیں دیکھ سکتے۔ یعنی صاف صاف یہ کہ وہ بے وقوف ہیں۔ وہ جوان سے بڑے ہیں وہ فلسفہ اور تجربہ اور معلومات کے زور میں خشک ہو کے رہ گئے ہیں ۔ ۔ ۔ ہمیشہ ترش رو، خشک اور بدمزاج۔ وہ انسان کو بزعم خود صرف ایک زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس کی تہ کو وہ پہنچ گئے۔ اور اپنی رائے قائم

کرلیتے ہیں جسے چاہا کہدیا۔ "یہ بناوٹ ہے" اور جب انھوں نے دیکھا کہ مجھ پر کوئی الزام نہیں رکھ سکتے تو کہنے لگے "ڈاکٹر عجیب وغریب آدمی ہے۔ اس کی تہ کو سمجھنا مشکل ہے" "مجھو درختوں کی پرورش کا شوق ہے۔ یہ مجوبیت ہے۔ میں گوشت نہیں کھاتا۔ یہ مجوبیت ہے۔ انکے پاس کوئی سنجیدہ، آزاد، بے لاگ طریقہ انسان اور قدرت کے مطالعہ کے لئے باقی نہیں رہا ہے... کوئی طریقہ نہیں، کوئی نہیں (پینا چاہتا ہے)

سونیا۔ (اُسے روکتی ہے) نہیں نہیں میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں یہ نہ کرو۔

استروف۔ کیوں!

سونیا۔ یہ آپ کو زیب نہیں دیتا۔ آپ اس قدر مہذب ہیں اور آپ کی آواز اس قدر شیریں ہے ..... اور اس سے بڑھ کے یہ کہ تمام لوگوں سے جنہیں میں جانتی ہوں آپ مختلف ہیں... آپ حسین ہیں۔ پھر معمولی اور عام انسانوں کی طرح شراب پینا اور تاش کھیلنا آپ کو کیسے زیبا ہے؟ ارے خدارا ایسا نہ کرو۔ میں خوشامد کرتی ہوں۔ آپ ہمیشہ کہتے ہیں انسان پیدا نہیں کرتا بلکہ جو کچھ قدرت نے اسے دیا ہے اُسے بھی ضائع کئے دیتا ہے۔ اے میرے ڈاکٹر! پھر آپ کیوں اپنے کو ضائع کرتے ہیں۔ نہیں نہیں، میں ہاتھ جوڑتی ہوں، شراب نہ پیو!

استروف۔ (اپنا ہاتھ اس طرف بڑھاتا ہے اور اس کے سر پر رکھتا) اب سے نہ پیوں گا۔

سونیا۔ قسم کھاؤ

استروف۔ اپنی عزت کی قسم کھاتا ہوں۔

سونیا۔ (اُس کا ہاتھ گرم جوشی سے دباتی ہے) شکریہ!

استروف۔ بس! اب میں اپنے ہوش میں ہوں۔ دیکھتی ہو میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ عمر بھر یوں ہی رہوں گا۔ (گھڑی کی طرف دیکھتا ہے) اور ہاں میں ابھی کہہ رہا تھا میرا زمانہ گذر گیا۔ میری صبح جوانی کی شام ہونے آئی . . . بوڑھا ہو چلا۔ میں نے بڑی محنتیں کیں۔ اب مجھ میں کیا دھرا ہے۔ میں بالکل دلچسپ نہیں رہا۔ میری تمام قوتیں مر گئیں۔ میرا احساس منجمد ہو گیا

اور میں سمجھتا ہوں میں اس قابل نہیں رہا کہ میں کسی طرف مائل ہوں مجھے کسی سے محبت نہیں ...... اور میں یقین نہیں کرتا کبھی کسی سے محبت ہو گی۔ حسن سے متاثر اب بھی ہوتا ہوں مگر اب جوش اور ولولے نہیں ہیں ... مگر ... ملینا اینڈریونا اگر مجھے چاہے تو اب بھی مجھ میں دیوانگی پیدا کردے .... لیکن یہ محبت ہے چاہت نہیں ہے ..... (اپنا چہرا اپنے ہاتھوں سے چھپا لیتا ہے اور کانپتا ہے)

سونیا۔ تم یہ کیا ہے؟

استروف۔ کچھ نہیں ... منٹ میں میرا ایک مریض کلوروفارم سونگھ کر مر گیا۔

سونیا۔ اوہو! ابھی تک بھولے نہیں ... (ایک وقفہ) ایک بات کہوں میہائل استروف ... اگر میری کوئی سہیلی ہو یا چھوٹی بہن اور تمہیں معلوم ہو کہ وہ ... یعنی فرض کرو وہ تمہیں چاہنے لگے تو تم کیا کروگے؟

استروف (شانے ہلائے) خدا جانے کیا کروں ... کچھ نہ کروں۔ بس اسے بتا دوں کہ مجھ سے محبت کرنا بیکار ہے، میں اُسے نہیں چاہتا اور کیا ... میرا ذہن میرا خیال دوسرے کام کے لئے ہی۔ خیر اگر مجھے چلنا ہی تو بس اب باتیں ختم کرنا چاہئیں۔ خدا حافظ! میری پیاری خاتون! یہ باتیں صبح تک ختم نہیں ہو سکتیں (اس کا ہاتھ دباتا ہے) ڈرائنگ روم سے ہو کر نکل جاؤں نہیں تو شاید ماموں جان روک لیں۔ (جاتا ہے)

سونیا۔ (تنہا رہ کے) اُس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا ..... اس کی روح اور اس کا دل اب تک میری طرف سے بے تعلق ہیں۔ لیکن میں اس قدر خوش کیوں؟ (خوشی سے ہنستی ہی) میں نے اُس سے کہا تم مہذب اور تعلیم یافتہ ہو اور تمہاری آواز شیریں ہے .... کیا بیجا کہا؟ اُس کی آواز میں لوچ ہے اور دل کو مرغوب ہوتی ہے .. وہ آواز اب تک مجھے ہوا میں گونجتی سنائی دیتی ہے۔ اور میں نے اس سے ایک سہیلی، ایک چھوٹی بہن کی بابتہ کہا مگر وہ نہیں سمجھا (اپنے ہاتھ ہوا میں دراز کر کے) آہ! بڑے افسوس کی بات ہی۔ میں حسین

نہیں ہوں۔ کس قدر افسوس ہے . . . . پچھلے اتوار کو گرجا گھر سے واپسی کے وقت لوگ مجھے دیکھکر کہہ رہے تھے "بڑی نیک، نرم دل، شریف لڑکی ہے۔ مگر افسوس حسن نہیں ہے . . ."

(یلینا اینڈریونا داخل ہوتی ہے)

یلینا۔ (کھڑکی کھولتی ہے) طوفان گذر گیا . . . . ہوا ٹھنڈی ہے! (ایک وقفہ) ڈاکٹر کہاں ہے؟

سونیا۔ وہ گئے۔ (ایک وقفہ)

یلینا۔ صوفی پیاری!

سونیا۔ جی!

یلینا۔ میری جان کب تک مجھ سے خفا رہو گی؟ آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ کب تک دشمن رہو گی؟ آؤ صلح کر لیں . . . .

سونیا۔ میں خود یہ چاہتی تھی (اُس سے گلے ملتی ہے) اب ہم میں پھر کبھی لڑائی نہ ہو گی

یلینا۔ بیشک! (دونوں گرمجوشی سے ایک دوسرے کو بھینچتی ہیں)

سونیا۔ ابا جان سو گئے؟

یلینا۔ نہیں ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں . . . . مجھ سے تم سے ایک ہفتہ سے بول چال نہیں نہ جانے کیوں . . . . (سائڈ بورڈ کو کھلا دیکھکر) یہ کیا؟

سونیا۔ میخائل نے تھوڑا کھانا کھایا ہے۔

یلینا۔ شراب ہے؟ . . . . آؤ جام صحت نوش کریں۔

سونیا۔ ہاں آؤ!

یلینا۔ ایک ہی گلاس میں دونوں پئیں . . . . (اُسے بھرتی ہے) یہ ٹھیک ہے تو اب ہم دونوں میں پکی دوستی ہے؟

سونیا۔ پکی! (دونوں پیتی ہیں اور ایک دوسرے کو چومتی ہیں) نہ معلوم کب سے میل کرنے کو تھی مگر مجھے کچھ جھجک آتی تھی . . . . (رو پڑتی ہے)

یلنا۔ کیوں؟ کیوں، صوفی جانی!

سونیا۔ کچھ نہیں۔

یلنا۔ بتاؤ تو سہی میری جان.... (روتی ہے) میں بھی عجب آدمی ہوں۔ میں بھی رو رہی ہوں... (ایک وقفہ) تم مجھ سے خفا ہو کہ تمہارا خیال ہے میں نے تمہارے ابا سے کسی لالچ کی وجہ سے شادی کرلی.... اگر تم میرا یقین کرو تو تمہیں بتاتی ہوں، قسم کھاتی ہوں میں نے محبت کی وجہ سے شادی کی، اسکی قابلیت، عزت، شہرت نے میرے دل میں گھر کیا۔ یہ حقیقی محبت نہیں تھی، مصنوعی تھی لیکن اس وقت میں خیال کرتی تھی یہ اصلی محبت ہے۔ میرا کیا قصور ہے۔ اور اس دن سے تم میری پیاری سونیا! تم اپنی شریر مشکوک نظروں سے مجھے اس جرم کی تعزیر دے رہی ہو۔

سونیا۔ صلح صلح! ان باتوں کو بھلا دو۔

یلنا۔ اس طرح نہ دیکھا کرو۔ یہ تمہیں زیب نہیں دیتا۔ تمہیں ہر شخص کا اعتبار کرنا چاہیئے۔ اگر اعتبار نہیں کرتی ہو تو زندگی بے لطف ہے (ایک وقفہ)

سونیا۔ مجھ سے دیانداری سے کہنا، ایک دوست سمجھ کے.... ابا سے خوش ہو؟

یلنا۔ نہیں!

سونیا۔ میں یہ جانتی تھی۔ اچھا ایک سوال اور۔ مجھ سے آزادانہ کہو۔ تم جوان شوہر نہیں چاہتی تھیں؟

یلنا۔ تمہاری بھی کیا بچوں کی سی باتیں ہیں۔ بے شک میں چاہتی تھی! (ہنستی ہے) اچھا اور کچھ پوچھو، یوں ہی پوچھے جاؤ.....

سونیا۔ ڈاکٹر کو چاہتی ہو؟

یلنا۔ ہاں بہت!

سونیا۔ (ہنستی ہے) میں بھی کیا پاگل ہوں! وہ چلا بھی گیا اور میں اب تک اُس کی آواز اور اُس

کی قدموں کی چاپ سن رہی ہوں اور جب میں تاریک کھڑکی پر نظر ڈالتی ہوں تو اس کا چہرہ نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ تم سے بتاؤں ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر بہت آہستہ سے کہوں گی مجھے شرم سی آتی ہے۔ میرے کمرے میں چلو وہاں بتاؤں گی مجھے بے باک تو نہیں سمجھتیں ؟ سمجھتی ہوگی۔ کہو ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھ سے کچھ ڈاکٹر کی باتیں کرو۔

یلینا۔ میں کیا باتیں کروں !

سونیا۔ کہو وہ عقل مند ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہر بات سمجھ سکتا ہے، ہر کام کر سکتا ہے۔ ۔ لوگوں کا علاج بھی کرتا ہے اور درخت بھی لگاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔

یلینا۔ علاج اور درختوں کا سوال نہیں ۔ ۔ ۔ اس میں ایک خداداد جوہر ہے۔ تم سمجھیں اسکا کیا مطلب ہے۔ بہادری، آزادیٔ خیال، وسعت نظر ۔ ۔ ۔ وہ درخت آج لگاتا ہے اور ہزار سال بعد پر نظر رکھتا ہے۔ انسان کی خوشی کے خواب دیکھتا ہے۔ ایسے لوگ کم ہیں ان سے محبت کرنا چاہئے ۔ ۔ ۔ وہ شراب پیتا ہے۔ کبھی کبھی بے عقلی کی بھی باتیں کرتا ہے۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے ؟ روس میں کوئی اہل نہیں بے داغ نہیں، ذرا خیال تو کرو ڈاکٹر کی زندگی کیسی ہے۔ راستوں میں دشوار گذار ریت اور بالو، کیچڑ، کہرا۔ برف کے طوفان۔ لمبے فاصلے، جاہل گنوار کسان، چار طرف مفلسی، ناداری اور بیماری — ایسے شخص کے لئے جو ایسے ماحول میں رہے اور محنت کرے اور زندگی گذارے۔ چالیس سال کی عمر سے قبل بے داغ رہنا مشکل ہے (سونیا کو پیار کرتی ہے) میں تہ دل سے تمہاری خوشی کے لئے دعا کرتی ہوں، خوشی تمہارا حق ہے ۔ ۔ ۔ (اٹھتی ہے) مگر میں دیوانی ہوں، میرا وجود اس گھر میں اضافی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ موسیقی میں، خوشی میں، شوہر کے قریب، شوہر سے دور، تمام معاشقہ میں میرا حصہ اضافی رہا ہے۔ دراصل اگر تم غور کرو سونیا تو تمہیں معلوم ہوگا کہ میں بہت بہت رنجیدہ ہوں۔ غم مجھے کھا رہا ہے (اسٹیج پر ادھر سے ادھر اک انتشار کے ساتھ ٹہلتی ہے) اس دنیا میں میرے لئے کچھ، خوشی نہیں ہے ! کیوں ہنس رہی ہو ؟

سونیا۔ (اپنا چہرہ چھپا کر ہنستی ہے) میں کتنی خوش ہوں . . . کتنی!

ملینا۔ نغمے کو جی چاہتا ہے؟ کچھ بجاؤں؟

سونیا۔ ضرور! ضرور! (اُسے گلے لگاتی ہے) مجھے نیند آ رہی ہے۔

ملینا۔ تمہارے ابا سوئے نہیں ہیں۔ جب بیمار ہوتے ہیں تو گانے بجانے سے خفا ہوتے ہیں جاؤ اُن سے پوچھ آؤ۔ اگر انہیں اعتراض نہ ہو تو کچھ سناؤں گی۔

سونیا۔ اچھا! (جاتی ہے)

(چوکیدار باغ میں دستک دیتا ہے)

ملینا۔ مدت ہوئی پیانو کو ہاتھ سے چھوا نہیں۔ آج بجاؤں گی اور چیخوں گی۔ پاگلوں کی طرح چیخوں گی (کھڑکی میں سے) یافم! کیا تم دستک دے رہے ہو؟

چوکیدار کی آواز۔ جی، بیگم صاحبہ!

ملینا۔ دستک نہ دو صاحب اچھے نہیں ہیں۔

چوکیدار کی آواز۔ ابھی یہاں سے چلا جاتا ہوں (آہستہ آہستہ سیٹی بجاتا ہے) اُو کتے! کتے! آؤ یہاں سے بھاگ چلیں (ایک وقفہ)

سونیا (واپس آئی) بجانے کا حکم نہیں ہے!

(پردہ) (باقی)

تنقید و تبصرہ

رسائل

عالمگیر، صوفی، مکتبہ

عالمگیر کا سالانہ نمبر لاہور کے رسائل جس تیزی کے ساتھ اپنے خاص نمبر نکالنے میں ایک دوسرے سے سبقت لیجانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ اردو دنیا کے لئے یقیناً نہایت دلچسپ ہے۔ اس وقت ہمارے پیش نظر "عالمگیر" کا سالانہ نمبر ہے جو نظم و نثر کے ۱۶۶ صفحات پر ختم ہوتا ہے اس میں چار رنگین اور چودہ سادی تصاویر بھی شامل ہیں۔ مضمون نگاروں میں خصوصاً حصہ نظم میں ملک کے ممتاز ترین شعرا کے نام نظر آتے ہیں۔ مضامین نثر میں زیادہ افسانے ہیں لیکن دیگر مضامین میں "بے نقاب نپولین" خاص توجہ کا مستحق ہے۔ قیمت سالانہ نمبر عہ چندہ سالانہ للعہ

ملنے کا پتہ بازار سید مٹھا۔ لاہور

صوفی کا عید نمبر صوفی پنجاب کا ایک بہت ہی قدیم پرچہ ہے۔ کچھ عرصہ سے اس کی ادارت کے فرائض ملک محمد اسلم خاں بی اے (کینٹب) کے سپرد کئے گئے ہیں چنانچہ آپ رسالہ کو بہتر صورت میں پیش کرنے میں برابر کوشاں ہیں۔ اسی سلسلہ میں آپنے اپریل و مئی ۲۸ء کے پرچے کو عید نمبر کے نام سے شائع کیا ہے جس میں خصوصیت سے اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ ملک کی مقتدر ہستیوں اور مشہور و معروف اہل قلم سے کچھ نہ کچھ حاصل کر کے پیش کر دیا جائے۔ قیمت سالانہ عار

پتہ۔ صوفی پنڈی بہاؤالدین۔ پنجاب

مکتبہ حیدرآباد دکن میں انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کے نام سے ایک جماعت عرصہ سے اردو کی خدمت میں مصروف ہے اور اتبک علم و ادب کے مختلف موضوعات پر چودہ دلچسپ اور مفید کتابیں شائع کر چکی ہے اب جماعت مذکور نے "مکتبہ" کے نام سے ایک ماہوار رسالہ بھی شائع

کیا ہے چنانچہ اسکا پہلا پرچہ ہمارے سامنے ہے۔ یہ پرچہ ابتدا ہی سے اپنے اعلیٰ مطمح نظر کو پیش کرتا ہے۔ اور اس کے مضامین دیکھکر ہر طرح یہ امید کیجا سکتی ہے کہ یہ ایک نہایت ہی وقیع رسالہ ثابت ہوگا۔ پہلے ہی نمبر میں "فلسفہ کا تاریخی نشو و نما" "آٹھویں صدی ہجری کی نظم و نثر اردو کا ایک نمونہ" اور "ڈاکٹر جان گل گرائسٹ" نہایت خوب مضامین ہیں اور ارکین انجمن مذکور کے اُن مقاصد کو جو انکے پیش نظر ہیں پوری طرح واضح کرتے ہیں۔ رسالہ کو دلچسپ بنانے کے لیے ایک فسانے کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ غرض کہ بحیثیت مجموعی رسالہ ہر طرح ارباب ذوق کی امداد کا مستحق ہے۔ قیمت سالانہ للعہ

ملنے کا پتہ۔ منتظم مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی۔ اسٹیشن روڈ
حیدرآباد (دکن)

کتب

ہمارے رسول، اسلامی لغت، ابن یمین، طبقات الامم، تاریخ الامت حصہ ششم

ہمارے رسول | مصنفہ خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی۔ ناشر مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۸۵ صفحات۔ قیمت آٹھ آنے

مکتبہ جامعہ سیرۃ پاک پر مختلف عمروں اور مختلف قابلیتوں کے لوگوں کے لئے ایک مفید سلسلہ شائع کر رہا ہے۔ پہلی کتاب ہمارے نبیؐ ہے جس پر کسی پچھلے پرچہ میں ریویو کیا جا چکا ہے۔ دوسری ہمارے رسولؐ۔ تیسری سرکار کا دربار اور چوتھی سیرۃ الرسول ہے ہمارے رسول ۱۱۔ ۱۲۔ اور ۱۳ برس کی عمر کے بچوں کے لئے ہے کتاب کے شروع میں خانہ کعبہ کا فوٹو ہے اور چھپائی وغیرہ بھی اچھی ہے۔

جملوں کی ترتیب میں بعض مقامات پر گنجلک ہے۔ مثلاً صفحہ ۴ پر لکھتے ہیں کہ "آپ کے دادا نے مرنے کے وقت اپنے بیٹے کو آپ کی پرورش سپرد کر دی تھی۔ آپ نے جس محبت کے ساتھ اس فرض کو ادا کیا اسکا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔" یا صفحہ ۲۲ پر "میرے بھتیجے محمدؐ! اگر تم اس کام سے دولت جمع کرنا چاہتے ہو تو ہم خود تیرے پاس اتنی دولت جمع کر کے لے آتے ہیں کہ تو مالدار ہو جائے اگر تو عزت چاہتا ہے تو ہم سب تم کو اپنا رئیس اور سردار مان لیتے ہیں" صفحہ ۲۵ پر لکھا ہے "جا اور جو دل چاہتا ہے کر، میں ہرگز تمہارا ساتھ نہ چھوڑوں گا" اسی طرح بعض دوسرے مقامات پر بھی خامیاں ہیں لیکن ان خامیوں سے کتاب کی قدر کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ اس کتاب میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس پر ایک نظر ڈالنے ہی سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ مصنف کے ذہن میں کتاب کا پورا خاکہ کتاب لکھنے سے پہلے موجود تھا۔ ہمارے رسول میں غیر ضروری باتیں بالکل نہیں۔ ہم لوگوں میں تجارت کو جو بُری نظر سے دیکھا جاتا ہے خدا کا شکر ہے کہ خواجہ صاحب نے اس کو محسوس کیا ہے اور بچوں کے دلوں میں اس کی وقعت اور محبت ابتدا ہی سے پیدا کرنا چاہی ہے۔ بلکہ اس میں یہانتک غلو کیا ہے کہ پیدائش کے بعد فوراً ہی دوسرا عنوان تجارت ہے۔ جو ذرا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

کتاب بہر حال بہت اچھی ہے اور جس عمر کے لوگوں کے لئے لکھی گئی ہے اُنکے لئے مفید بھی ہے۔

(ح۔ ع)

اسلامی لغت (جلد اول) مولفہ سید حامد حسین صاحب رضوی (علیگ) مولف سے محلہ نالہ جھالرا پاٹن (راجپوتانہ) کے پتہ پر مل سکتی ہے سائز ۲۰×۳۰/۸ حجم ۲۶۴ صفحات قیمت ع۸

اس لغت میں تاریخی، لغوی اور فقہی حیثیت کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے۔ مصنف نے اس کی ترتیب میں جن ماخذوں سے کام لیا ہے اُنکا بھی حوالہ دیتے چلے گئے ہیں۔ اختلافی امور کے تذکروں میں وہ نہایت بے تعصب ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں تحقیق کے ساتھ لکھتے ہیں۔

میرے خیال میں انہوں نے اپنے حدود کو ایک طرف زیادہ بڑھا دیا ہے یعنی لغوی اور فقہی بحثوں میں پڑ جاتے ہیں اور دوسری طرف بہت کم کر دیا ہی یعنی جغرافی اور صنعت و حرفت کے متعلق معلومات کم دیتے ہیں۔ انکو اسلامی اور نیز برطانی انسائیکلوپیڈیا کو بھی اپنے سامنے رکھنا چاہیے تھا۔ تاکہ اپنا ایک خاص راستہ متعین کر سکتے تاہم یہ لغت بھی اردو اں طبقہ کیلئے کچھ کم مفید نہ ہوگی۔

ابن یمین | مترجمہ مولوی عبد السلام صاحب ندوی۔ ناشر صوفی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ۔ پنڈی بہاؤالدین پنجاب سائز ۲۲×۱۸/۸ حجم ۲۱۰ صفحہ قیمت عہ

فارسی کے مشہور شاعر ابن یمین فریویدی کے حالات آجتک تاریکی میں تھے حالانکہ یہ ایران کا ایک نامی گرامی شاعر ہے۔ رشید ہاشمی نے نہایت محنت اور کوشش سے اس کی سوانح عمری مرتب کی ہے جس میں اس کی زندگی کے حالات لکھے ہیں اور کلام پر مفصل تبصرہ کیا۔ ترجمہ کی خوبی کے لئے مولوی عبد السلام صاحب ندوی کا نام نامی کافی ضمانت ہی۔ اس کتاب سے اردو زبان کی سوانح عمریوں میں ایک دلچسپ اور اچھی سوانح کا اضافہ ہوا ہے۔

طبقات الامم | مترجمہ قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی۔ ناشر دار المصنفین اعظم گڈھ۔ سائز ۲۶×۲۰/۸ حجم ۱۵۰ صفحات قیمت عہ

قاضی ابوالقاسم صاعد بن احمد اندلسی متوفی سنہ ۴۶۲ھ نے قرون وسطیٰ کی علمی تاریخ میں یہ کتاب لکھی تھی۔ اس میں تمام دنیا کے علوم و فنون کے حالات درج ہیں۔ امم قدیمہ و اقوام سابقہ کے طبقات مصنف نے تاریخی حیثیت سے قائم کئے ہیں اور نہایت جامعیت اور اختصار کے ساتھ انکے علمی کارنامے ترتیب دئے ہیں۔ قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی نے بہت عمدگی کے ساتھ اردو میں اس مفید کتاب کا ترجمہ کر ڈالا۔ اور مفید حواشی اس پر اضافہ کئے کتاب مطالعہ کے لائق ہے۔

تاریخ الامت (حصہ ششم) مصنفہ حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری - ناشر مکتبہ جامعہ دہلی -

سائز ۲۰×۲۶/۸ حجم ۲۱۱ صفحات - قیمت (عار)

کتاب تاریخ الامت کے پانچ حصہ پہلے شائع ہو چکے تھے - اب اسکا چھٹا حصہ مکتبہ جامعہ ملیہ نے شائع کیا ہے - لکھائی چھپائی حسب معمول عمدہ ہے -

اس حصہ میں مصر کی تاریخ آغاز عہد سے یعنی طوفان نوح کے بعد سنہ ۹۲۳ھ تک لکھی گئی ہے جبتک کہ عباسی خلافت وہاں رہی - مصنف نے اختصار کے ساتھ قدیم مصری تاریخ فراعنہ اور یونان و روم کے حالات لکھے ہیں - اس کے بعد اسلام کی تاریخ سلسلہ وار لکھی ہے - مصر قدیم اور اس کے عہد اسلامی کے ضروری اور مفید حالات پر یہ کتاب مشتمل ہے - اور نہایت تحقیق کاوش اور کوشش سے لکھی گئی ہے -

یہ دعوے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مصر کے متعلق اردو زبان میں اس سے زیادہ مفید دلکش اور مختصر مگر جامع کتاب ابھی تک نہیں لکھی گئی ہے - بالخصوص فراعنہ کے صحیح حالات سوائے اس کتاب کے اردو زبان میں نہیں مل سکتے -

(ا - ج)

وجہ دین

عقائد فرقہ اسمٰعیلیہ پر حکیم ناصر خسرو کی ایک بلند پایہ تصنیف ہے جس میں
اس فرقہ کے عقائد پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے

قیمت صرف (للعہ)

اقتباسات

سندھ میں نیا قانون اراضی

پنجاب کی طرح سندھ کے کسان بھی مہاجنوں اور ساہوکاروں کے جال میں اس طرح پھنس گئے ہیں۔ کہ انکی موروثی جائداد رفتہ رفتہ مہاجنوں اور بنیوں کے ہاتھوں میں جا رہی ہے۔ مسٹر ایس، ایچ۔ کوورٹن۔ آئی۔ سی۔ ایس حکومت کی طرف سے مزارعین سندہ کی اقتصادی حالت کی تفتیش کے لئے سنہ ۱۹۲۶ء میں مقرر کئے گئے تھے۔ انہوں نے جو اعداد و شمار جمع کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹۰۵ء سے لیکر گذشتہ بیس سال کے اندر تقریباً چار لاکھ ۵۷ ہزار ایکڑ زمین مزارعین کے ہاتھوں سے نکلکر غیر مزارعین کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے۔ اور صاحب موصوف کا خیال ہے کہ جب بار بیج کے رقبہ میں آبپاشی کا انتظام مکمل ہو جائیگا تو مسلمان مزارعین کی اراضیات اور زیادہ تیزی کے ساتھ مقامی نیز بیرونی سرمایہ داروں یعنی ساہوکاروں اور مہاجنوں کے ہاتھ میں چلی جائیں گی۔

پنجاب میں یہی صورت حال عرصہ ہوا جب پیدا ہوئی تھی اور لارڈ کرزن کی حکومت نے ایک مدت کے غور و خوض کے بعد مزارعین کو اس خطرہ سے محفوظ رکھنے کے لئے ۸ جون سنہ ۱۹۰۱ء کو پنجاب ایلینیشنس ایکٹ" منظور کیا تھا۔ اس قانون کی دفعات یہ ہیں۔

۱۔ اجرائے ڈگری کے لئے مزروعہ زمین کی فروختگی ممنوع ہے۔

۲۔ مزارعت پیشہ اقوام کا غیر زراعت پیشہ اقوام کے ہاتھ اراضیات کا فروخت کرنا منع ہے البتہ خاص خاص حالات میں اس قسم کی بیع کی اجازت دیجا سکتی ہے۔

۳۔ مزارعین کے وہ تمام رہن نامے جو غیر مزارعین کے نام کئے جائیں غیر قانونی ہیں۔ سوائے ان رہن ناموں کے جس میں ادائیگی قرض کے بعد انفکاک رہن کی شرط موجود ہو۔

اس قانون کی شدید مخالفت کی گئی تھی اور یہ اندیشہ ظاہر کیا گیا تھا کہ اس کے نفاذ کے بعد مزارعین کی حالت کہیں بد سے بدتر نہ ہو جائے۔ یوں تو دنیا میں ہر جگہ کاشتکار مقروض رہتے ہیں۔ لیکن ہندوستان کے کسان مہاجن اور بنیوں ہی کے قرض پر گویا زندہ ہیں ابھی انجمن اتحاد باہمی کا رواج اچھی طرح ہوا نہیں ہے۔ حکومت کی طرف سے تقاوی جس طرح دیجاتی ہے وہ بھی ظاہر ہے۔ پھر فصل کا کیا ٹھکانا۔ سالوں کے بعد کہیں ایک فصل ٹھیک اترتی ہے۔ ورنہ کبھی بارش ہوئی اور کبھی نہیں، اور جب ہوئی تو کبھی ضرورت سے کم اور کبھی ضرورت سے زیادہ۔ پھر سرکار دولت مدار کا تقاضائے لگان ایسا سخت کر بیچارے دیہاتی دور سے سرخ رنگ کی پگڑی دیکھکر ایسے ہراساں اور خوف زدہ ہوتے ہیں کہ گھر میں رونا پیٹنا پڑ جاتا ہے۔ اس مصیبت کے وقت میں اگر کوئی کام آتا ہے تو وہی مہاجن یا بنیا جس کے قرض سے بچانے کے لئے حکومت کو قانون بنانا پڑتا ہے۔ نہ صرف ادائیگی لگان اور مویشی و آلات کشاورزی کی خرید کے لئے مہاجن سے روپیہ قرض لیا جاتا ہے۔ بلکہ ہر شادی اور غمی کے موقع پر ضروری اور غیر ضروری رواسم کی ادائیگی کے لئے بھی اگر قرض کہیں سے ملتا ہے تو ساہوکاروں سے۔ اسی لئے باوجود ان تکالیف کے جو کاشتکاروں کو بالآخر بھگتنا پڑتی ہیں جہاں تک زندگی کے ہر روز پیش آنے والے حادثات کا تعلق ہے کسانوں کا کوئی کام بغیر مہاجنوں کے چل ہی نہیں سکتا۔ اور اگر قانوناً کاشتکار اور ساہوکار کے لین دین کو روکا گیا تو کسانوں کی حالت زیادہ خراب ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے

یہ اور اسی قسم کے اور بھی بہت سے اعتراضات تھے جو اس قانون کے خلاف اس وقت شدت کے ساتھ پیش کئے گئے۔ یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ جب آراضی کا رہن اور بیع قانوناً نہیں ہو سکتا تو اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ آراضیات کی قیمت بھی گھٹ جائیگی۔ لیکن جب قانون کا نفاذ ہو گیا تو تجربہ سے معلوم ہوا کہ سب اندیشے باطل تھے محض قانون کی وجہ خاص مشکلات کا مقابلہ نہیں کرنا پڑا۔ کسان اگر قرض لینے کے عادی تھے تو مہاجن اور بنئے قرض دینے کے بھی عادی

ہوگئے تھے۔ کاشتکار اور ساہوکار کا لین دین جاری رہا۔ البتہ اس کی نوعیت بدل گئی۔ اور یہی مقصد اس قانون کا تھا۔ آراضیات کی قیمتوں میں تخفیف کا جو اندیشہ تھا وہ بھی صحیح نہیں ہوا۔ اس قانون کے نفاذ سے قبل پانچ سال میں ایک ایکر مزروعہ زمین کی قیمت اوسطاً ۸۰ روپیہ تھی قانون کے فوراً بعد بیشک اس میں تخفیف ہوئی یعنی ۷۵ کا اوسط ہوگیا۔ لیکن ۱۹۰۶-۰۷ء میں پھر اضافہ ہوکر اوسط قیمت ۹۸ روپیہ ہوگئی اور اس وقت سے برابر اضافہ ہو رہا ہے چنانچہ ۱۹۲۰-۲۱ء میں ۲۷۵ روپیہ ہوگئی تھی۔

دوسری طرف جو آراضیاں فروخت کی گئیں۔ انکے اعداد و شمار بھی قابل لحاظ ہیں۔ یعنی قانون سے قبل پانچ سال کا اوسط ایک لاکھ ۶۲ ہزار ایکڑ تھا۔ قانون کے بعد ۱۹۰۱-۰۲ء سے ۱۹۰۵-۰۶ء تک ایک لاکھ ۳۲ ہزار ہوگیا، پھر ۱۹۰۶-۰۷ء تک اور تخفیف ہوئی اور ایک لاکھ ۲۱ ہزار ایکڑ کا اوسط ہوگیا۔ اس کے بعد ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۰ء تک کے اعداد و شمار میں کچھ اضافہ نظر آئے گا لیکن اس اضافہ میں زیادہ تر وہ آراضیاں شامل ہیں جو خود حکومت کی طرف نہر کی نوآبادیوں میں فروخت کی گئی تھیں۔

اس طرح اگر رہن ناموں کے متعلق اعداد و شمار کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس قانون کے نفاذ کے بعد برابر تخفیف ہو رہی ہے۔ اور یہی منشا اس قانون کا تھا۔

پنجاب کے اس تجربہ کے بعد اور تمام حالات کا مطالعہ کرکے مسٹر کوورٹن نے سندہ کے لئے "پنجاب لینڈ ایلینیشن ایکٹ" کے اصول پر ایک مسودہ قانون تیار کیا ہے جو سرکاری گزٹ میں عام رائے معلوم کرنے کے لئے شائع کیا گیا ہے۔ اور غالباً صوبہ بمبئی کی لجسلیٹو کونسل کے آئندہ اجلاس میں منظوری کے لئے پیش کیا جائیگا۔ مگر اندیشہ ہے کہ یہ مسئلہ کہیں فرقہ وارانہ صورت نہ اختیار کرلے اس لئے کہ سندہ کی زرعی آبادی جس کی حفاظت کے لئے یہ قانون پیش کیا جا رہا ہے اس میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ لیکن خدا کرے ایسا نہ ہو، بمبئی، پنجاب اور ریند ملکھنڈ میں بھی اس قسم کے قوانین کے نفاذ سے بہتر نتائج نکلے ہیں۔ انہیں تجربات کی روشنی میں سندہ کے لئے اسی قسم کے ایک قانون پر غور کرنا چاہئے۔

شذرات

جامعہ یکم اگست کو کھل گئی۔ پرانے طلبہ قریب قریب سب آگئے۔ نئے ابھی آرہے ہیں۔ خیال ہے کہ اس سال طلبہ کی مجموعی تعداد گذشتہ سال سے زیادہ ہو جائے گی۔

◆

گذشتہ ماہ کے آخر میں یہ جانکاہ خبر آئی کہ مولوی سید وحید الدین سلیم صاحب پانی پتی اُستاد جامعہ عثمانیہ نے وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم کے احسانات ادب اردو پر اس قدر ہیں کہ حامیان اردو کو انکے انتقال پر ملال سے جتنا صدمہ پہنچے کم ہے۔

◆

آپ پانی پت کے ایک سادات کے خاندان میں سے تھے۔ آپنے علوم عربیہ کی تحصیل مولوی فیض الحسن صاحب سہارنپوری اور مفتی عبد اللہ صاحب ٹونکی سے کی۔ انگریزی نہیں پڑھی تھی لیکن علوم جدیدہ میں وسیع معلومات رکھتے تھے۔ ابتدا میں آپ عربی فارسی میں شعر کہتے تھے مگر پھر اس خیال سے کہ غیر زبان میں شعر کہنا کوہ کندن وکاہ برآوردن کے حکم میں آتا ہے۔ اُردو میں کہنے لگے۔ ابتدائی دور تغزل کا گذرا۔ اُس کے بعد قومی اور "نیچرل" نظمیں لکھنے لگے۔ حیدرآباد سے تعلق ہونے سے پہلے بہاولپور کالج اور رامپور کے ہائی اسکول میں بھی معلم رہ چکے تھے۔ سرسید کی وفات سے چند سال پہلے آپ اُنکے لٹریری اسسٹنٹ مقرر ہوئے اور تصنیف وتالیف کے مشاغل میں امداد دیتے رہے۔ سرسید کی وفات کے بعد رسالہ معارف علیگڑھ سے نکالا۔ نواب محسن الملک کے زمانہ میں آپ علیگڑھ انسٹیوٹ گزٹ کے اڈیٹر مقرر ہوئے اور اس کے بعد لکھنؤ میں مسلم گزٹ کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ کانپور کی مسجد کے جھگڑے میں آپ کو یہاں سے استعفا دینا پڑا اور زمیندار لاہور کے چیف اڈیٹر مقرر ہوئے

مگر جب اس کا پریس ضبط ہوگیا تو استعفا دے کر اپنے گھر چلے آئے کچھ دن بعد حیدر آباد میں دار الترجمہ قایم ہوا تو علمی اصطلاحات وضع کرنے کا کام مرحوم کے سپرد کیا گیا۔ آپ کی ایک کتاب وضع اصطلات کے نام سے شائع ہوئی جس کی ارباب علم کے حلقہ میں بہت قدر کی گئی علاوہ اس کے آپ کے مضامین نظم و نثر کا بہت بڑا ذخیرہ مختلف اخباروں اور رسالوں کے فائلوں میں موجود ہے۔

◆

ہمیں مرحوم کے پس ماندگان سے اور جامعہ عثمانیہ کے طلبہ سے دلی ہمدردی ہے اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔

◆

اس مہینہ کی ابتدا میں ایک اور صدمہ ہندوستان کے بدقسمت مسلمانوں کو اٹھانا پڑا جس میں تمام عالم اسلام انکا شریک ہے۔ سید امیر علی صاحب نے اپنے ادبی کارناموں اور سیاسی کوششوں سے دنیا کے مسلمانوں کی جو خدمت کی ہے وہ صدیوں تک فراموش نہیں کی جاسکتی۔ تاریخ اس جلیل القدر مورخ، قانون داں اور سیاست داں کے نام کو کبھی نہ مٹنے دے گی۔

◆

سید امیر علی صاحب ۶ر اپریل ۱۸۴۹ء کو بنگال میں بمقام چنسورہ پیدا ہوئے تھے۔ آپ رضوی سادات میں سے تھے اور آپ کے آباؤ اجداد مشہد سے ہندوستان آئے تھے۔ ابتدا میں یہ حضرات شاہان مغلیہ کی ملازمت میں دہلی میں مقیم رہے۔ اس کے بعد اودہ میں قصبہ موہان میں توطن اختیار کیا۔ انتزاع سلطنت سے کچھ دن پہلے بنگال چلے گئے اور غالباً آپ کے اکثر اعزہ اب تک وہیں ہیں۔ سید امیر علی صاحب نے ہوگلی کالج میں تعلیم پائی اور میٹریکولیشن سے لے کر ایم۔ اے اور بی ایل تک کل امتحانات امتیاز کے ساتھ پاس

گئے۔ کلکتہ ہائی کورٹ میں چند سال وکالت کرنے کے بعد آپ سرکاری وظیفہ سے انگلستان تشریف لے گئے اور ۱۸۷۳ء میں بیرسٹری کا ڈپلوما حاصل کیا۔ انگلستان سے واپس آکر آپ نے کلکتہ میں بیرسٹری شروع کی اور بہت جلد ان کے کام میں حیرت انگیز ترقی ہوئی۔ ۱۸۷۴ء میں آپ یونیورسٹی کے فیلو منتخب ہوئے اور ۱۸۷۵ء میں پریسیڈنسی کالج میں اسلامی قانون کے لکچرر ہو گئے۔ اسی زمانے سے آپ کو ملت اسلامی کی خدمت کا شوق پیدا ہوا جو آخر عمر تک قائم رہا۔ ۱۸۷۷ء میں آپ نے سینٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن قائم کیا۔ اور پچیس برس تک اس کے سکریٹری رہے۔ آپ ۱۸۷۶ء سے ۱۹۰۴ء تک ہوگلی کے امام باڑہ کی کمیٹی کے صدر بھی رہے۔ ۱۸۷۸ء میں آپ پریسیڈنسی مجسٹریٹ مقرر ہوئے مگر ۱۸۸۱ء میں استعفا دیکر پھر بیرسٹری کرنے لگے۔ آپ ابتدا میں صوبہ بنگال کی کونسل کے ممبر تھے۔ ۱۸۸۳ء میں لارڈ رپن نے آپ کو امپیریل لیجلیسٹو کاؤنسل کا ممبر مقرر کیا جہاں آپ نہایت ہمت و استقلال سے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کرتے رہے۔ ۱۸۸۴ء میں آپ ٹگور لا پروفیسر ہو گئے اور ۱۸۸۷ء میں سی آئی۔ای کا خطاب پایا۔ ۱۸۹۰ء میں آپ کلکتہ ہائی کورٹ کے جج ہوئے جو اس زمانہ میں ہندوستانیوں کے لئے بلند ترین مرتبہ تھا۔ چودہ سال تک نہایت قابلیت سے ججی کی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۰۴ء میں آپ نے استعفا دیدیا اور انگلستان میں سکونت اختیار کی۔ وہاں کے قیام کے زمانے میں آپ بہ حیثیت صدر مسلم لیگ ہمیشہ ہندوستانی مسلمانوں کے حقوق کے لئے لڑتے رہے اور ٹرکی اور دوسرے اسلامی ممالک کی حمایت میں دل و جان سے کوشش کرتے رہے۔ ۱۹۰۹ء میں آپ پریوی کونسل کی جوڈیشل کمیٹی کے ممبر مقرر ہوئے اور آخر وقت تک اس خدمت کو باحسن و خوبی انجام دیتے رہے۔ آپ کی تصانیف میں سے قانون اور تاریخ اسلام پر متعدد کتابیں ہیں مگر اسپرٹ آف اسلام اور ہسٹری آف دی سیرسنس نے عالمگیر شہرت حاصل کی ہے۔

ہم خدائے تعالیٰ کی درگاہ میں مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں اور اُن کے وارثوں سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں ۔

⁂

آل پارٹیز کانفرنس نے پنڈت موتی لال نہرو کے زیر صدارت جو کمیٹی ہندوستان کا دستور اساسی ترتیب دینے کے لئے منعقد کی تھی اس نے اپنی رپورٹ شائع کر دی ہے رپورٹ کی مخالفت اور موافقت میں اخبارات میں کافی بحثیں ہو رہی ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں قومی سیاسی تحریک ابھی مردہ نہیں ہوئی بلکہ جب ایک حد تک اتفاق ہو جائے گا تو بڑے زور شور سے پھر بھڑک اٹھے گی ۔

⁂

ہم اس وقت اہل الرائے حضرات کو اس طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ آل پارٹیز کانفرنس کی طرف سے ایک ایسی کمیٹی کے تقرر کی بھی اشد ضرورت ہے جو ہندوستان کی تعلیمی حالت کا قومی نقطہ نظر سے مطالعہ کرے اور اصلاحی تجاویز پیش کرے ۔ تعلیم کو جو تعلق عام تمدنی زندگی سے ہے اُس کی اہمیت کو گورنمنٹ برطانیہ نے تسلیم کیا ہے اور سائمن کمیشن کے ساتھ ایک تعلیمی تحقیقاتی کمیٹی بھی مقرر کی ہے ۔ مگر جس طرح بوجوہ چند در چند ملک کے اکثر ذمہ دار لیڈروں نے بجائے سائمن کمیشن کے سامنے شہادت دینے کے یہ مناسب سمجھا کہ اپنی کانفرنس علیحدہ کریں ۔ اور ایک خالص قومی کمیٹی کے ذریعہ سے ملک کی عام سیاسی حالت اور قوم کے سیاسی مطالبات معلوم کریں ۔ اسی طرح ضرورت ہے کہ تعلیمی حالت معلوم کرنے اور تعلیمی اصلاح کی تجاویز پر غور کرنے کے لئے بھی ایک اسی قسم کی کمیٹی بنا دی جائے تاکہ جن ارباب نظر کی رائے سے سائمن کمیشن کی تعلیمی کمیٹی محروم رہے گی اُنکے قیمتی مشورے سے یہ کمیٹی مستفید ہو سکے ۔

دیوان غالب اردو

طبع ثانی

مطبوعہ برلن (جرمنی)

ہندوستان کے مایہ ناز شاعر ادیب مرزا غالب کا کلام جو شان رکھتا ہے اور جس قدر و منزلت کا وہ مستحق ہی ہم نے اسی حسن و خوبی اور لطافت و نفاست کے ساتھ مرزا کے کلام کا مجموعہ ارباب ذوق کے سامنے پیش کیا ہی۔

یہ دیوان نہایت اہتمام کے ساتھ جرمنی میں طبع کرایا گیا ہی، خوبصورت ملائم جلد اس پر سنہرے دلفریب نقش و نگار، طلائی اوراق اور سب سی زیادہ مرزا غالب کی لاثانی عکسی تصویر جرمن ہنرمندی کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

ہمارے اس دیوان کی مقبولیت کا اندازہ صرف اس امر سے کیا جا سکتا ہی کہ چند ماہ کے قلیل عرصہ میں اسکا ایک ایڈیشن ختم ہوگیا اور دوسری بار طبع کرانا پڑا۔ دیوان مکمل ہی جس میں مرزا مرحوم کا خودنوشتہ مقدمہ، غزلیات، قصائد اور رباعیات ہیں آخر میں بیاض کے لئے نفیس حاشیہ دار سادہ اوراق شامل ہیں۔ جلد کا رنگ سرخ، نیلا، سبز۔ سائز ۴-۵

قیمت صرف چار روپے

مکتبہ جامعہ - دہلی

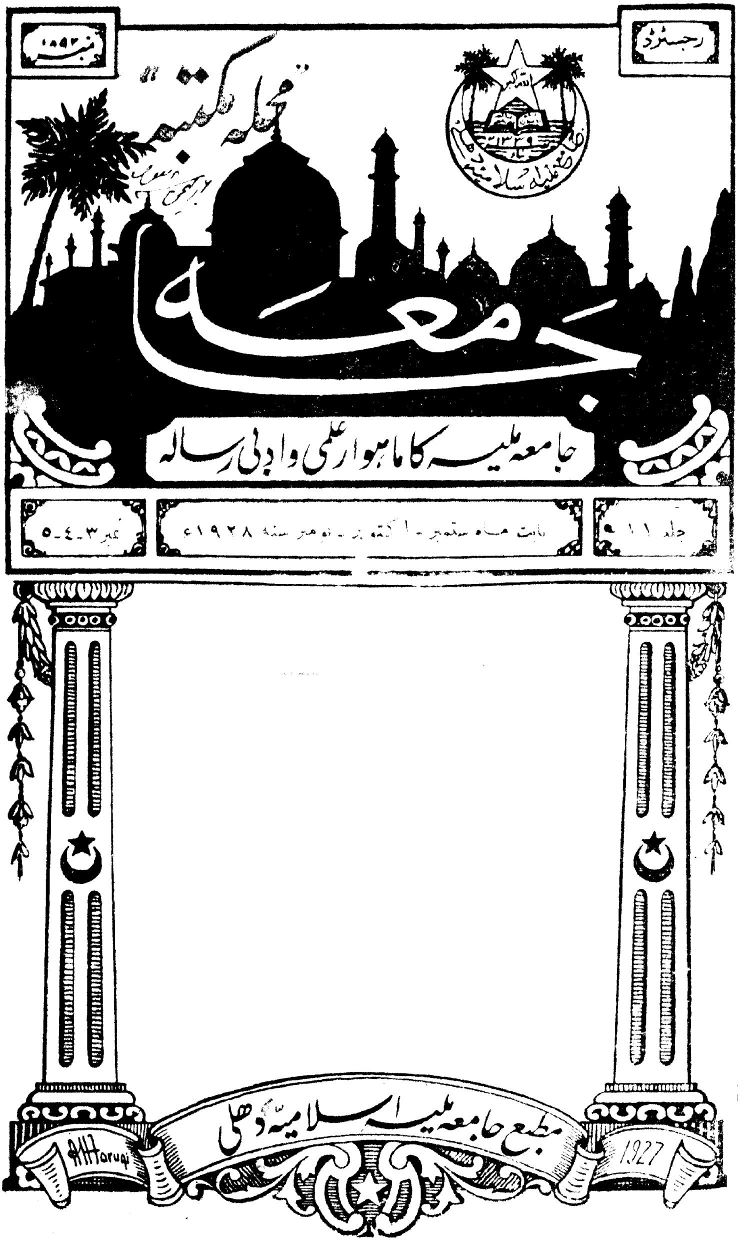

نمبر ۱۰۵۲

رجسٹرڈ

"مجلہ مکتبہ"

جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

جلد ۱۱

بابت ماہ ستمبر ۔ اکتوبر ۔ نومبر سنہ ۱۹۲۸ء

نمبر ۳-٤-٥

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دھلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری   ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد ۱۱ | بابتہ ماہ ستمبر - اکتوبر - نومبر ۱۹۲۸ء | نمبر ۳-۴-۵

فہرست مضامین

۱۔ قرون وسطیٰ کے یورپین مصنفین اور بانیٔ اسلام	ڈاکٹر برکت علی صاحب ایم اے پی ایچ ڈی	۲
۲۔ حالات حج	مولانا اسلم جیراجپوری	۱۹
۳۔ غزلیات	محمد یوسف صاحب و مولانا شرف الدین صاحب	۳۲-۳۳
۴۔ روپیہ کی ماہیت	محمد عاقل صاحب ایم اے	۳۴
۵۔ زرتشت اور بدھ	اسرائیل احمد خانصاحب	۴۹
۶۔ مستشرقین کی سترھویں بین الاقوامی کانفرنس	یوسف حسین خانصاحب بی اے (جامعہ)	۶۵
۷۔ مثنوی	مولانا شرف الدین صاحب	۷۱
۸۔ ماموں جان (ڈراما)	جلیل قدوائی صاحب	۷۳
۹۔ شذرات	۹۱ نہرو رپورٹ (مکمل)	

قرون وسطیٰ کے یورپین مصنفین اور بانی اسلام

ہمارے کرم فرما ڈاکٹر برکت علی صاحب ایم اے (علیگ) پی ایچ۔ ڈی (برلن) نے کوئی تین سال سے زائد ہوئے انجمن اردو برلن میں اپنے احباب کے سامنے مندرجہ بالا موضوع پر تقریر فرمائی تھی سامعین میں سے ایک صاحب نے اس کے نوٹ لئے تھے اور کچھ نوٹ ڈاکٹر صاحب نے تقریر میں مدد کے لئے خود لکھ لئے تھے۔ اول الذکر تو ہمارے قبضہ میں عرصہ سے تھے اب خوش قسمتی سے موخر الذکر نوٹ بھی مل گئے اور ان دونوں سے ڈاکٹر صاحب کی اس تقریر کی تقریباً پوری رپورٹ تیار ہوگئی۔ ہم نہایت خوشی کے ساتھ اسے صفحات جامعہ میں طبع کرتے ہیں اور متوقع ہیں ہمارے فاضل دوست آئندہ رسالہ جامعہ کو اپنے گرانقدر علمی مضامین سے مزین فرماتے رہیں گے۔

جب ہم ان گہرے تعلقات اور روابط پر نظر کرتے ہیں جو قرون وسطیٰ میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان تھے تو بظاہر یہ امر مشکل معلوم ہوتا ہے کہ ہم اسلام کے متعلق ان عجیب و غریب خیالات اور افکار کے وجوہ بتا سکیں جو قرون مظلمہ کے مصنفین اپنی بددیانتی سے اختراع کرتے اور انتہائی جوش کے ساتھ جن کی نشر و اشاعت کرتے تھے لیکن اس عجیب منظر کی حقیقت تحقیق اور تلاش کے سامنے بے نقاب ہوجاتی ہے۔ ابتدا میں جب کہ اسلام نے حدود عرب سے باہر قدم نکالا تو ہمیں اسلام اور نصرانیت دست و گریباں نظر آتے ہیں لیکن اسلام کی فتوحات کے بعد ہی صلیب و ہلال کی آویزش کم ہوگئی اور اچھے تعلقات قائم ہوگئے۔ یہاں میں ان اجتماعی تعلقات کا ذکر نہیں کروں گا جو عرب اور رومیوں میں تھے اور نہ ان گہرے اثرات کا جو اسلام اور نصرانیت نے ایک دوسرے پر چھوڑے۔ بنو امیہ کی صلح جویانہ اور روادارانہ حکمت عملی ایسی تھی کہ اس سے برانگیختہ جذبات دب گئے اور تعلقات استوار ہوگئے۔ اسلام عیسائیوں کی نظر میں باستثنائے معدودے چند ایک ناقابل فہم چیز رہا اور محمد صلعم کی ذات موجودہ زمانہ تک

یورپین ادبیات میں ایک بعید از فہم مبہم اور خیالی درجہ سے زیادہ کوئی رتبہ حاصل نہ کر سکی۔ اسلام اور محمد صلعم سے عدم واقفیت کی وجہ قرار دینا کہ مواقع اور وسائل کی کمی تھی غالباً صحیح نہ ہوگا کیونکہ لاطینیوں اور مسلمانوں سے نہ صرف مڈبھیڑ ہوئی بلکہ دونوں کے درمیان نہایت عمدہ تعلقات قائم ہوگئے۔ اس کے علاوہ بارہویں صدی کے اول نصف سے عربوں کی تمام اہم تصانیف اور تالیفات جو انہوں نے فلسفہ، طب، ہیئت اور ریاضی میں کی تھیں لاطینی میں ترجمہ ہو چکی تھیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ نصرانیوں میں ایسے اشخاص ضرور تھے جو عربی میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا شخص جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ ریمانڈ (Raymond) ٹولیڈو (Toledo) کا آرچ بشپ ہے (۱۱۳۰ -- ۱۱۵۰) جس نے مترجمین کی ایک جماعت تنظیم دی اور اُنکا سرپرست گوندسلاوی (Dominican Gondeslavi) کو مقرر کیا۔ لہذا ان وسیلوں کے علاوہ "ایک طرف یورپ ہسپانیہ کے ذریعہ اور بالخصوص ٹولیڈو" کے ذریعہ مسلمانوں سے روشناس ہوا اور دوسری طرف صقلیہ اور حکومت نیپلز کی وساطت سے۔ لیکن باوجود ان تمام آسانیوں کے جو قرون وسطیٰ کے عیسائیوں کو اسلام اور اس کے بانی کے صحیح حالات معلوم کرنے کی حاصل تھیں ہم تعجب کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ وہ لفظ محمد کے نام سے بھی بیگانہ ہیں۔ کیونکہ قرون وسطیٰ کے ادبیات میں کہیں "ماپ ہومت" کہیں "باپ ہومت" اور کہیں "بافوم" نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ صدیوں تک نصرانی رسول اکرم کو مسلمانوں کا خدا سمجھتے رہے جو انسانی قربانی سے خوش ہوتا ہے۔ اگر ہم ان تمام آزاد خیالات کا خاکہ پیش کریں جو عیسائی نبی کریمؐ کے متعلق رکھتے تھے تو ایک عرصہ درکار ہوگا۔ کاذب (Turpin) کے بیان سے لیکر جس نے ایک سنہری بت "ماہم" کی کیڈز (Cadiz) میں پرستش ہوتی ہوئی دیکھی تھی اس وقت تک جبکہ ناقدین حیات رسول کو ایسی چیزیں نظر آئیں کہ وہ انکے دعوے نبوت کے ماننے پر مجبور ہوئے۔ لہذا ان دلچسپ قصص و حکایات کا مختصر خاکہ آپ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ اس گروہ میں جیسا کہ بعد میں واضح ہوگا ایسے مصنفین بھی شامل تھے جیسے نکالڈس (Nicoldus) یا جیسے پادری ولیم طرابلسی جو اس وقت کے عام تعصب سے بالاتر تھے اور جنہوں نے محمد صلعم کی ذات میں ایک "خادع" اور "فریب کار" "دغا باز" (نعوذ باللہ) سے کچھ بہتر دیکھا تھا لیکن قرون وسطیٰ کا تعصب

سے بے تعصب مصنف بھی نہایت بُری لغزش کھاتا ہے جب وہ نفس اسلام کے متعلق اپنے آرا کا اظہار کرتا ہے۔

جب ہم محمد صلعم کے متعلق ایک باخبر ہسپانی پادری یولوجیس (Eulogius) ساکن قرطبہ کا بیان پڑھتے ہیں تو ہماری حیرت کی کچھ انتہا نہیں رہتی۔ اُس کے بیان کے مطابق نبی کریمؐ نے اپنے تابعین صحابہ سے اعلان کیا تھا کہ وہ وفات سے تین دن بعد جی اٹھیں گے اور آسمان پر فرشتوں سے اٹھالیے جائیں گے لیکن ہمارا فاضل پادری لکھتا ہے "کہ اس کے بجائے کتّے اس کی سڑی ہوئی لاش کو کھا گئے"۔ یہاں اس کا تذکرہ کردینا بے محل نہ ہوگا کہ (Eulogius) نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ مسلمانوں میں گذارا تھا اور اُسے حق و صداقت کے معلوم کرنے کی ہر قسم کی سہولت فراہم تھی اگر وہ ایسا کرنا چاہتا لیکن وہ نہایت سادہ لوحی سے اعتراف کرتا ہے کہ اسکا تمام علم اس موضوع خاص پر ایک لاطینی قلمی نسخہ سے لیا گیا ہے جو اتفاقاً پمپلونا (Pampeluna) میں اس کے ہاتھ آگیا تھا۔ ہمیں اب اس عجیب و غریب ناواقفیت یا غلط فہمی کے اسباب کی تلاش میں نکلنا چاہیے جو قرون وسطیٰ کے عیسائی اسلام اور اُس کے بانی کے متعلق رکھتے تھے۔ ہماری رائے میں یہ کئی اسباب کا نتیجہ تھی لیکن اصلی علت العلل ہمیں اُس محیط الکل اور ہمہ گیر اثر میں ڈھونڈنی چاہیے جو "کلیسا" قرون مظلمہ کے لوگوں کے قلوب پر رکھتا تھا۔ اسلام کی محیر العقول ترقی نے یورپ کو آنے والے خطرے سے آگاہ کردیا تھا اور عوام الناس اس سے کتنے ہی بے حس کیوں نہوں لیکن دوربین نگاہیں صاف دیکھ رہی تھیں کہ اسلام عیسائیت کا ایک خطرناک حریف ہے۔ اس خطرہ سے کامل آگاہی نے شعلہ بھڑکا دیا اور کیتھولک کلیسا ایک حریف کی حیثیت سے مقابلہ میں آگیا۔ اسلام اپنے ابتدائی دور میں مؤید من اللہ نظر آتا ہے کیونکہ جب کبھی اور جہاں کہیں اسلام کا پھریرا اڑایا گیا فتح و کامرانی مسلمانوں کا قدم چومتی تھی۔

مرور زمانہ کے ساتھ یہ خطرہ عیسائیت کے خلاف اور شدید ہوتا گیا اور ژرف بین نگاہیں ایک ایسی قوت کو تلاش کرنے لگیں جو اسلام کی روز افزوں ترقی کو روک سکے۔ رانکے (Ranke) اپنی مخصوص تاریخی بصیرت کے ساتھ اس وقت تک صورت حالات کا نقشہ بدیں الفاظ کھینچتا ہے "ہمیں جرمن کے نصرانیت قبول کرنے کو محض مذہبی اعتقاد اور تعلیم کے نقطہ نظر سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ یہ دونوں چیزیں

کتنی ہی اہم کیوں نہوں لیکن دنیا کی تاریخ کے لئے یہ نہایت ضروری بات تھی کہ اسلام کے خلاف ایک حریف قوت پیدا کیجائے کیونکہ اسلام برِاعظم یورپ میں برابر پیش قدمی کرتا جاتا ہے۔"

کلیسا جو اُن خطرات سے باخبر تھا جو عیسائیت کو اسلام کی طرف سے پیش تھی یقیناً اور فطرۃً اسلام کے ساتھ جائز سلوک کرنے پر مشکل ہی سے مائل ہو سکتا تھا۔ اور اگر ہم اس عجیب و غریب اثر کو بھی پیش نظر رکھیں جو کلیسا قرونِ وسطیٰ کے نصرانیوں کی زندگی اور انکے ادبیات پر رکھتا تھا تو ہمارا تعجب غائب ہو جاتا ہے اور ہم اسلام کے مسخ شدہ مفہوم کو جو قرونِ وسطیٰ کے نصرانیوں میں عام تھا۔ اُس وقت کے حالات کا ایک فطری اور جائز نتیجہ سمجھنے لگتے ہیں۔

ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ مغربی یورپ نے اسلام کے متعلق اپنا اصلی اور ابتدائی علم ایک نہایت غیر موثق ذریعہ سے حاصل کیا ہے یعنی کہ بازنطینی رومیوں سے۔ رومیوں کا اسلام کو حقارت اور دشمنی سے دیکھنا نہایت آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ اگر ہم یہ یاد رکھیں کہ مسلمانوں نے اپنے ابتدائی دورِ فتوحات میں بازنطینیوں کو شام و مصر جیسے زرخیز خطوں سے محروم کر دیا تھا اور اُن کا اقدام برابر جاری تھا لیکن یہ واقعہ بھی انکی نظر میں اتنا نفرت انگیز اور حقارت آفرین نہ تھا جتنی کہ اسلام کی شدید توحید جو بازنطینی شرک کے مقابلہ میں تاباں و درخشاں تھی۔ اسلام انکی نظر میں ایک سخت حریف اور خطرناک دشمن کی حیثیت رکھتا تھا۔ رومی اگرچہ اپنی سیاسی کمزوری کا احساس رکھتے تھے لیکن اسلام کے حملوں کو روکنے کی سکت انہیں باقی نہ تھی جو اسلام اُن کی سرزمین اور عقائد پر برابر کر رہا تھا۔ جبکہ خلافت بغداد ضعیف اور کمزور ہو گئی اور ترک علمبرداران اسلام کی حیثیت سے میدان میں آئے تو نصرانیت اور اسلام کی باہمی جد و جہد میں ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ مغربی کلیسا نے جو "مشرقی سلطنت" کی بقا کے لئے اتنا فکرمند نہ تھا جتنا کیتھولک مذہب اور عقائد کی اشاعت کے لئے۔ بظاہر ان مظالم کا بدلہ لینے کے لئے جو ترکوں نے نصرانیت پر کئے تھے لیکن درحقیقت اسلام کی روزافزوں قوت کو روکنے کے لئے حروب صلیبیہ کو ترتیب دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ گریگری ہفتم Gregory کے زمانہ سے یورپ کو مشرق کی طرف دھکیلنے اور کافروں

کو آغوشِ کلیسا میں اُنکی تدبیر نہایت خاموشی سے صورت پکڑ رہی تھی لیکن گریگری اُن مخالف قوتوں کی وجہ سے جو کلیسا میں موجود تھیں اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکا اور یہ شرف و جلال اربن ثانی کے لئے مقدر تھا کہ اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنائے اور ارضِ مقدس کی فتح کے لئے جنگ جو دل اور محاربین کا ایک غیر مختتم سلسلہ جاری کر دے۔ تاکہ ارضِ مقدس پر جان دینے کے لئے سر بکف سپاہیوں کی ایک فوجِ کثیر ہمیشہ کلیسا کے پاس موجود رہے۔ ارکانِ کلیسا اور اسکے پیروانِ اسلام کے خلاف نہایت دریدہ دہنی اور بےباکی سے دروغ بیانی اور تہمتیں تراشتے تھے۔ وہ تصویر جو (Theophanes) نے محمد صلعم کی کھینچی ہے۔ حروبِ صلیبیہ کے واعظین کے لئے بڑے خط و خال رکھتی تھی لہٰذا اب خاص آب و رنگ اور زیادہ گہرے خطوط میں تصویر کھینچی گئی۔ مسلمانوں پر نہایت بے بنیاد الزامات لگائے گئے اور کہا گیا کہ مسلمان نصرانی معبدوں کی نہایت بے حرمتی کرتے ہیں اور اس طرح سے حروبِ صلیبیہ کے مورخین نے اسلام و نصرانیت کی جد و جہد کو زندہ رکھا۔ ایک چھوٹے حادثہ کو جو انطاکیہ پر قبضہ کرتے وقت واقع ہوا (Raymond of Agiles) ایسے الفاظ میں بیان کرتا ہے جن سے اُن نفرت آمیز جذبات کا پتہ چلتا ہے جو عیسائی مسلمانوں کے خلاف رکھتے تھے:۔

متقی اور پرہیزگار Raymond رقمطراز ہے "ایک طویل تکالیف و مصائب کے بعد ایک مسرت انگیز اور فرحت بخش واقعہ ظہور پذیر ہوا یعنی ترکی سواروں کا ایک دستے کو جو تعداد میں تین سو سے زائد تھا صلیبی محاربین نے گھیر لیا اور ایک چٹان پر سے گرا دیا۔ کیا ہی خوشکن نظارہ تھا اگرچہ گھوڑوں کے نقصان کا ضرور افسوس ہے"

بیشتر اس کے کہ ہم نبی کریم کی اُس زندگی کی طرف متوجہ ہوں جس کو قرونِ وسطیٰ کے عیسائی مصنفین نے پیش کیا ہے یہ نہایت دلچسپ ہوگا کہ بحیرا کے واقعہ کو بے نقاب کیا جائے اور اسکی اصلی حقیقت واضح کیجائے۔ کیونکہ تمام عیسائی مصنفین اس حقیقی یا خیالی بحیرا کا ذکر بڑی خوشی سے کرتے ہیں۔ واحدی کی کتاب "اسباب النّزول" میں یہ حکایت بالکل اپنی سادی شان میں نظر آتی ہے۔

"جب ابوبکر اٹھارہ اور محمد صلعم بیس برس کے ہوئے تو محمدؐ شام کی طرف ابوبکر کے ساتھ تجارتی سفر پر گئے اور راستہ میں ایک درخت کے سایہ میں اترے۔ ابوبکر ایک راہب کے پاس گئے اور ایسے

مذہب کی بابت دریافت کیا۔ راہب نے اُس شخص کا حال دریافت کیا جو درخت کے سایہ میں بیٹھا تھا۔ ابوبکر نے جواب دیا۔ محمد بن عبداللہ۔ راہب نے اس پر جواب دیا کہ خدا کی قسم وہ نبی ہے۔ کیونکہ لکھا ہے کہ کوئی دوسرا شخص سوائے ایک نبی کے حضرت عیسیٰ کے بعد اس درخت کے نیچے نہیں بیٹھے گا۔ اسکا ابوبکر پر بہت اثر ہوا اور وہ حق کے قائل ہو گئے اور واپسی پر محمد صلعم کو کبھی اکیلا نہ چھوڑا۔

یہ روایت "مواہب" اور "حلبی" میں بھی ملتی ہے اور ابن عباس تک جو حدیث گھڑنے میں مشہور ہیں اور جن کا سال وفات سنہ ۶۸ھ ہے مرفوع ہوتی ہے۔ "اصابہ" میں بھی اسکا ذکر موجود ہے لیکن وہ عبدالغنی الثقفی کی تفسیر سے ماخوذ ہے۔

ان تینوں تصانیف میں جن کا ابھی ذکر ہوا ہے ہم راہب کے نام بَحیرا یا بُحیرا دیکھتے ہیں۔ یہ پہلا حاشیہ ہے جو اسپر چڑھایا گیا ہی۔ اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ ابن اسحاق اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔ اور کیونکر رنگ آمیزی کرتے ہیں۔

ابوطالب ایک قافلہ کے ساتھ شام جانیوالے تھے۔ جب وہ چلنے لگے تو محمد صلعم انکو چمٹ گئے اور ابوطالب کا دل بھر آیا۔ ابوطالب نے کہا بخدا میں انکو اپنے ساتھ لے چلوں گا اور ان سے کبھی جدا نہ ہوں گا۔ چنانچہ وہ روانہ ہوئے اور ایک راہب کی خانقاہ کے پاس سے گزرے جس کا نام بحیرا تھا۔ وہ پہلے بھی اس راستے گزرے تھے مگر راہب نے کبھی التفات نہ کیا لیکن اس مرتبہ اُس نے انکی دعوت کی کیونکہ اُس نے اپنی خانقاہ سے دیکھ لیا تھا کہ ایک بادل نبی کریم کے سر پر سایہ کئے ہوئے تھا۔ اور جب وہ درخت کے نیچے آرام کر رہے تھے تو درخت کی ٹہنیاں انکی حفاظت کے لئے جھک گئی تھیں۔ کھانے کے وقت محمد صلعم تشریف نہ لائے لیکن بحیرا نے باصرار کھانا کھلایا۔ کھانے کے بعد بحیرا نے کہا کہ لات وعزیٰ کا واسطہ میرے چند سوالوں کا جواب دو جس پر محمد صلعم نے کہا کہ لات وعزیٰ کی قسم نہ کھاؤ کیونکہ خدا کی قسم ان بتوں سے زیادہ میری نگاہ میں کوئی چیز نفرت انگیز نہیں ہی۔ پھر اس نے خدا کا واسطہ دیکر کئی چیزوں کے متعلق دریافت کیا اور مہر نبوت دیکھی اور وہ سب ٹھیک نکلیں۔ پھر وہ ابوطالب کیطرف متوجہ ہوا اور پوچھا کہ اس بچہ سے تمہارا کیا رشتہ ہی۔ انہوں نے جواب دیا یہ میرا لڑکا ہے۔ اس پر بحیرا نے جواب دیا تمہارا لڑکا نہیں۔ کیونکہ بچہ کا باپ زندہ نہیں ہوسکتا۔ پھر ابوطالب

نے کہا یہ میرا بھتیجہ ہے اور اس کے باپ کا کیا ہوا؟ اسکا انتقال ہو گیا جبکہ محمد صلعم کی والدہ حاملہ تھیں۔ اسپر بحیرا نے جواب دیا کہ اب تم نے سچ بولا ہے۔ لہذا تم اس بچہ کو لیکر گھر جاؤ اور یہودیوں سے اس کو بچاؤ کیونکہ اگر وہ اس کو میری طرح پہچان لیں گے تو نقصان پہنچائیں گے کیونکہ تیرا بھتیجہ کسی دن ایک بلند مرتبہ حاصل کرے گا۔

طبری کے بیان کے مطابق محمد صلعم کی عمر اس وقت ۹ سال کی تھی۔ دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ ہم طبری میں پڑھتے ہیں کہ راہب نے ابوطالب سے یہ کہا کہ انکو رومیوں سے بچاؤ نہ کہ یہودیوں سے جیسا کہ ابن اسحاق کا بیان ہے۔

مسعودی میں یہ قصہ اس طرح سے ہے کہ بحیرا فترۃ کے زمانہ میں بھی زندہ تھا۔ وہ نصرانی تھا اور اسکا نام نصرانی کتابوں میں سرجس یا Sergius ہے۔ جب محمد صلعم ابوطالب۔ ابوبکر اور بلال کیساتھ شام گئے تو انکی عمر تیرہ سال کی تھی۔ بحیرا نے چلتے وقت کہا کہ اس بچہ کو اہل کتاب سے بچانا۔ یہ سنکر ابوطالب انکو لیکر مکہ واپس چلے آئے۔

ابن الاثیر میں تمام قصہ اسی طرح پر درج ہے جس طرح طبری میں۔ حقیقت میں یہ تمام قصہ ابن عباس کے تخیل کا نتیجہ ہے۔ یہ پہلی سدی ہجری میں تاریخ کے اوراق پر آیا ہے لیکن نصف صدی پہلے سے یہ قصہ مسلمانوں میں مشہور تھا۔ کیونکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ سب سے اول بیان راہب کے نام کے متعلق خاموش ہے پہلے بیان میں راہب نے ابوطالب سے یہ کہا کہ اس بچہ کو یہودیوں سے بچانا۔ دوسرے بیان کے مطابق عیسائیوں سے بچانیکی فرمائش ہے۔ ایک بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد صلعم کی عمر اس وقت ۹ سال تھی ایک میں تیرہ اور ایک میں انیس بیان کیجاتی ہے۔

قرون وسطی کے مصنفین کے نقطہ نظر سے محمد صلعم نہ صرف ایک جھوٹے نبی نوجوانوں کے بہکانے والے تھے بلکہ ایک نہایت دغاباز شخص تھے جو کمزوروں کو دنیاوی لذائذ میں پھنسا کر حق و صداقت سے منحرف کر دیتے تھے۔ اسکا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ اپنے ذاتی فوائد کی خاطر کیسی کیسی تہمتیں اسلام کے خلاف تراشتے تھے لیکن وہ اسلام کے ساتھ عجیب و غریب اصول منسوب کرنے میں کتنے ہی بے باک کیوں نہوں انکو اتنی جرأت نہ تھی

کہ وہ اسلام اور نصرانیت کے مشترک مسائل سے انکار کرسکیں لہذا اس مشکل کا حل یہ سوچا گیا کہ ایک بے بنیاد دعوےٰ تیار کیا گیا کہ محمد صلعم از روئے پیدائش نصرانی تھے ہمیں اب (Theophanes) کی طرف متوجہ ہونا چاہئے جس نے اسلام اور اسکی تعلیمات کے متعلق سب سے پہلے لکھا۔ اور جس کی تحریرات کو (Anastasius) نے اپنی "تاریخ کلیسا" میں بعینہ نقل کیا ہے۔ اس میں محمد صلعم کے متعلق جو افسانے قرون وسطےٰ میں تیار کئے گئے تھے انکی تمام امتیازی خصوصیات آجاتی ہے۔ تاریخ روایت نقل تخمین اور رجما بالغیب کا ایک نہایت اچھا مجموعہ ہے جس میں محمد صلعم کی مسکنت و غربت۔ خدیجہ سے شادی اور تجارتی سفروں کا حال ملتا ہے جو سب تاریخی واقعات ہیں لیکن ساتھ ہی اس میں یہ بے بنیاد بیان بھی ملتے ہیں کہ یہودیت اور نصرانیت کا مطالعہ نبی کریم نے انکی مذہبی کتابوں سے کیا تھا۔ اس مقام پر ہم ان افسانوں سے بھی دوچار ہوتے ہیں جن کا ذکر عیسائی مصنفین نہایت ذوق و شوق سے کرتے رہے ہیں کہ محمد صلعم نے جبریل سے تعلق کا قصہ اس لئے گھڑا تا کہ حضرت خدیجہ کا شک اس بارے میں رفع ہوجائے کہ انکے خاوند کو مرگی کے دورے آتے ہیں

Theophanes کے بیان کے مطابق ایک پادری جو بد اعتقادی کی وجہ سے کلیسا سے خارج کر دیا گیا تھا خدیجہ کے عاشق کے لباس میں جلوہ نما ہوتا ہے۔ مگر بعد میں دونوں میں راضی نامہ ہوگیا اور پادری نے از راہ کرم محمدؐ کے دعوے نبوت کو تسلیم کرلیا اور بہت کارآمد ثابت ہوا۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اگرچہ گیارہویں صدی سے اسلام اور اس کے متعلقہ مسائل پر بار بار کتابیں لکھی جا رہی ہیں لیکن وہ تمام مجادلانہ اور مناظرانہ حیثیت رکھتی ہیں۔ لہذا اس نوعیت سے تمام کتابیں عجیب و غریب اکاذیب اور اباطیل کا مجموعہ ہیں اور غالباً محمد صلعم کی زندگی یا اسلام کے سمجھنے کی کبھی بھی کوشش نہیں کی گئی۔ یہاں یہ بتا دینا بے موقع نہ ہوگا کہ عین اس وقت جبکہ Raymond. (Archbishop of Toledo) عربی تصانیف کا جو فلسفہ پر تھیں ترجمہ کروا رہا تھا Peter the Venerable of Cluni قرآن اور اسلامی دینیات کے تراجم حاصل کرنے میں مصروف تھا۔

Peter the Venerable of Cluni جو کیتھولک کلیسا کا نہایت زبردست حامی تھا وہ شکایت کرتا ہے کہ بغیر کافی مواد کے ہم اسلام کے خلاف جدوجہد جاری نہیں رکھ سکتے اور عیسائیوں کو ملامت کرتا ہے

کہ مطلوبہ مواد اسلام کے خلاف ابتک جمع کرنے سے قاصر رہے ہیں لہذا وہ اب باقاعدہ کوشش کرتا ہے اور اس غرض سے وہ قران کا ترجمہ لاطینی میں کرواتا ہے۔ اس اول ترجمہ کی تاریخ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے شاید اس کو ترجمہ کے لفظ سے تعبیر کرنا موزوں نہوگا کیونکہ (Robert) نے حامل المتن ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ "عربی متن کا لب لباب اپنے الفاظ میں دیدیا ہے"۔ (Robert) کی زندگی کے حالات بہت کم معلوم ہو سکے ہیں۔ صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ اُس نے فرانس، اٹلی، دلماشیا اور یونان سے ایشیا کا سفر کیا جہاں اُس نے عربی زبان کی تحصیل کی۔ ۱۱۳۶ میں وہ بارسلونا میں مقیم تھا جہاں اُسے (Plato of Trivoli) کی سرپرستی حاصل تھی اور ۱۱۴۱ سے ۱۱۴۳ تک وہ عربی کی تحصیل میں مصروف رہا۔ بعد میں وہ Pampeluna) کا (Archdeacon) ہوگیا۔ ۱۱۴۱ میں Peter the Venerable نے Robert and Hermann کی خدمات حاصل کیں تاکہ چند عربی کتب کا ترجمہ کرائے بالآخر چار کتابیں شائع کی گئیں جن پر پیٹر نے خود اپنے قلم سے ایک دیباچہ لکھا۔ ان چاروں ترجموں کی مدد سے Robert نے اسلام کے خلاف ایک تصنیف تیار کی "Chronica mendosa et ridiculsa Saracenorum" جس میں حضرت صلعم کے حالات زندگی خلفاء اربعہ کی تاریخ اور واقعہ کربلا قلمبند کئے قرآن کا ترجمہ۔ مترجم کے دیباچہ کے ساتھ Peter the Venerable کے نام کے ساتھ معنون کردیا۔

Robert خود کہتا ہے کہ اُس نے قرآن کا ترجمہ ۱۶ر جولائی اور ۳ر دسمبر ۱۱۴۳ء کے درمیان ختم کیا۔

Peter the Venerable کی تصانیف کے شائع ہوتے ہی اسلام کے خلاف مجادلہ اور مناظرہ کا دروازہ کھل گیا۔ اور وہی ایک ماخذ اور سرچشمہ ہے جس سے قرون وسطیٰ کے نصرانیوں نے اسلام کے خلاف مواد حاصل کیا اور اسلام کے متعلق رائے قائم کی۔ اس کی تصانیف کے بعد سے یورپ کی تمام زبانوں میں اسلام کے خلاف سب وشتم کا ایک غیر متناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ بعض مصنفین نے نبی کریم اور اسلام کے خلاف نظم میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ مثلاً Walter of Sens نبی کریم کے خلاف لاطینی نظم میں اور

Alexander Du Pont) نے فرانسیسی نظم میں گلفشانی کی ہے۔ قرآن کا وہ ترجمہ جس کو رابرٹ نے کیا تھا قرون وسطیٰ میں متداول اور معروف تھا۔ Alberich (of Irois Fontaines) جو تیرھویں صدی میں تھا اس ترجمہ سے واقف تھا لیکن اسلام کی مخالفت میں اُس نے اُس ترجمہ سے بہت کم مدد لی ہے۔ اسلام کے خلاف اکثر رسالے مباحثے کی صورت میں ملتے ہیں جو عیسائی اور نصرانی علما میں ہوئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ مباحثے ہوتے تھے اور اکثر ہوتے تھے مثلاً ایک مذہبی مناظرہ ۱۲۱۶ء میں حلب میں ہوا جس میں سلطان صلاح الدین کا ایک لڑکا بھی موجود تھا۔ عیسائیوں کی طرف سے جارج نامی راہب مباحث تھا (Raymond Lullus) بھی ایک مذہبی مناظرہ کی خبر دیتا ہے جو Bngia مقام پر ۱۳۰۹ء میں ہوا۔ اس مباحثہ میں ایک یہودی، ایک عیسائی اور ایک مسلمان یکے بعد دیگرے ایک لامذہب شخص کے سامنے اپنے اپنے مذاہب کی تلقین کرتے ہیں لیکن وہ لامذہب تمام شواہد پر غور و خوض کرنیکے بعد نصرانیت قبول کر لیتا ہے۔

لیکن سب سے زیادہ گندہ اور بے بنیاد الزام جو قرون وسطیٰ کے مصنفین مسلمانوں پر لگاتے ہیں وہ بت پرستی کا ہے۔

کیسی عجیب و غریب بات ہے کہ ہم سے بار بار کہا جاتا ہے کہ مسلمان محمد صلعم کو خدا سمجھتے ہیں اور اُس کی پرستش کرتے ہیں۔ حروب صلیبیہ کا ایک مشہور مصنف ایک مسلمان کے منہ سے یہ کہلواتا ہے کہ ”(Belief in Mohd & our other Gods)“ چند مصنفین محمد صلعم کو صلاح الدین کا خدا کہتے ہیں جس کی روزانہ پرستش کیجاتی ہے۔ (Arnold of Lubeck) میں جنگ (Hittin) کے بعد سلطان صلاح الدین اسیر شدہ شہزادے سے یوں خطاب کرتا ہے ”کہ تو نے میرے زور بازو کو میرے خدا محمدؐ کی بدولت محسوس کیا“ اور ایک نصرانی (Knight) اُسکا جواب ان الفاظ میں دیتا ہے ”کہ اُس محمد کو The Sun of Ru جس کو تو خدا کہتا ہے ہم حقارت سے دیکھتے ہیں۔ اُسکی تکذیب کرتے ہیں اور اُس پر لعنت بھیجتے ہیں“۔ (False Turpin) کے بیان کے مطابق چارلس اعظم (Charles the Great) کے اسپانیہ پر حملہ کے وقت محمد صلعم مسلمانوں کا خدا سمجھا جاتا تھا اور (Mathew Paris

کے خیال کے مطابق مسلمان محمدؐ کی اُسی طرح پرستش کرتے تھے جیسے کہ عیسائی حضرت عیسیٰ کی۔ جب Tancred یروشلم کی فتح کے بعد اُس مسجد میں داخل ہوا جو گرجا کی جگہ بنائی گئی تھی تو اُس نے محمد کا اتنا وزنی نقرئی بت دیکھا کہ چند آدمی اُس کو مشکل سے اٹھا سکتے تھے۔ اس کے علاوہ Jacob of Nitroy تو یہاں تک کہتا ہے کہ بیت المقدس پر جب کبھی بھی مسلمانوں کا قبضہ ہوا تو محمدؐ کا بت گرجا میں لا کر رکھا گیا اور عیسائیوں کا داخلہ روک دیا گیا۔ یہ بھی کہا گیا کہ مسلمان عیسائیوں کے خلاف جنگ کرنے سے پہلے اپنے ایک بت محمد نامی سے مشورہ کر لیتے ہیں۔ بہرحال اس قسم کی بیہودہ روایتیں قرون وسطیٰ میں عام طور سے رائج تھیں اور ان کے اسباب کے متعلق گذشتہ اوراق میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔

Ginbert of Nogent نے پہلی مرتبہ ان تمام منتشر روایتوں کو ایک جگہ جمع کیا ہے لیکن وہ نہایت دیانتداری سے اعتراف کرتا ہے کہ اُس کی تمام تصانیف زبانی روایتوں پر مبنی ہے۔ اُس غریب کو اس کا بھی علم نہ تھا کہ نبی کریم کونسی صدی میں تھے مگر Ginbert خود لکھتا ہے کہ "محمدؐ کسی جدید ماضی میں نہ ہونگے کیونکہ کسی پادری نے اُن کی بداعمالیوں کے خلاف لکھا ہے" (Ginbert) کے بیان کے مطابق محمد کی زندگی کے خاص خاص واقعات یہ ہیں:-

ایک راہب نے جس کی دیانت مشکوک اور جس کا ایمان متزلزل تھا اسکندریہ کی قسیسیت کے لئے کوشش کی اور ناکام رہا۔ اُس پر اُس نے کلیسا سے بدلہ لینا چاہا اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ شیطان نے اُس کے کان میں یہ پھونک دیا کہ اس شیطانی ارادہ کی تکمیل کے لئے اس نوجوان کا انتظار کرو جو تمہارے پاس عنقریب آئے گا۔ راہب نے جو خوب جانتا تھا کہ اس کام کے لئے کیونکر اس نوجوان کو اپنے ساتھ ملائے اس کی خدیجہ سے شادی کرا دی اور خدیجہ نے راہب کے یہ کہنے سے کہ محمد ایک پیغمبر ہے ایک غریب نیچ ذات کے خاوند کو قبول کر لیا لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد محمد کو مرگی کے دورے آنے لگے اور خدیجہ سہمی ہوئی راہب کے پاس گئی لیکن راہب نے خدیجہ کو سمجھا دیا کہ یہ مرگی نہیں ہے بلکہ نزول وحی کے وقت محمد کی یہ حالت ہو جاتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ محمد کی شہرت پھیل گئی اور نبی کا درجہ حاصل کر لیا۔ راہب نے اب محمد کو یہ صلاح دی کہ اپنی تعلیمات کے اصول ایک ضابطہ کی صورت میں پیش کرو اور اُن کی تصدیق ایک معجزہ کے ذریعہ کر دو۔ چنانچہ مومنین

کو تین دن روزہ رکھنے کا حکم دیا گیا اور تب محمد نے ایک نہایت سنجیدہ جماعت کے سامنے اعلان کیا کہ عنقریب وحی کا نزول ہونے والا ہے خبردار رہو۔ لوگ ہمہ تن منتظر تھے کہ اچانک ایک گائے جس کو محمد نے پہلے ہی خوب سدھا رکھا تھا۔ مع ایک کتاب کے جو اس کے سینگوں کے درمیان رکھی ہوئی تھی ظاہر ہوئی اور محمد کے سامنے دوزانو بیٹھ گئی۔ اس واقعے کے بعد سے ہمارا فاضل (Ginbert) کہتا ہے محمد کی رسالت اور نبوت کے متعلق کسی کو شک و شبہ باقی نہ رہا۔ اور نئی تعلیم جس کی تمام بنیاد کذب و فریب پر تھی لوگوں میں بہت جلد پھیل گئی۔ کتاب مذکورہ کے مضامین کے متعلق ہمارا مصنف اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتا کہ اس کتاب سے لذائذ دنیوی، شہوت رانی اور خبائث و رذائل کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کھول دیا۔ محمد کا انجام بھی اس تمام فسانہ کے مطابق ہی ہوا ہے کیونکہ ہم پڑھتے ہیں کہ ایک دن محمد تنہا جا رہا تھا کہ مرگی کا دورہ پڑا اور وہ زمین پر بیہوش گر پڑا۔ اتنے میں سوروں کا ایک غول آیا اور اسکی بوٹی بوٹی کر کے کھا گیا صرف ایڑیاں بچی رہیں۔

قرون وسطی کے مصنفین کی رائے کے مطابق یہی واقعہ ہے جس کی بنا پر مسلمانوں پر سور کا گوشت حرام کیا گیا۔ (Ginbert) کی "سیرۃ محمد" کا یہ ایک مختصر خاکہ ہے۔

اب ہمیں (Heldeben) کی طرف متوجہ ہونا چاہئے جو (Lemons) کا عالم و فاضل پادری ہے۔ اور جو بعد میں Tours کا Archbishop ۱۱۳۳ء میں ہو جاتا ہے۔ اس نے بھی محمد کی سیرۃ لکھی ہے اور اس میں فسانہ کا رنگ دیا ہے۔ اپنے معاصرین کی طرح وہ بھی محمد کو گالیاں دیتا ہے لیکن محمد کی کامیابی کو ایک بادہ گر کی مدد کیطرف منسوب کرتا ہے۔ وہ بھی متفق ہے کہ محمد کی لاش کو سور کھا گئے۔

بارہویں صدی کے اول نصف میں (Walter of Sens) نے ایک ایسی ہی نظم لکھی جس کا عنوان "Otia Walter, de Mohometa" تھا اس نے اسلام کی ترقی کا حال ایک مسلمان کے حوالہ سے لکھا ہے جس نے مذہب نصرانیت قبول کر لیا تھا اور مشرق قریب سے فرانس میں آکر سکونت اختیار کر لی تھی۔

اس مقام پر راہب کے فسانہ میں ترمیم شروع ہو جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کا ضمیر اس قصہ سے مطمئن نہیں ہوتا تھا کہ اسلام کا حقیقی بانی ایک باغی پادری ہو اور جس کے ہاتھ میں محمد ایک آلہ سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا ہو۔ لہذا قرون وسطیٰ کی تصانیف کی یہ مشترک خصوصیت اب نظر انداز کر دی جاتی ہے (He-Idebert of Lemons میں راہب کی جگہ ایک جادوگر لے لیتا ہے۔ Walter of Sens میں راہب اب محمد کا روحانی مرشد نہیں رہتا بلکہ ایک منجم اور معبّر کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

علاوہ ازیں ہم والٹر میں ایک نئی خصوصیت کا اضافہ دیکھتے ہیں۔ وہ ہمیں بتلاتا ہے کہ محمد کے پیروؤں اور ایرانیوں میں ایک لڑائی ہوئی تھی۔ محمد نے لڑائی کے روکنے کی بے انتہا کوشش کی لیکن جب اُس نے دیکھا کہ اس کے روکے لڑائی نہیں رکتی تو نہایت بزدلانہ میدان سے بھاگ گیا اور جنگل میں چھپ گیا۔ محمد اور خدیجہ کی شادی کو ایک نہایت گہری چال کا نتیجہ بتلاتا ہے۔

عیسائی مصنفین کی تصانیف میں محمد کو اکثر ایک پیدائشی غلام کہہ کر حق و انصاف کے گلے پر چھری پھیری گئی ہے۔ Helebert of Lemons میں ہم پڑھتے ہیں کہ محمد نے اپنی رسالت کو ایک بیل کے ذریعہ ثابت کیا تھا جس کو محمد نے پوشیدہ طریقہ سے سدھایا تھا۔ یہ بیل اُنکے حکم کا تابع تھا جب وہ کہتے تب اٹھتا تھا اور جب بیٹھنے کا حکم دیتے تھے تب بیٹھ جاتا تھا۔ دوسرے مصنفین نے یہ کام ایک اونٹ سے لیا ہے جس کی گردن میں ایک کتاب بندھی ہوئی تھی لیکن Andrea Dandolo (Venice) میں ہم پڑھتے ہیں کہ محمد نے ایک سفید کبوتر کو اس طرح سدھایا تھا کہ وہ اُنکے شانے پر آکر بیٹھ جاتا تھا اور اُن کے کان میں سے دانے چن چن کر کھاتا تھا۔ خدیجہ اُس کے بیان کے مطابق عرب کی ایک شہزادی تھی جس سے شادی کرنے کی وجہ سے محمد کو دنیاوی جاہ و جلال اور مرتبہ حاصل ہو گیا تھا۔ محمد کا دست راست ایک راہب (Sergius) نامی تھا جو محمد کی مدد سے کلیسا کو نقصان پہنچانا چاہتا تھا (Dandolo) کہتا ہے کہ محمد کے ایک دشمن نے اُن کو زہر دے کر مار ڈالا۔ اور اس کے بعد اُسکا قلم اس طرح گوہر ریز ہوتا ہے "چونکہ محمد کو یقین تھا کہ وہ تین دن کے بعد آسمان پر اٹھا لیا جائے گا لہذا اُس نے اپنے متبعین اور پیروان اسلام کو تاکید کر دی تھی کہ اُس کی لاش کو تین دن تک دفن نہ کیا جائے۔ حکم کی تعمیل کی گئی لیکن متوقع معجزہ ظہور پذیر نہ ہوا لہذا بارہ دن کے

فضول انتظار کے بعد اسکی متعفن اور سڑی ہوئی لاش دفن کرنی پڑی"۔

Gesta Imperatorum et Pontifeum میں جس کو ٹامس باشندہ ٹسکنی نے ۱۲۷۸ء میں تصنیف کیا ہے ایک بہت بڑا مجموعہ ان افسانوں کا ملتا ہے۔ اُس میں راہب، کبوتر، گائے الغرض سب کچھ موجود ہی۔ اور مصنف نی اسکو دلچسپ بنانیکی غیر معمولی کوشش کی ہی۔ اُس میں ایک پادری کو روشناس کرایا گیا ہے جو ایک کنوئیں میں بیٹھ کر لوگوں کو اسلام کی طرف ترغیب و تحریص دیتا تھا۔ محمدؐ اس سے بدگمان ہوگیا اور اب اُس کو یہ فکر پیدا ہوئی کہ اس خطرناک دوست سی کیونکر رہائی حاصل کیجائے لہذا اُس نے ایک دن موقع پاکر کنوئیں کو بھروا دیا اور اپنے حریف سے چھٹکارا پایا۔ لیکن ان روایات، فسانوں، او حکایات کا بہترین اور کامل ترین مجموعہ (Prince of Beauvais) کی تصنیف Speculum Historiale کے اُس حصہ میں ملتا ہے جو محمدؐ کے بارے میں ہے۔ اسمیں محمد ایک تاجر بتلایا جاتا ہے جس نے اپنے تجارتی سفروں کے دوران میں نصرانیت اور یہودیت کے متعلق سطحی معلومات حاصل کرلی تھیں مگر ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ وہ ایک ہوشیار جادوگر تھا جس نے اپنے جادو کے ذریعہ خدیجہ جیسی مالدار عورت سے شادی کرلی۔ مصنف مذکور ہماری اطلاع کے لئے یہ بھی کہتا ہے کہ محمدؐ نے اپنے تئیں مسیح موعود مشہور کرکے بہت سی لوگوں کو اپنا پیرو بنالیا۔ اس کے بعد عام حکایات شروع ہوجاتی ہیں۔ کبوتر جو محمدؐ کے کان میں بات کرتا تھا۔ سدھی ہوئی گائے جس کے سینگوں کے درمیان قرآن رکھا تھا۔ اور ایک گھڑا جس میں دودھ اور شہد بھرا تھا۔ علاوہ ازیں (Prince) اس مکالمہ کا ایک اقتباس دیتا ہے جو ایک عیسائی اور مسلمان کے درمیان ہوا تھا اور جسکو Feter the Venerable of Cluni نے اپنے لاطینی ترجمہ کے ساتھ یورپ میں شائع کرایا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق محمد ایک غارت گر، قزاق قاتل اور ہر انسانی اور خدائی قانون کا توڑنے والا ہے۔

(Prince of Beauvais) کی تصنیف کے اوراق پر کبھی کبھی حق و صداقت کی شعائیں بھی نظر آجاتی ہیں لیکن اس موقع پر ہماری توجہ کا مستحق William of Tripoli ہے (Heldebert, Ginbert) اور Prince of Beauvais کے مقابلہ میں اُسکا پایۂ علم کہیں بلند ہے۔ وہ اسلام اور اُس کے بانی کے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے وہ محمدؐ کو فریب کار

اور دغا باز شخص نہیں سمجھتا اور نہ اُس کی تصنیف بے بنیاد الزاموں اور تہمتوں کا ایک طومار ہے۔ لیکن وہ بحیرا راہب کے افسانے سے بےخبر نہیں ہے۔ اُس کو چند صحابہ کے نام بھی معلوم ہیں اور اسلام کے ابتدائی حالات نسبتہً معقول طریقے سے قلمبند کئے ہیں۔ لہٰذا ہمیں سننا چاہئے کہ ولیم اس بارے میں کیا کہتا ہے۔

"اُس سڑک پر جو شام سے مکہ کو جاتی ہے۔ سینا کے قریب ایک نصرانی راہب بحیرا رہتا تھا جس کے حجرہ میں اس سڑک سے گزرنے والے تاجر ٹھہرا کرتے تھے۔ بحیرا نے ایک خواب میں دیکھا کہ تاجروں میں ایک عرب لڑکا آئے گا جس کو فطرت اور قسمت نے کلیسا کو نقصان پہنچانے کے لئے چن لیا ہے۔ بحیرا نے قرآن و علائم سے معلوم کیا کہ وہ لڑکا محمدؐ ہے۔ بحیرا نے اُس پیشین گوئی کے خیال سے متاثر ہو کر فیصلہ کیا محمدؐ کی تربیت ایک عیسائی لڑکے کی حیثیت سے کی جائے۔ چنانچہ جب محمدؐ راہب کے گھر کے صحن میں آیا تو اس کے نیچے اور پست دروازے نہایت عالیشان ہو گئے جس سے محمدؐ کی آئندہ عظمت کا پتہ چلتا تھا۔ چونکہ محمدؐ کی پرداخت اور تربیت ایک عیسائی کی طرح ہوئی تھی لہٰذا محمدؐ کو اپنے قبیلہ کے لوگوں کی بت پرستی سے سخت نفرت پیدا ہو گئی۔ ایک نوجوان کی حیثیت سے محمدؐ نے تجارت کی غرض سے بہت سے سفر کئے اور ان کا متعلقہ نہایت دیانتداری سے انجام دیا۔ اُس کے آقا کی موت سے اور خدیجہ سے اُسکی شادی کے واقعے نے اُس کو ایک بڑا آدمی بنا دیا۔ عرب کے بہت سے لوگ اُس کے گرد جمع ہو گئے لیکن دس اشخاص اور سب سے زیادہ ابوبکر اُس سے گہرا رشتہ رکھتے تھے۔ لیکن اُس کے دوست بحیرا کی دوستی کو مشکوک نظروں سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ اُسکے دوستوں نے راہب کو مار ڈالا جب کہ محمدؐ ایک سفر کی تکان سے چور اور شراب کے نشہ میں بدمست ہو کر سو رہا تھا۔ جاگنے پر محمدؐ نے یقین کر لیا کہ وہ خود اُس کا قتل کرنے والا ہے اور شراب کے نشہ میں اُس حرکت کا ارتکاب ہوا ہے۔ چنانچہ اُس دن سے آج تک مسلمانوں میں شراب ممنوع چلی آتی ہے۔ بحیرا کے قتل کے بعد محمدؐ کے تمام جذبات رذیلہ اور سافلہ مشتعل ہو گئے اور فتوحات لوٹ مار اور غارتگری کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ شان و شوکت کی گیارہ سالہ زندگی کے بعد محمدؐ کا انتقال ہو گیا اور ایک لڑکی فاطمہ چھوڑی۔"

A[illegible]ellis of Montcenisu کی جو رائے قرآن کے متعلق ہے وہ اس قدر دلچسپ ہے کہ اُس کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ولیم کہتا ہے کہ محمدؐ کو ۴۰ سال کی زندگی کے بعد یہ یقین ہونے لگا

کہ اُس کو منصب نبوت عطا ہوا ہے اور جبریل وحی لاتے ہیں۔ اس وحی کو اُنکے دوست جمع کرتے جاتے تھے اور یہی قرآن کی ابتدا ہے۔ لیکن نصرانی مصنفین کی رائے اس معاملہ میں دوسری ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ محمد کی وفات کے پندرہ سال بعد محمد کے باقیماندہ صحابہ نے اپنے نبی کی تعلیمات قلمبند کرنیکی تجویز کی لیکن جن لوگوں کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا وہ اس کام کے ناقابل نکلے لہذا انہوں نے اس کام کے لئے اُن عیسائی اور یہودیوں کو منتخب کیا جو مسلمان ہو گئے۔ چنانچہ اُنہوں نے پرانے اور نئے عہد ناموں سے مواد حاصل کیا اور تھوڑی سی ترمیم کے بعد ایک کتاب کی صورت میں پیش کر دیا۔ اور اس طرح سے قرآن عالم وجود میں آیا۔ وہ نہایت زور سے اعلان کرتا ہے کہ مسلمان نہایت پکے موحد ہیں اور نہ صرف حضرت عیسیٰ کی عزت کرتے ہیں بلکہ حواریوں کو بھی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس کے خیال کے مطابق اسلام کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ کو محض انسان جانتے ہیں اور محمدؐ کو نبی مانتے ہیں۔

لیکن واعظ Nicoldlis of Montechristo جو تیرہویں صدی کے اختتام اور چودہویں صدی کے آغاز میں تھا اپنے معاصرین سے وسعت نظر اور بے تعصبی میں کہیں بالاتر نظر آتا ہے۔ ایک واعظ کی حیثیت سے وہ سالہا سال تک مسلمانوں میں رہا تھا اور قرآن سے نہایت اچھی واقفیت رکھتا تھا اگرچہ اُس نے اپنی زندگی کا مقصد مذہب اسلام کا رد قرار دیا تھا۔ لیکن محاسن اسلام سے چشم پوشی نہیں کرتا تھا۔ بلکہ اپنے ہم مذہبوں سے کہتا تھا کہ چند باتوں میں ہمیں اسلام اور مسلمانوں کو اپنا نمونہ سمجھنا چاہیئے۔ وہ تعجب آمیز مسرت کے ساتھ اسکا ذکر کرتا ہے کہ بغداد کی درسگاہوں میں قرآن کی تعلیم نہایت احتیاط سے دیجاتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ تین مہینہ سے زیادہ عرصہ تک وہ ریگستان کے شتربانوں کے ساتھ رہا لیکن تنگی اور مصیبت کے وقت بھی ایسا نہیں ہوا کہ اُنہوں نے مقررہ نماز فراموش کی ہو۔ Nicoldlis) نماز سے پہلے وضو کو جس کی اسلام نے تاکید کی ہے عیسائیوں کے لئے قابل اتباع سمجھتا ہے۔ وہ زکوٰۃ کی بہت تعریف کرتا ہے اور قانون خمس کو نہایت مفید چیز بتاتا ہے۔ وہ مسلمانوں کی خدا ترسی اور احترام خدا کا تذکرہ اس طرح کرتا ہے کہ وہ اپنی تمام تصانیف اللہ کے نام سے شروع کرتے ہیں اور اکثر الحمدللہ کہتے ہیں۔ اور اپنی مسجدوں میں جوتیاں اتار کر داخل ہوتے ہیں۔ الغرض اُس کی تصنیف اُس وقت کی عام تصانیف سے بالکل مختلف چیز ہے وہ اسلام اور اس کے

اصولوں کے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ حقیقت اس کی تمام تصنیف میں نمایاں ہے۔ وہ اسلام اور بانیٔ اسلام کو گالیاں نہیں دیتا بلکہ اپنے خیال کے مطابق اُس کے غلط اصولوں کی تردید منطقی دلائل سے کرنا چاہتا ہے اسلام اور نصرانیت میں جو نقاط مشابہت ہیں اُنکی تردید یا توجیہ اس طرح کی گئی ہے کہ یہودیوں اور بحیرا نے محمد کو نئے اور پرانے عہدناموں کی تعلیم دی تھی اور اگر کوئی نیک کلمہ ر William of Tripoli د Gerhard of Strasburg یا Nicoldlis of Montechristo کی زبان سے اسلام کے متعلق نکل جاتا ہے تو وہ "صدا بصحرا" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ اُس وقت کا کلیسائی شور و شغب۔ اسلام و نصرانیت کی حریفانہ حیثیت۔ باہمی بغض و عناد اس بات کی کب اجازت دیتا تھا کہ یورپ کے نقارخانہ میں (Nicoldlis) کی طوطی کی آواز کب سنائی دے۔ نہ صرف قرون وسطیٰ میں نبی کریم کی تصویر میں قصص و فسانے کا رنگ غالب ہے بلکہ ۱۸۲۹ء تک جبکہ Charles Foster کی Moham etanism Unveiled " شائع ہوتی ہے یہی کیفیت نظر آتی ہے۔ لیکن انیسویں صدی کے آخر نصف سے نبی کریم کی زندگی اور عقائد و اصول اسلام تاریخی روشنی میں آنا شروع ہوئے ہیں۔ ہمیں

Weil, Caussin de Perceval, P. Caetrani, Th. Noldeke. Krehl, A Springer, Sir W. Muir, von Kremer.

کا شکرگزار ہونا چاہیئے کہ اُنکی کد و کاوش کی بدولت ہم یورپ میں نبی کریم کی حیات طیبہ اور اسلام کے عقائد و اصول تاریخی شان میں دیکھتے ہیں۔

حالات حج

(گزشتہ سے پیوستہ)

اہل بمبئی حجاج کی خوب امداد اور خدمت کرتے ہیں۔ بعض تجار مسافرخانہ سے جہاز تک انکو پہنچانیکے لئے لاریاں مفت بھیجدیتے ہیں۔ کھانے بھی کھلاتے ہیں اور چائے اور شربت بھی پلاتے ہیں۔ یہی حال اسوقت ہوتا ہے جب حاجی حج کرکے واپس آتے ہیں اور بمبئی اترتے ہیں۔ انجمن خدام النبی خصوصیت کے ساتھ اس میں حصہ لیتی ہے۔ اس انجمن کی طرف سے چند آدمی ہمارے جہاز پر بھی تھے جنہوں نے قمران میں پہنچکر برف اور شربت کی سبیل لگائی ہے مکہ اور منا میں اور شاید عرفات میں بھی۔

جہاز پر سوار ہونے سے ایک دن پہلے سامان رکھا جاتا ہے۔ حجاج کو میں نے دیکھا کہ اجازت ملنے پر وہ اچھی جگہ لینے کے لئے عجلت کے ساتھ سیڑھی پر ایک دوسرے کو دھکا دیتے اور گراتے ہوئے آگے بڑھے۔ کمزور بوڑھوں اور بچوں کی عجیب حالت تھی۔ کئی زخمی ہوئے اور کئی کچل گئے۔ میں سوچنے لگا کہ یہ قوم جو اس قدر بے نظام اور خود غرض ہے وہ دنیا میں کسی کو وحشی کہنے کا حق نہیں رکھتی۔

اس جہاز میں فرسٹ کلاس کا ڈک بہت بڑا اور وسیع تھا۔ اس وجہ سے ہم لوگوں کو ہر قسم کا آرام تھا۔ کھانے پینے کی ایسی آسائش تھی کہ حضر میں بھی مشکل سے ہوسکتی ہے اور یہ مولانا عبدالقادر صاحب کا فیض اور انتظام تھا۔

مولائے موصوف سے پیشتر سے مجھے شناسائی تھی لیکن اس سفر کی رفاقت میں انکے عقلی او علمی اور ظاہری اور باطنی اوصاف کو دیکھکر مجھے معلوم ہوا کہ وہ اسلامی پنجاب کے تاج ہیں۔

حجاج کے جہازوں میں جو ہندوستان سے جاتے ہیں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ ان کو کھانا

اپنے ہاتھ سے پکانا پڑتا ہے جس کی وجہ سے جہاز میں دھواں، گرمی اور فی الجملہ گندگی بھی رہتی ہے۔ حالانکہ یہی جہاز دوسرے ممالک مثلاً جاوا، ساترا اور سنگاپور وغیرہ سے جب حاجیوں کو لیجاتے ہیں تو انکے کھانے کا بندوبست کرتے ہیں۔ اس معاملہ میں کمپنیوں سے گفتگو کیجائے تو آسانی سے یہ دقت رفع ہوسکتی ہے کیونکہ حجاج کو سخت تکلیف ہوتی ہے اور بڑا سامان لادنا پڑتا ہے یہانتک کہ لکڑی چیرنے کے لئے کلہاڑیاں بھی ساتھ رکھنی پڑتی ہیں۔

ملاجی[1] یعنی مولوی نثار احمد صاحب کانپوری بھی اس جہاز پر تھے جو روزانہ اپنے مریدوں کو جمع کرکے وعظ فرماتے تھے۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ بمبئی سے میں کوئی زادراہ لیکر نہیں چلا تھا مگر اللہ کی مہربانی دیکھئے کہ تورمہ اور پلاؤ دیتا ہے۔ میں نے کہا یہ مواعظ جو آپ کی جھولی میں تھے۔

ملاجی کا یہ آٹھواں حج تھا۔ انکو اس سفر کا اچھا تجربہ ہے۔ اور آدمی نہایت مستعد و جفاکش ہیں۔ ساتھیوں کو خوب آرام دیتے ہیں۔ واپسی میں بھی میرا انکا ساتھ اسی جہاز پر رہا۔ انہوں نے جو آرام پہنچایا میں اسکا شکرگذار ہوں۔

وہابیوں سے نہایت بیزار ہیں۔ یہانتک کہ جدہ سے مکہ اور مکہ سے مدینہ کا سفر پاپیادہ کیا تاکہ کوشان[2] نہ دینا پڑے اور انکا کوئی پیسہ وہابی حکومت کو نہ ملے۔ میں نے یہ بھی سنا کہ انہوں نے نازی کمپنی سے اپنے جہاز میں سے وہ پندرہ روپے بھی معاف کرالئے تھے جو کمپنیوں کو فی کس حجازی گورنمنٹ کو دینے پڑتے ہیں۔

ایکدن ہماری حقہ نوشی کی محفل میں جو جہاز پر اکثر گرم رہتی تھی ملاجی بیٹھ گئے۔ اور فرمانے لگے کہ مسجد حرم کا ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ چاہے کتنے ہی آدمی آجائیں وہ پُر نہیں ہوتی

---

[1] مولوی صاحب موصوف اپنے آپ کو ملاجی کہتے ہیں۔ یہ لقب غالباً انہوں نے ملا سیف الدین طاہر کے جواب میں اختیار کیا ہے

[2] کوشان رومنہ کو کہتے ہیں جس کے ساتھ ایک حقیر سی رقم بھی دینی پڑتی ہے۔

دوسرا یہ کہ بدو پہاڑوں سے پتھر لاد کر لاتے ہیں وہ قدرت الٰہی سے تربوز بنجاتے ہیں۔ ان کے اس بیان سے محفل پر جو کیفیت طاری ہوئی تھی اس کے شاہد حافظ حلیم صاحب کانپوری ہیں اور غلام کبریا صاحب انجنیر۔

جہاز میں آقائے معتمد الاسلام شیرازی بھی تھے۔ ان سے شعر و شاعری کے سلسلہ سے تعارف ہوا۔ آدمی نہایت وسیع الخیال تھے اور مسلمانوں کی فرقہ بندیوں سے سخت نالاں۔ کہتے تھے کہ ان مذہبی تفریقوں کا اثر ہمارے دنیاوی معاملات نہایت برا پڑ رہا ہے۔ انکے ایک بھائی جو معمر اور وجیہ تھے مجتہد تھے۔ اثنائے گفتگو میں وہ بھی آکر بیٹھے۔ فرمانے لگے کہ یہ اختلافات اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ دونوں فریق کے اہل علم چاہیں بھی تو اتفاق نہیں کر سکتے۔ میں نے کہا یہ اختلاف ڈالا کس نے۔ علاوہ بریں فروعی امور میں اتفاق نہ بھی ہو تو کیا حرج ہے۔ ہم میں اصولی اسباب اتفاق کے اس قدر ہیں کہ اگر چاہیں تو متحد ہو سکتے ہیں۔

بمبئی کے ایک مرشد بھی جو شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سے ہیں ہمارے جہاز پر تھے۔ آدمی دلچسپ اور خوش آواز تھے۔ ہر حلقہ کے سیاسیات علیحدہ ہوتی ہیں۔ ان کے کچھ مرید جنوبی افریقہ ناٹال وغیرہ میں ہیں۔ وہاں قادیانی مبلغ پہنچ گئے تھے اور خواجہ کمال الدین کا بھی دورہ ہوا تھا۔ پیر صاحب موصوف کو انکا مقابلہ کرنا پڑا۔ آکی تمام تر گفتگو اپنی انہیں فتوحات کے متعلق تھی جو انہوں نے اس جدید مرزائی اثر پر حاصل کی تھیں۔

اثنائے گفتگو میں ایک دن فرمانے لگے کہ ہندوستان میں جہاں سوائے مذہب حنفی کے اور کوئی مذہب نہ تھا۔ کہاں سے وہابی اور قادیانی وغیرہ فرقے پیدا ہوگئے۔ میں نے کہا کہ حالات اور خیالات میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ آپ کے جد امجد شیخ جیلانی حنبلی تھے پھر آپ کیسے حنفی بن گئے؟

جدہ میں جہاز ساحل سے دور کھڑا ہوتا ہے، کیونکہ کنارے پر پہاڑیوں کے چکر ہیں جن میں وہ جا نہیں سکتا۔ جدہ کی پنج اور شش منزلہ عمارتیں جو سفید مٹی کی بنی ہوئی ہیں جہاز

پچے نہایت شاندار معلوم ہوتی ہیں۔ چنانچہ وہاں کے ایک رئیس جو ہم لوگوں کو جہاز پر لینے آئے تھے کہنے لگے کہ دیکھئے یہ ہمارا لندن ہے یہ ہمارا پیرس ہے۔

جدہ میں حاجیوں کے لئے مسافر خانے کم ہیں۔ اور اہل جدہ تھوڑی رقم لے کر محض دو ایک روز کے لئے ان کو اپنے مکانوں میں ٹھہرانا اور اپنے ساز و سامان و فروش کو خراب کرنا پسند نہیں کرتے۔ اس لئے فی الجملہ حجاج کو یہاں ٹھہرنے کی تکلیف ہے۔ بعض ہندوستانی ریاستوں کے رباط یہاں ہیں لیکن وہ بالکل دوسرے مصرف میں ہیں۔ حجاج کے کام نہیں آتے۔ کاش وہ ریاستیں اسکی طرف توجہ کرتیں۔ خاصکر رامپور۔

جدہ چھوٹا سا شہر ہے لیکن شاندار ہے۔ وہاں الفلاح نامی ایک مدرسہ ہے جس میں معمولی نوشت و خواند کی تعلیم ہوتی ہے۔ اس کی عمارت اچھی ہے۔ ایک دوسرا مدرسہ حکومت کی طرف سے بھی قائم ہوا ہے۔

جدہ اور نیز مکہ میں موٹر کمپنیاں حجاج کے لئے کثرت سے ہیں۔ اس وقت حجاز میں ۶۰۰ سے زائد موٹریں اور لاریاں کرایہ پر چل رہی ہیں۔ سب سے بڑی کمپنی شرکت سعودیہ ہے جو امرا حجاز کی ہے۔ النجاح کمپنی میں ہندوستانیوں کا حصہ زیادہ ہے۔ یہی سب سے آرام دہ ہے کیونکہ اس میں پنجابی لڑکے ڈرائیور ہیں جو ہوشیاری کے ساتھ گاڑیوں کو چلاتے ہیں اور حجاج کو آرام پہنچاتے ہیں۔ دوسری کمپنیوں میں زیادہ تر تکروری (سوڈانی حبشی) یا عرب ڈرائیور ہیں جو بے تحاشا چلاتے ہیں اور اپنی ناواقفی سے گاڑیوں کو بھی خراب کرتے ہیں اور حاجیوں کو بھی تکلیف دیتے ہیں۔ مکہ اور جدہ کے درمیان میں تھوڑا سا حصہ ریگ رواں کا پڑتا ہے۔ اس میں ہم نے بہت سی موٹریں اور لاریاں پھنسی پڑی دیکھیں جن میں سے کوئی تو ٹوٹ گئی تھی اور کسی کا انجن جل گیا تھا۔ پنجابی ڈرائیور اس ریتے میں سے صفائی کے ساتھ موٹریں نکال لیجاتے ہیں۔

بجز اس چار پانچ میل کے جس میں ریگ رواں ہے بقیہ راستہ موٹر کے لئے برا نہیں ہے۔

اب حکومت کی طرف سے سڑک بن رہی ہے جو غالبًا سال آئندہ تک تیار ہو جائیگی۔ سڑک ہموار کرنے والے دو انجن بھی راستہ میں ہم نے دیکھے۔ لیکن ساری دقت پانی کی ہے۔

ہم خصوصیت خاص کی وجہ سے اپنا موٹر مسجد حرام تک لیجا سکے۔ ورنہ عام طور پر حجاج مکہ سے باہر ہی "کوشان" کی چوکی پر موٹروں سے اتار دیئے جاتے ہیں اور وہاں سے پیدل شہر میں داخل ہوتے ہیں۔

یہ سارا خطہ غیر ذی زرع یعنی باصطلاح پٹواریان "نا ممکن" ہے اور کیسا نا ممکن جس میں نہ کہیں گھاس ہے نہ سبزی نہ جھاڑی ہے نہ کھجور۔ جدہ سے مکہ تک راہ میں پچاسوں اونٹوں کی لاشیں پڑی دیکھیں مگر پانی کے فقدان سے نہ کوے تھے نہ چیل۔ نہ گدھ نہ گیدڑ۔

مکہ کی عمارتیں جدہ سے بھی زیادہ شاندار اور بڑی ہیں۔ اسکی آبادی کا اندازہ ایک لاکھ ہے مگر گنجایش دو لاکھ سے زائد نفوس کی ہے۔ یہاں عربی گھرانے کم ہیں زیادہ تر سوڈانی اور ہندی و جاوی وغیرہ ہیں۔ بازاری اور مزدوری پیشہ طبقہ بالعموم سوڈانیوں کا ہے۔ قہوہ خانے بہت ہیں۔ جن کے آگے شغدف والی چارپائیاں سیکڑوں کی تعداد میں دور تک پڑی رہتی ہیں۔ اور انہیں پر قہوہ اور چائے نوشوں کا صبح اور شام جمگھٹا رہتا ہے۔

بازاروں میں کھانے پینے اور ضروریات کے سامان بھرے پڑے ہیں لیکن پانی کی قلت ہر جگہ نمایاں ہے نہ بازار کے آدمی صاف ہیں نہ کپڑے نہ میز نہ برتن۔

باشندے بالعموم مجاورانہ ذہنیت کے ہیں۔ نہ ان میں تمکنت ہے نہ رعونت نہ غصہ نہ جوش انکا سارا کاروبار حجاج کے لئے ہے اور وہی انکی آمدنی کا ذریعہ ہیں۔ ان کو خوش رکھنا اور آرام پہنچانا چاہتے ہیں لیکن تھوڑے نفع کی توقع پر۔ سیدھے اور نیک لوگ ہیں۔ خود معتبر ہیں اور دوسروں پر اعتبار کرتے ہیں۔ اور جب سے آل سعود کی حکومت قائم ہوگئی ہے بالعموم سب کے سب نماز اور جماعت کے پابند ہوگئے ہیں۔ ورنہ اس سے پہلے اذانیں ہوتی تھیں اور لوگ قہوہ خانوں میں بیٹھے چائے اور سگرٹ پیتے۔ گپ شپ کرتے بلکہ تاش کھیلتے رہتے تھے جواب تقریبًا

نامکن ہوگیا ہی۔ یہی وجہ ہے کہ مسجد حرم میں نمازیوں کی کثرت رہتی ہے۔ چنانچہ پہلے ہی دن مغرب کی نماز میں میں نے دیکھا کہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں آدمی صف بستہ باہر سڑک پر کھڑے ہوئے جماعت میں شریک ہیں۔ اس وقت ملاجی بہت یاد آئے۔

مسجد میں تقریباً ۸۰ ہزار آدمیوں کی گنجایش ہوگی۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ کیا سوچکر ترکوں نے اس کی عمارت مربع یا مستطیل بنوائی ہے کیونکہ اسکی وجہ سے ہر چہار سمت گوشوں پر کعبہ کی طرف رخ کرنیکے لیے صفیں گول کرنی پڑتی ہیں جس سے جا بجا سے انکا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہی اور ہر دالان میں جہاں چھ صفوں کی گنجایش ہوسکتی تھی تین صفوں کی بھی نہیں رہتی۔ یہ مسجد بجز مدور شکل کے اور کسی صورت میں نہیں ہونی چاہئے۔

مطاف میں سنگ مرمر ہے اگرچہ ادنیٰ قسم کا ہے۔ اس کی وجہ سے طواف میں آسانی ہوتی ہے کیونکہ وہ دوپہر کو زیادہ گرم نہیں ہوتا۔

موسم حج میں ۲۴ گھنٹوں میں سے ایک منٹ کے لئے بھی یہ جگہ خالی نہیں رہتی خاصکر صبح اور شام بڑا ہجوم رہتا ہے اور ہزاروں مسلمان پروانوں کی طرح کعبہ کے ارد گرد طواف میں مشغول رہتے ہیں۔ جب آپ مسجد میں داخل ہوں گے دور ہی سے مطوفوں کا شور سنائی دیگا جو ایک ایک ٹولی اپنے پیچھے لئے ہوئے طواف کرا رہے ہیں۔ بلند آوازسے دعائیں پڑھتے جاتے ہیں اور پیچھے پیچھے حجاج انہیں لفظوں کو دہراتے ہیں۔

بڑا ہجوم حجر اسود پر ہوتا ہی کیونکہ ایک وقت میں صرف ایک ہی شخص اسکا بوسہ لے سکتا ہے اور ہر طواف کرنے والا اس تقبیل کا خواہاں رہتا ہے۔ اس وجہ سے وہاں خواجہ سرا بید لئے ہوئے کھڑے رہتے ہیں اور جو تقبیل میں ضرورت سے زیادہ دیر لگاتا ہے اس کے مونڈھے پر مارتے ہیں جس سے وہ فوراً آگے بڑھ جاتا ہے اور دوسرے کو تقبیل کا موقع ملتا ہے۔

حجاج اس تقبیل کے ایسے عاشق ہوتے ہیں کہ جماعت کے وقت بھی حجر اسود سے لپٹے رہتے ہیں۔

بڑی مشکلوں سے خواجہ سرا مغرب اور صبح کے وقت مطاف میں صفیں کھڑی کر پاتے ہیں۔ اس پر بھی بعض لوگ صفوں کے آگے سے نکلتے ہوئے جاکر لیٹ جاتے ہیں۔ اور بعض بعض جماعت میں شریک ہی نہیں ہوتے منتظر بیٹھے رہتے ہیں، سلام پھرتے ہی بلکہ پہلے ہی اچھل کر وہاں پہنچتے ہیں۔ خواجہ سرا صفوں کی ابتری کے خیال سے فوراً اٹھ کر ایسے لوگوں کو روکتا ہے اور اور بزور بید پھر نظام قائم کرتا ہے۔

مولانا فاخر صاحب الہ آبادی نے مجھ سے کہا کہ دیکھئے یہ وہابی قرآن کی نص صریح وَمَنْ دخلہ کان آمنا کے کس قدر خلاف کرتے ہیں کہ حرم میں حجاج کو بید سے مارتے ہیں۔ میں نے کہا یہ انتظام وہابیوں سے بہت پہلے سے چلا آتا ہے۔ اور اگر اس آیت کے یہی معنی لئے جائیں کہ وہ دنیاوی گرفت یا سزا سے محفوظ رہے گا جو میرے نزدیک صحیح نہیں ہیں تو بھی مسجد کے اندرونی نظام کو قائم رکھنے کے لئے یہ خواجہ سرا ضروری ہونگے۔ ورنہ طواف اور نماز با جماعت سب میں مشکل پڑ جائے گی۔

مولانا کو دوسری شکایت یہ تھی کہ عورت اور مرد ساتھ طواف کرتے ہیں کسی مصری عورت نے انکو دھکا بھی دیدیا تھا جس سے پہلو میں درد بتلاتے تھے۔

میں نے کہا کہ موتمر میں یہ طے ہوا تھا کہ صبح اور شام ایک ایک گھنٹہ عورتوں کے لئے مخصوص کر دیا جائے۔ لیکن یہ چل نہ سکا کیونکہ انکے ساتھ ذی محرم بھی آنے لگے اور مخلوط طواف ہونے لگا۔ علاوہ بریں علما نے فتوے دئے کہ زمانہ رسالت سے جو دستور چلا آتا ہے اس میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ لیکن تاہم سلطان اس زمانہ میں مخلوط طواف کو مصلحت کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اور انہوں نے خیال ظاہر کیا ہے کہ میں دونوں جنسوں کے طواف الگ الگ رکھوں گا۔ انشاءاللہ

نجدی اور یمنی قافلہ بالعموم ۵ر ذی الحجہ کو آتا ہے۔ وہ لوگ جوق در جوق طواف کے لئے آتے ہیں جس سے دوسروں کو حجر اسود تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہاں فوجی سپاہی

متعین ہو جاتے ہیں جو انتظام ٹھیک رکھتے ہیں۔ نجدیوں کو میں نے اس سے زیادہ مار کھاتے دیکھا جتنی کہ دوسرے حاجیوں پر پڑتی ہے۔ لیکن خصوصیات قومی کا اختلاف اسمیں بھی نمایاں تھا ہندی پر جہاں بید پڑی فوراً بھاگا۔ افغانی دو ایک ضرب زیادہ برداشت کرتا تھا مگر ایسی تیز نگاہوں سے دیکھتا ہوا آگے بڑھتا تھا کہ بس چلتا تو مارنے والے کو پھاڑ کھاتا۔ نجدی ذہن کا پکا صرف تقبیل سے غرض رکھتا تھا اس سے مطلب نہیں تھا کہ کس نے مارا اور کس قدر مارا جاوی ایسی حالت میں دور ہی سے استلام پر قناعت کرتا تھا۔

بعض متعصب ہندی جن کے جہاز پر سوار ہونیکی وحشت آمیز کیفیت میں لکھ چکا ہوں، نجدیوں اور یمنیوں کے اس ہجوم کو وحشت قرار دیتے تھے حالانکہ انکو صرف دو دن طواف اور سعے کے لئے ملتے ہیں اور تعداد میں ہوتے ہیں ۶۰-۷۰ ہزار سے زیادہ پھر ٹوٹ نہ پڑیں تو اور کیا کریں۔

انکے عورتیں اور بچے، جوان اور بوڑھے سبکے سب طواف کی دعاؤں اور جملہ مناسک حج سے اچھی طرح واقف تھے۔ انکو کسی معلم یا مطوف کی حاجت نہیں ہوتی تھی۔

اندرون کعبہ میں لوگوں کو داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ شیبی صاحب ایک دوکاندار کی طرح در کعبہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اور سیڑھی لگا دی گئی تھی جس پر سے لوگ چڑھ رہے تھے۔ مجھ پر یہ نظارہ گراں گذرا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان لوگوں کے پاؤں میرے قلب کے اوپر پڑ رہے ہیں۔ کاش دنیا میں یہ ایک جگہ تو ایسی مقدس سمجھی جاتی کہ گنہگار انسانوں کی آلودگی سے پاک رکھی جاتی۔ نبی کا ہر فعل سنت نہیں ہوتا بلکہ ان میں سے بعض خصوصیت خاص رکھتے ہیں اور سنت سے بالاتر ہوتے ہیں۔

مسجد حرم میں رات کے وقت کم سے کم ۵-۶ ہزار آدمی سوتے ہیں۔ مجھے یہ امر بھی اس کے احترام کے منافی معلوم ہوا۔

اگرچہ اہل سنت کی مذہبی تفریق کے مظاہر یعنی چاروں مصلے کعبہ کی چاروں سمت میں

اپنی شکل میں قائم ہیں۔ مگر اب جماعت صرف ایک ہی ہوتی ہے کسی وقت شافعی امام پڑھاتا ہے کسی وقت حنفی۔ کبھی حنبلی اور کبھی مالکی جس کے پیچھے بالعموم ہر فرقہ کے لوگ نماز پڑھ لیتے ہیں۔ یہانتک کہ غیر اہل سنت بھی۔ یہ اسلامی اخوت کا منظر بہت دلفریب ہے۔ جس سے توقع پیدا ہوتی ہے کہ شاید مسلمان وحدت اور روا داری کا سبق سیکھیں گے اور فرقہ بندی کو مٹا دینگے۔

کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو بیٹھے رہتے تھے اور جماعت میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ حنفیہ عصر کی نمازیں کم آتے تھے۔ کیونکہ انکے نزدیک دو مثل پر وقت ہوتا ہے اور وہاں ایک مثل پر اول وقت پڑھی جاتی ہے۔

ہندی حجاج کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ کراچی اور بمبئی سے جو لوگ گئے تھے انکا شمار ۲۱ ہزار تھا۔ اسمیں ۴ ہزار کابلی اور ترکستانی تھے۔ بقیہ ۱۷ ہزار ہندی۔ ہندی حاجیوں کی تعداد میں یہ کمی غالباً ہندوستان میں قلت پیداوار اور قحط کے باعث تھی۔ ورنہ سال گذشتہ اس سے پورے دگنی تعداد میں یہاں سے لوگ گئے تھے۔

ہندوستانی حاجیوں کی سب سے بڑی تعداد ۲۵ ہزار شریف عون الرفیق کے زمانہ میں گئی تھی جبکہ مکہ کے ترکی حکام بھی بہت نیکدل مشہور تھے۔ لیکن سال گذشتہ ۲۴ ہزار تھی۔ جس کی بڑی وجہ اس امن وامان کی شہرت تھی جو نجدی حکومت کی بدولت حجاز میں قائم ہو گیا ہے۔ حالانکہ یہی سال تھا جس میں خدام الحرمین نے التوائے حج کے رزولیوشن پاس کئے تھے اور ہند کے طول عرض میں اسکا پروپگنڈا کرتے پھرتے تھے۔

جاوی حجاج کی تعداد ۵۰ ہزار تھی اور یہ ہمارے ہندی بھائیوں کی طرح بوڑھے اور سن رسیدہ لوگ نہ تھے۔ بلکہ بالعموم لڑکے اور نوجوان تھے۔ مرد بھی اور عورتیں بھی۔ مسجد حرم میں رات دن ہزاروں کی تعداد میں موجود رہتے تھے لیکن کبھی انکو میں نے اس میں بات چیت کرتے نہ دیکھا۔ نماز، تلاوت۔ دعا اور ذکر میں مشغول رہتے تھے۔ یا اپنے کسی عالم کے حلقہ میں بیٹھے ہوئے مناسک حج سیکھتے تھے۔ بخلاف اس کے ہمارے ہندی حجاج چار بھی جمع ہو جاتے تھے تو دنیا بھر کی گپیں

ہانکتے تھے۔ قبوں کی داستان۔ وہابیوں کی مذمت۔ خلافت کمیٹی کے جھگڑے۔ جہاز کے واقعات اور کھانے پینے کے حالات وغیرہ۔

مصری بھی زیادہ تعداد میں آئے تھے۔ تقریباً دس ہزار۔ انکی عورتوں میں پردہ نہیں، نہ جاویوں میں ہی مگر دیگر اقوام مسلمہ خاصکر عرب کی عورتیں پردہ کی سخت پابند تھیں۔

مطاف میں بجلی کی روشنی ہوتی ہے جس کا انجن حمیدیہ کے متصل ہے اور انجنیر میاں اسمٰعیل ذبیح بدایونی ہیں جو نہایت دلچسپ، ادیب اور متواضع شخص ہیں۔ کہتے تھے کہ سلطان نے اب ایک دوسرا بڑا انجن منگوایا ہے جس سے سارے حرم میں برقی روشنی ہو سکے گی۔ آجکل گیس کی روشنی ہوتی ہے جس کے لئے اہل خیر تبرکاً رقمیں جمع کر دیتے ہیں۔

زمزم پر سلطان کیطرف سے سبیل لگی ہوئی ہے اور ہر شخص کو ہر وقت اسکا پانی مل سکتا ہے۔ سبیل کے اخراجات کے لئے حکومت فی حاجی کچھ تھوڑی سی رقم بھی لیتی ہے۔

بعض حجاج کی یہ حرکت بھی عجیب حیرت افزا تھی کہ وہ دامان کعبہ سے لپٹ کر دعائیں کرتے کرتے اندر ہی اندر چاقو یا قینچی سے اس میں سے ایک ٹکڑا تعویذ بنانے کے لئے کاٹ لیتے تھے۔ میں نے ایک دن دیکھا کہ ایک ہندوستانی جو جبہ و دستار سے آراستہ تھے دن کی روشنی میں اس جرم کا ارتکاب کر رہے تھے۔ خواجہ سرا نے دیکھ پایا اور بید مارتے مارتے انکو دور تک بھگا دیا۔ مجھے ہنسی بھی آتی تھی اور رونا بھی۔

دسویں شب کو مسجد خالی رہتی ہے کیونکہ لوگ حج کو چلے جاتے ہیں اس وجہ سے دستور یہ ہے کہ اسی رات کو جدید غلاف کعبہ کو پہنایا جاتا ہے۔ ہم نے حج سے واپس آکر دیکھا تو اس نئے غلاف میں بھی دو تین جگہ دست درازیاں ہوئی تھیں۔ اور ٹکڑے کاٹے گئے تھے۔

مکہ مکرمہ اکثر برائیوں اور فواحش سے پاک ہے۔ باشندے دیندار اور باعفت ہیں۔ وہاں نہ سینما ہے نہ تھیٹر۔ نہ ہارمونیم نہ فونوگراف نہ جلوس نہ بینڈ۔ نہ لڑائی نہ جھگڑے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیطان اس خطہ سے باہر ہے۔ اتنا بڑا اجتماع تھا لیکن نہ کوئی ہنگامہ ہوا نہ شورش۔ نہ ڈنڈے

پٹنے نہ لٹھ چلے جو ایسے اژدحاموں میں ہر جگہ عام ہیں۔ بازار میں جائیے تو صفا سے مروہ تک سعی کرنے والوں کی دعائیں سنائی دیں گی اور حرم میں آئیے تو طواف کرنے والوں کی لبیک۔ نہ راگ ہے نہ باجا۔ نہ رقص ہے نہ سرود۔ نہ وجد ہے نہ حال۔ نہ سماع ہے نہ قوال۔ ہمارے مہربان مولانا فاخر صاحب نے غالباً اسی وجہ سے گھبرا کر کہا کہ وہابیوں کی بدولت یہاں مولود بھی تو نہیں ہو سکتا ورنہ حرم میں دھوم دھام سے محفل میلاد اور نعت خوانی ہوتی۔ میں نے کہا کہ اس سے قدیم تر مرثیہ خوانی کی رسم ہے۔ شیعہ بھی اگر کہنے لگیں کہ ہم اس میں مجلس کریں گے تو آپ کس دلیل سے اُن کو روک سکیں گے؟

سلطان کا مسلک یہ ہے کہ ہر شخص خواہ وہ کسی فرقہ کا ہو اپنے خیال کے مطابق حج کرلے اور فرائض بجالا کر واپس چلا جائے۔ تبلیغ کی اجازت نہیں ہے کیونکہ وہ اس مقدس مقام کو مذاہب اسلامی کا دنگل نہیں بنانا چاہتے۔ مجھے معلوم ہوا کہ ہندوستان کے ایک فرقہ کے لوگوں نے سلطان سے اجازت چاہی کہ ہم اپنی کتابیں یہاں بیچیں اور اپنے رسالے تقسیم کریں انہوں نے کہا کہ اپنے عقیدہ کے مطابق حج کر کے چلے جاؤ اور اگر اس قسم کی حرکت کی تو یاد رکھو بلا سنگسار کئے نہیں رہوں گا۔

جس طرح نجدیوں کو دس سال سے خصوصیت کے ساتھ قبہ شکنی کی تعلیم دی گئی ہے اسی طرح ہندوستانیوں کو بھی وہابیوں کو بددین اور لا مذہب سمجھنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ان میں سے بہت سے ایسے تھے جن کے دلوں میں وہابیوں کی اس قدر عداوت اور دشمنی متمکن تھی کہ وہ مسجد حرم میں انکے لئے بددعائیں کرتے تھے۔ حکومت کو ان میں سے بعضوں کے حالات معلوم تھے لیکن اس نے مطلقاً گرفت نہیں کی۔ صرف بمبئی کا ایک زبان دراز واعظ جو علی الاعلان وہابیوں کی برائیاں کرتا تھا پکڑا گیا تھا۔ قاضی عبداللہ بن حسن نے اثبات جرم کے بعد اس کو پانچ سال قید کی سزا دی مگر میں نے سنا کہ ہمارے بعض ساتھیوں کی سفارش سے سلطان نے معافی عطا کی اور زاد راہ اور سفر خرچ کے لئے پچاس گنی دے کر رخصت کر دیا۔

ان متعصبین میں سے بہت سی لوگوں کو میں نے دیکھا کہ وہ حکومت یا نجدیوں کے خلاف جو بات سنتے فورًا قلم بند کرتے اور خصوصیت کے ساتھ لکھنؤ کے اخبار ہمدم یا بمبئی کے اخبار خلافت میں بھیجتے۔ ان کو اس سے غرض نہ تھی کہ یہ صحیح ہے یا غلط۔ افترا ہے یا تہمت بر نعیق غراب اور نہیق حمار پر جس سے وہابیوں کی برائی نکلتی ہو تصدیق کی مہر ثبت کردیتے تھے چنانچہ ہندوستان آنے کے بعد اخبار ہمدم لکھنؤ کا ایک نمبر ۱۵ر جولائی کا مجکو ملا۔ اس میں کسی شخص عبدالرزاق نامی کا خط جو ۳ر جون کو یعنی حج سے واپسی کے تیسرے دن لکھا گیا ہے۔ چھپا ہے۔ اس میں مندرج ہے کہ نجدیوں نے عرفات میں لوگوں کو پتھروں سے مارا چنانچہ ممبران وفد میں سے اسمٰعیل غزنوی اور داؤد غزنوی اور میرا نام لکھا تھا کہ یہ لوگ پٹے۔ یہ ایسا افترا محض ہے جس کو پڑھ کر مجھے ہنسی آئی۔ کیونکہ اس قبیل کا کوئی واقعہ خواب میں بھی نہیں گذرا چہ جائیکہ بیداری میں۔ اور نہ اس قسم کے واقعہ کا امکان تھا کیونکہ اہل نجد عربی شرافت کے وارث ہیں جن کے یہاں مہمان نوازی انسان کا اولین فرض ہے۔

مولوی اسمٰعیل غزنوی آج کل غالبًا مصر میں ہیں مگر مولوی داؤد غزنوی کے ہاتھ میں ایک اخبار ہے وہ تصدیق کرسکیں گے کہ یہ سارے کا سارا خط کس قدر غلط اور جھوٹ ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ میدان عرفات میں پانی کا انتظام اچھا تھا لیکن اس کو نظام حیدرآباد کا کارنامہ قرار دیتا ہے۔ پھر لکھتا ہے کہ وہابیوں نے ظلمًا منا میں مسجد خیف سے حجاج کو نکالدیا اور یہ نہیں ظاہر کرتا کہ اس مقدس مسجد میں جس کا فرش تمام تر ریت کا ہے ان ڈیرے ڈالنے والوں نے کس قدر غلاظت جابجا ڈال رکھی تھی۔ اس کا یہ بھی بیان ہے کہ تمام حجازی حکومت سے بیزار ہیں۔ معلوم نہیں کس حجازی سے اس نے گفتگو کی میرا خیال یہ ہے کہ صرف اپنے معلم سے کوئی بات سنی ہوگی جو حکومت کی شدید نگرانی کی وجہ سے اب حجاج کو لوٹ نہیں سکتے اور شکایت کرتے ہیں۔ ہمدم کے اسی نمبر میں ایک خط اور بھی تھا وہ بھی اسی قسم کا تھا۔

بالعموم یہ لکھنے والے ایسے لوگ تھے کہ تعصب نے انکی آنکھوں پر پٹیاں باندہ رکھی تھیں۔ جو واقعات ان کی آنکھوں کے سامنے سے گذرتے تھے ان کو بھی نہ سمجھتے تھے نہ سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ صرف وہابیوں کے مظالم اور معائب کی ان کو جستجو تھی اور بس۔

مثل الذباب یراعی موضع العلل

(باقی آیندہ)

غزل

از جناب مولوی محمد یوسف صاحب استاد مخدمیہ لے دی اسکول دہلی

شوق فزوں ہے کس قدر طوف حریم ناز کا ذرہ ہر اک ہے مضطرب رہ گذر نیاز کا
باقی رہا نہ امتیاز کچھ بھی نیاز و ناز کا پردہ کبھی جو اٹھ گیا باب طلسم راز کا
سجدہ کناں ہو ہر نفس باب حریم ناز کا پایہ بہت بلند ہے شیخ مری نماز کا
گاہ فراق کی تپش گاہ نشاط آرزو بزم خیال میں مری رنگ ہے سوز و ساز کا
ہیبت یوم رستخیز قلب میں جاگزیں ہو گیا روز قیام سایہ ہے میری شب دراز کا
یاد خدا میں محو تھا سجدہ بتوں کو کر لیا کس کو میان بیخودی ہوش ہو امتیاز کا
شعلۂ طور سوز سے پردۂ راز کھل گیا جلوہ پر عتاب تھا چشم کرشمہ نواز کا
خوگر غم نے ترک کی سعی نشاط زندگی ہمت بے نیاز پر شکر ہے بے نیاز کا
حد سے زیادہ بڑھ چلیں قلب کی اضطرابیاں درد کہیں الٹ نہ دے پردہ حریم ناز کا
سنئے نہ سرگزشت غم دل نہ ہو وقف اضطراب درد فزا ہے ماجرا صدمۂ جاں گداز کا

تجھ سے نہاں نہیں اثر میری حقیقت خیال
تابع دلنواز ہوں بندہ ہوں بے نیاز کا

غزل

مولنا سید شرف الدین صاحب یاسؔ ٹونکی۔ استاذ جامعہ ملیہ

نہ عشرت کی تمنا ہے نہ محفل کی تمنا ہے　　فقط ایک خلوتِ غم آشنا دل کی تمنا ہے
تری دریوزگی میں لطف آتا ہے اسے ورنہ　　تجھے معلوم ہے جو تیرے سائل کی تمنا ہے
نہ نکلے کوئی ارماں بس یہی ارماں ہے لے دیکر　　میرے دل کی تمنا ہی میری دل کی تمنا ہے
شرف حاصل کرے غربت میں میری نارسائی کا　　یہی اک اک قدم پر رنج منزل کی تمنا ہے
یہ مد و جزر سب جذبِ محبت کے کرشمے ہیں　　ہم آغوشی باہم بحر و ساحل کی تمنا ہے
کچھ ایسی عافیت میں تیرے دیوانے نظر آئے　　کہ اب دیوانگی ہر ایک عاقل کی تمنا ہے
میری تربت بنے یونہی زمینِ کوئے جاناں میں　　الٰہی جس طرح دل میں میری دل کی تمنا ہے
تمہارا تیر دل میں آرزو بن کر جو آیا ہے　　نہ نکلنے یہ تمنا اب یہی دل کی تمنا ہے

دل پر آرزو نے زندگی بھر خاک چھنوائی
بس اب اے یاسؔ اک بے آرزو دل کی تمنا ہے

روپیہ کی ماہیّت

تمہید روپیہ ایسی چیز ہے جس سے اجتماعی زندگی میں ہمیں ہر قدم پر سابقہ پڑتا ہے۔ بچہ کی آنکھ اس دنیا میں کھلتی ہے تو روپیہ کی دلنواز آواز کے ساتھ اور جب بوڑھا قبر کے کونے میں ہمیشہ کی نیند سونے کے لئے اُتارا جاتا ہے اسی کی جھنکار اُس کے لئے موت کی گھنٹی ثابت ہوتی ہے۔ روپیہ کی موجودگی کے معنی یہ ہیں کہ اُس کا مالک دنیا کی تمام لذتوں اور مسرتوں کا مستحق ہے۔ ہر جلسہ، ہر تقریب، ہر جماعت میں اس کی رائے وقعت و احترام کے لائق ہے۔ اُس کا ہر انداز قابل تعریف، اُس کی ہر وضع مستحسن اُس کا ہر فعل جائز و مباح ہے۔ تماشا گاہِ عالم میں روپیہ گویا ٹکٹ کا کام انجام دیتا ہے کہ جسے دیکھنے کے بعد منتظمین تماشا کو یہ حق حاصل نہیں رہتا کہ اُس کے مالک سے کسی قسم کا تعرض کرسکیں۔ کاروبارِ دنیا میں روپیہ والا ایک قرض خواہ کی مانند ہے جس کے پاس دستاویز روپیہ کی شکل میں موجود ہے۔ سارا عالم اُس کا مقروض ہے۔ اور وہ اس نقرئی طلائی، یا کاغذی دستاویز کو لیکر جس فرد واحد یا جماعت کے پاس اُس کا جی چاہے جاتا ہے اور قرض کی ادائگی کا مطالبہ خدمات اور اشیاء کی شکل میں کرتا ہے۔ ایک غلہ والے کے پاس پہنچکر وہ غلہ خریدتا ہے ایک حمال کو بلا کر اُس سے بوجھ لادنے کی فرمائش کرتا ہے۔ تانگے، موٹر، ٹریموے، ریلوے پر لاد کر اُسے پن چکی لیجاتا ہے پن چکی کا منیجر اُس کے حکم کا منتظر رہتا ہے، میدہ۔ آٹا، دلیہ، سوجی جو چاہتا ہے پسواتا، دلواتا ہے۔ نانبائی سے جس طرح مرضی ہوتی ہے آبی، چپاتی، روغنی، شیرمال تیار کراتا ہے اور جس سالن کی طرف طبیعت مائل ہوئے اُسی طرح مختلف آدمیوں کے ذریعہ اپنی بلا واسطہ یا بالواسطہ نگرانی میں مہیا کرا کے انکو اُس کے ساتھ کھاتا ہے۔ اسی طرح لباس، مکان، تفریح و دلبستگی کے نت نئے سامانوں کے لئے وہ ابنائے عالم کو اپنی خدمت کا موقعہ عطا کرتا ہے۔ تمام انسان بطیب خاطر

غلام بن جاتے ہیں اور وہ مخدوم و حکمراں۔ روپیہ کی اس قوت و طاقت، اس عظمت و بلند پائگی کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ ہر شخص روپیہ کمانے میں مصروف نظر آتا ہے۔ اور یہی وہ واحد مقصد ہے جو منتشر افراد کو ایک ڈوری میں باندھے ہوئے ہے۔ فلسفی کہتے ہیں جلب منفعت اور دفع مضرت ہر انسان کی فطری خواہش ہے۔ لیکن ایک راہرو صرف یہ جانتا اور سمجھتا ہے کہ کسب زر اور تحفظ زر انسان کی زندگی کے تنہا نصب العین ہیں۔ فلسفی و عالم، صوفی و یوگی، بھکاری و معذور، صناع و شاعر، تاجر و آجر، مزدور و خواجہ، سرکار و رعایا ہر ایک روپیہ کی طرف ہاتھ پھیلائے اور آنکھ لگائے ہوئے ہیں۔ اور جلد یا بہ دیر، کم یا زیادہ مقدار میں اس پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ روپیہ سے اس قدر شیفتگی و الفت کیوں ہے۔ وہ کون سی خصوصیت تانبے، چاندی، سونے اور نکل میں ہے۔ وہ کیا چمک دمک، رنگ و روغن، موسیقی و دلآویزی ان دھات کے ٹکڑوں میں ہے جنہوں نے انہیں اس قدر ہر دلعزیز اور مقبول عام بنا دیا ہے اور پھر اب تو دھات پر ہی اکتفا نہیں کیا جاتا۔ ایک خاص طرز کے چھپے ہوئے کاغذ کے پرزے بھی اکثر و بیشتر اسی حرص و طمع، اور ہوس کے ساتھ طلب کئے جاتے ہیں جس طرح کبھی دھات کے بنے ہوئے ٹکڑے طلب کئے جاتے تھے۔ ان کاغذ کے پرزوں اور دھات کے ٹکڑوں کو یہ شرف کیوں حاصل ہے۔ نہ آدمی کھا سکتا ہے، نہ پہن سکتا ہے، نہ اوڑھ سکتا ہے۔ نہ ان کا چھپر بنا سکتا ہے، نہ ان سے عام طور پر دیگر مفید، دلآویز اور دلچسپ کام لے سکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ دھات کا زیور بنایا جاتا ہے، اور اُسے لوگ نہایت شوق سے زیب و زینت کے لئے استعمال کرتے ہیں ممکن ہے ایک زمانہ میں زیور ان دھاتوں کی چمک، خوبصورتی اور نغمہ آفرینی کی وجہ سے بنائے گئے ہوں۔ لیکن اب چاندی سونے سے زیادہ چمکدار، حسین اور پرکشش اشیاء دریافت ہو چکی ہیں جن کے زیور (اگر عہد حاضر کا انسان اپنی اس یادگار وحشت کے قائم رکھنے پر مصر نظر آئے) بنائے اور پہنے جا سکتے ہیں۔ اب جو چاندی اور سونے کی مقبولیت حاصل ہے وہ غالباً زیور کی

وجہ سے نہیں ہو سکتی بلکہ قرین قیاس یہ امر ہے کہ ان دھاتوں کے زیور بنائے اس لئے جاتے ہیں کہ انہیں قبولیت عام کا اعتبار حاصل ہی۔ اور اگر صرف زیور ہی کے طریق پر استعمال ہی قبولیت عام کا سبب ہوتا تو کاغذ کے نوٹوں کی طرف جو عام میلان ہے۔ اُسکا کیا سبب ہی؟

صفحات مابعد میں ہمارا یہ ارادہ ہے کہ روپیہ کے اسباب مقبولیت کا تجزیہ کریں اور اس کو جو یہ درجہ و مرتبہ، قدر و قیمت حاصل ہے اُن کی وجوہات پر غور کریں۔ روپیہ جن مختلف شکلوں میں ہمارے لئے قابل قبول ہوتا ہے اُسے دریافت کریں اور کن مواقع پر ایک شکل دوسری صورت کے مقابلہ زیادہ قابل ترجیح ہوتی ہے اُسے اور اُسکے وجہ اور باعث کو معلوم کریں یہ کہاوت ہر شخص کی زبان پر رہتی ہے کہ روپیہ چار آنے، پانچ آنے یا چھ آنے کا رہ گیا۔ اس کی حقیقت پر فکر و تامل کریں۔ اشیاء کی قیمتیں جو گھٹتی بڑھتی ہیں اُنکا تعلق روپیہ کی قدر و قیمت سے (اگر اس قسم کا تعلق ممکن نظر آئے) تلاش کریں۔ جن لوگوں کو اتفاق بندرگاہوں یا تجارتی مرکزوں پر رہنے کا ہوا ہے اور جو بیرون ہند کاروبار کرتے رہتے ہیں۔ وہ "شرح مبادلہ" کی اصطلاح اور اس کی تلون پسندیوں سے خوب واقف رہتے ہیں۔ اس "شرح مبادلہ" اور روپیہ کے دوران و گردش میں (جو خرید و فروخت وغیرہ کے ذریعہ سے جاری رہتی ہے) تعلق کی جستجو کریں۔ اکثر سننے میں آتا ہے کہ روپیہ کا بھاؤ مندا ہے۔ روپیہ سستا ہے، روپیہ مہنگا ہے۔ بنک کا نرخ گراں ہے، بنک کا نرخ ارزاں ہے۔ ان تمام اصطلاحوں وغیرہ کے متعلق ایک تشفی بخش جواب فراہم کریں یہ اور اس کے دیگر سوالات کے جواب کی کوشش صفحات مابعد میں کیجائے گی۔

زر کی خدمات انسان کے کاروبار پر جب ہم نظر کرتے ہیں تو جس خصوصیت کو اُس کے ہر قول و فعل میں جاری و ساری پاتے ہیں وہ "اصول افادیت" ہے۔ ہر شخص اپنی جگہ پر چاہتا ہے کہ وہ اپنے وجود کے بقا و تکمیل کے لئے گرد و پیش کی اشیا سے افادہ حاصل کرے اور یہی اس کی وہ خصوصیت ہے جس نے اُس کے اعمال و افعال میں ایک ترتیب معقولیت و شان اتحاد پیدا کر دی

ہے۔ آئیے اس کلیہ کے ماتحت اس حقیقت پر بھی غور کریں کہ روپیہ جو اپنے موجودہ مرتبہ قبولیت پر پہنچا تو وہ اپنی کن خدمات کے سلسلہ میں ؟ کسی شخص یا چیز کی ضرورت اور اہمیت کے فیصلہ کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم اس امر کا تصور کریں کہ اگر وہ شخص یا چیز نہ ہوتی تو ہمیں کیا دقت پریشانی اٹھانی پڑتی۔ اور کس قسم کی کمی، محرومی، اور بیچارگی سے ہمیں سابقہ پڑتا۔ فرض کیجئے کل سے روپیہ کا استعمال قانوناً قطعاً ممنوع قرار دیدیا جائے تو سب سے اول جس دقت کا ہمیں سامنا کرنا پڑے گا وہ ایک پیمانۂ قدر کی عدم موجودگی ہوگی۔ لوگ اجتماعی زندگی بالکل اسی طرح بسر کرتے ہوں گے جیسے اب اُن میں تقسیم عمل بعینہ موجودہ صورت کے مطابق ہوگا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ بہت کم ایسے لوگ ہوں گے جو اپنی ضروریات کی اشیا اپنی محنت سے فراہم کرتے ہوں گے۔ دہلی شہر میں اگر کوئی شخص رہ رہا ہوگا تو زندگی کی ابتدائی ضروریات (یعنی کھانا، کپڑا، اور مکان) کے لئے وہ بالکل دوسروں کا دست نگر نظر آئے گا۔ کسان غلہ اور روئی بوئیں، مزدور کان سے لوہا نکالیں اور پہاڑ سے پتھر کاٹیں اور بھٹوں میں اینٹیں بنائیں، گاڑیبان ان چیزوں کو لیکر بازار میں فروخت کریں۔ ریلوے اسٹیشن پر لیجائیں۔ وہاں سے مستقر پر چیزیں پہنچیں۔ پھر وہ اس قابل بنائی جائیں کہ اُنکا بلا واسطہ طریقہ پر استعمال ہوسکے اور پھر اس شکل میں موجود ہوجائیں کہ قطعاً بلا وساطت غیرے اُن میں فائدہ پہنچانے کی اہلیت پیدا ہوجائے پہلی منزل سے اسی طرح آخری منزل تک پہنچنے میں اشیا کو سیکڑوں ہاتھوں سے گذرنا پڑتا ہے اور ایک شخص اگر لاکھ ہاتھوں، لاکھ پاؤں، لاکھ آنکھوں، کانوں اور ناکوں کا مالک ہوجائے تو شاید جب ایسی زندگی بسر کرسکے کہ وہ اپنی ضرورت کی تمام وہ اشیا خود ہی فراہم کرسکے جو موجودہ نظام صنعت اُس کے لئے فراہم کرتا ہے۔ بہرحال چونکہ یہ غیر ممکن ہے اور تقسیم عمل مع تخصیص مشاغل عہد حاضر کی ایک ناگزیر حقیقت ہے اس لئے اشیاء و خدمات کا مبادلہ بالکل لازمی ہے انکا ہاتھوں میں گردش کرتے رہنا۔ ایک شخص کے پاس سے دوسرے کے پاس ازدیاد افادہ کی غرض سے جانا یقینی ہے۔ اور چونکہ نظام اقتصادی محض خدمت خلق اور اشیا و خیرات کے

جذبات کے زیر اثر قائم نہیں ہے۔ بلکہ ہر شے جو خریدی جاتی ہے یا ہر خدمت جو کی جاتی ہے اُس کے لئے معاوضہ کی ضرورت ہے۔ اس لئے لازم ہوا کہ ہر لین کے ساتھ ایک دین ہو۔ مگر لین دین میں تناسب قدر کی بھی ضرورت ہے۔ میرے پاس ایک موٹر ہے جو میں نے اپنے کارخانہ میں بنوایا ہے اور اُسے میں فروخت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے پاس ایک ٹوپی ہے جسے آپنے بھی فروخت کے لئے بنائی ہے۔ آپ کے پاس موٹر نہیں ہے اور اگر ایک ٹوپی کے عوض میں موٹر ملجائے تو آپ کو لینے میں تامل نہ ہوگا۔ مبادلہ کی کیا صورت ہونا چاہئے۔ کیا میں اپنا موٹر دے کر ٹوپی لے لوں؟ ہر شخص کا جواب ہوگا کہ "اگر پاگل ہوگئے ہو تو ایسا کرو"۔ لیکن اس جواب کا کیا سبب ہے۔ میں ایک چیز بیچنا چاہتا ہوں دوسرا ضرورتمند اُسے خریدنا چاہتا ہے اس کے معاوضہ میں وہ چیز دینے کو تیار ہے جس کی مجھے ضرورت ہے۔ پھر تامل کی کیا وجہ ہے۔ جواب یہ ہوگا کہ دونوں کی قدر برابر نہیں ہے۔ ایک کے تیار کرنے میں سیکڑوں مزدوروں نے سیکڑوں دن تک نہایت سخت قسم کا کام کیا ہے۔ دوسرے کی تیاری میں صرف ایک یا دو روز صرف ہوئے ہیں اور کام کی نوعیت بہت سہل تھی اب اس امر کا فیصلہ تو ہوگیا کہ دونوں چیزیں ہم قدر نہیں ہیں۔ اس لئے مبادلہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اب قدر کے تناسب کا تعین کس طرح کیا جائے۔ موٹر کے بنانے میں مختلف قسم کی محنت صرف ہوئی ہے۔ کانوں کے دریافت کرنیکی محنت۔ اُن سے لوہا اور کوئلہ نکالنے کی محنت لوہا اور کوئلہ نکالنے کی مشین بنانے کی محنت، اس لوہے اور کوئلے کے ذریعہ موٹر بنانے کی محنت، موٹر کو امریکہ سے ریل اور جہاز وغیرہ پر لانے کی محنت۔ اس میں دماغی جسمانی۔ سخت اور آسان نمایاں اور غیر نمایاں ہر قسم کی محنت شامل ہے۔ اگر ٹوپی کی محنت فی یوم کو معیار قرار دیا جائے تو موٹر بنانیکی محنت کو ٹوپی بنانے کی یومیہ محنت کا کے گنا قرار دیا جائے۔ فرض کیجئے کہ آپ ایک نتیجہ پر پہنچ گئے کہ ایک ہزار ٹوپیاں برابر ہیں ایک موٹر کے تو یہ تو دن میں کی سیکڑوں ضرورتوں میں سے ایک نہایت ادنےٰ اور حقیر ضرورت کے متعلق آپ نے فیصلہ کیا۔ اب اسی طرح محنت و مزدوری کے مختلف مدارج پر غور و فکر کرنے کے بعد آپ کو کھانے کی تمام چیزوں، پہننے کے تمام اشیا اور

رہنے کے تمام لوازمات کے لئے ایک باقاعدہ نسبت و تناسب دریافت کرنا پڑیگا اور تناسب کے اُن منفرد رشتوں میں ایک مجموعی رشتہ تلاش کرنا جس کے ذریعہ سے بلا دقت و پریشانی ایک شے دوسری شے کے معاوضہ میں تبدیل کیجا سکے۔ یہ وہ پیچیدہ مسلہ ہوگا جس سے اس کے بعد فوراً ہم دوچار ہو جائیں گے۔ اس تمام گفتگو سے معلوم ہوا کہ زر ہمارے لئے ایک بڑی خدمت انجام دیتا ہے اور وہ خدمت یہ ہے کہ وہ ایک پیمانہ قدر اور مشترک نسب نمائے قیمت کا فرض پورا کرتا ہے جس کے بغیر ہمارے پورے نظام معیشت کے ناممکن ہو جانے میں کوئی شبہ نہیں۔

دوسری خدمت جو زر انجام دیتا ہے وہ واسطہ و ذریعہ مبادلہ کی خدمت ہے۔ پہلی مثال کو جاری رکھا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ جو شخص موٹر بیچنا چاہتا ہے اور ٹوپی خریدنا چاہتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اُس کے اِس مقصد کو پورا کرنے کے لئے ٹوپی بیچنے والوں میں سے کوئی موٹر کا خریدار اُسی روز اور اُسی لمحہ تیار ملے اور اگر تیار بھی ملے تو یہ ضروری نہیں کہ ایک ہزار ٹوپیاں اس کے پاس فوراً ہی تیار ہوں کہ جن کے ذریعہ سے وہ موٹر خریدلے اور اگر ایک ہزار ٹوپیاں تیار بھی ہوں تو یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ کوئی اور دوسری زیادہ اشد ضرورت کے معاوضہ میں ان ٹوپیوں کے دینے پر مجبور نہ ہو۔ اس لئے موٹر بیچنے والے غریب کو اکثر مہینوں اُس تلاش میں سرگرداں رہنا پڑے گا کہ کسی طرح ایسا شخص ملجائے جس میں مندرجہ بالا تمام اہلیتیں موٹر خریدنے کی موجود ہوں۔ اس لئے اگرچہ ہم اس پر غور نہ کریں لیکن زر ہماری ایک بڑی دشواری کی جو اتحاد ضرورت کی عدم موجودگی سے پیدا ہوتی ہے ضرور سہل کر دیتا ہے۔ زر کے ہوتے ہوئے ہم اشتہار دیدیں گے اور موٹر کا خریدار ایک ایسا زمیندار پیدا ہو جائے گا جس کے پاس لگان کے منافع کا کثیر روپیہ جمع ہے وہ ہمیں فوراً روپیہ کی شکل میں معاوضہ ادا کر دے گا اور ہم اُس روپیہ کے ذریعہ سے جس قدر چاہیں گے ٹوپی فروخت کرنے والے سے خرید لیں گے اور اس امر پر مجبور نہ ہوں گے کہ پوری ایک ہزار ٹوپیاں لیں اور ایک ٹوپی اپنی ضرورت کی نکال کر پھر ۹۹۹ ٹوپیاں اپنی دیگر ضرورت کی چیزیں لینے کے لیے بیچتے پھریں۔ اس سے ثابت ہوا کہ

زر ہماری معیشت کی مشینری میں تیل کا کام انجام دیتا ہے جس کے ذریعہ سے تمام پرزے تیزی اور روانی کے ساتھ چلنے لگتے ہیں۔

تیسری خدمت جو زر انجام دیتا ہے وہ معیار قدر کی خدمت ہے۔ ہماری موجودہ سوسائٹی میں کاروبار زیادہ تر ایسے معاہدوں کی صورت میں کیا جاتا ہے جن کی تکمیل مستقبل میں ہوتی ہے۔ پیش بینی، پیشین گوئی، اندازہ و تخمینہ، ظن و گمان۔ اس پر ہمارے لین دین کا بہت کچھ انحصار ہے۔ ہم آج اس امید پر خریدتے رہتے ہیں یا چیزیں بناتے رہتے ہیں کہ کل ان کی قیمت گراں ہو جائے گی۔ ہمیں امید رہتی ہے۔ اور سرمایہ کی کثرت کی وجہ سے، نفع فی صدی کا تناسب ہم بہت حقیر رکھتے ہیں اس لئے قدر و قیمت کی ذرا سی کمی بیشی لاکھوں اور کروڑوں کے نفع و نقصان کا سبب بن جاتی ہے۔ لوگ ایک دن میں کروڑپتی اور دوسرے دن میں بھکاری بن جاتے ہیں۔ اس تخمین و اسکولیشن کے علاوہ بھی کاروبار تمامتر قرض کے ذریعہ سے چلتا ہے۔ اشیاء کی گرانی و ارزانی باوجود اس کے کہ قرضدار کو سود ملتا ہے بعض اوقات نقصان کا سبب ہو جاتی ہیں اور بعض مرتبہ وہ نہایت غیر متناسب منافع سے مالا مال ہو جاتا ہے۔ گویا دولت چھپر پھاڑ کر اس کے قدموں پر آپڑتی ہے۔ اور کبھی اُسے ٹکڑگدا بنا جاتی ہے۔ کاروبار کی یہ غیر تیقن اور سخت عبرت خیز صورت رفع کرنے میں زر بہت بڑی حد تک مدد دیتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ گذشتہ جنگ کے تجربہ کے بعد روپیہ کی شرح مبادلہ کی تلون پسندیوں کی موجودگی میں یہ خدمت زر کی کچھ بہت مکمل نہیں معلوم ہوتی لیکن اس بحث کو ہم بعد کے لئے ملتوی کر کے زر کی عدم موجودگی کی صورت میں جو مشکلیں پیدا ہونے کا احتمال ہے انہیں مثال کے ذریعہ سے واضح کرنا چاہتے ہیں۔ فرض کرو کہ ایک شخص نے ایک غلہ فروش سے فصل کی کٹائی کے موقعہ پر گیہوں قرض لیا۔ اور اس وعدہ پر کہ گیہوں جب بو جائے گا وہ قرض واپس کر دے گا۔ اوّل الذکر صورت میں گیہوں سستا ہوگا اور موخر الذکر صورت میں مہنگا۔ اس لئے اُسے ہزاروں لاکھوں کا نقصان ہو جائے گا اور قرضدار کو علاوہ سود کے ہزاروں لاکھوں کا نفع

لیکن اگر یہی قرض زر کے ذریعہ سے لیا جاتا تو زر کی قیمت چونکہ مستقل رہتی ہے۔ اُسے کوئی نفع یا نقصان ان اسباب کی وجہ سے نہ ہوتا۔ جن کا کوئی تعلق براہ راست یا بالواسطہ معاہدہ قرض سے نہ تھا یہ تیسری خدمت روپیہ کی ہوئی۔ روپیہ معیار قدر کا کام انجام دیتا ہے۔ چونکہ جب غلہ کا بھاؤ تیز ہوگا تو بھی اسی قدر روپیہ جتنے روپے کہ جب دئے جاتے جب غلہ سستا ہوتا۔ اور یہ روپیہ اگر غلہ سستا ہو تو زیادہ غلہ خرید سکے گا اور اگر مہنگا ہے تو کم غلہ۔

چوتھی خدمت زر کی یہ ہے کہ وہ ذخیرہ قدر کا کام انجام دیتا ہے اگر لوگ زائد از ضرورت اشیاء کو انہیں کی شکل میں رکھتے مثلاً گیہوں کو گیہوں کی شکل، گھوڑے کو گھوڑے کی شکل میں، موٹر، ہاتھی، ریل، جہاز وغیرہ اپنی ذاتی شکلوں میں تو اول تو یہ کہ ان کی نگرانی و نگہداشت اُنکے حجم کی وجہ سے ایسے ذرائع سے کرنا پڑتی جن میں بہت خرچ ہوتا۔ اور دوسرے یہ کہ باوجود اس تمام نگرانی و نگہداشت کے وہ بہت زیادہ عرصہ تک اپنی اصلی حالت پر قائم نہ رہتے وہ جلد یا بدیر فنا ہو جاتے۔ پھر اگر جائداد کے انتقال کی ضرورت ایک مقام سے دوسرے مقام میں پیش آتی تو بہت خرچ کرنا پڑتا اور سخت دقت و پریشانی پڑتی۔ روپیہ کی ایجاد نے یہ دونوں دقتیں آسان کر دیں۔ زر کی وجہ سے دولت کو پائداری نصیب ہو گئی کہ اُس کا وجود زمانہ کی فنا کوشیوں سے محفوظ ہو گیا اور بڑی سے بڑی دولت نہایت آسانی سے دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچائی جانے لگی۔

زر کی ابتدائی تاریخ زر کی یہ چار نہایت اہم خدمات ہیں۔ اب ہم زر کے ارتقا پر ایک تاریخی نگاہ ڈالتے ہوئے یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ مختلف اوقات میں کن کن چیزوں نے زر کی خدمات انجام دیں اور پھر بالآخر سونے اور چاندی نے کس طرح تمام دوسری چیزوں کی جگہ لے لی۔ تمدن و تہذیب کے موجودہ طور میں رہنے کی وجہ سے، اور مسکوک فلزاتی زر کے عادی ہونیکے باعث ہم زر اور سونے چاندی کے سکوں کو بالکل ہم معنی تصور کرنے لگے ہیں۔ اس لئے، اس حقیقت کو ہمیں کبھی نظرانداز نہ کرنا چاہیے کہ جس قدر اشیاء پائی جاتی ہیں اُن میں اہلیت

پیمانہ قدر اور تبادلہ قدر کی پائی جاتی ہے۔ یہ سوال کہ کونسی اشیا سوسائٹی کی ایک خاص حالت میں مناسب ترین زر کا کام دینے کی لائق ہیں۔ محض موازنہ اور مقابلہ کا سوال رہ جاتا ہے۔ کسی شے میں کسی خاص زمانہ و حالت میں زیادہ اہمیت ہوتی ہے کسی میں کم۔

شاید قدیم ترین حالت صنعت کی وہ ہے جس میں روزی وحشی جانوروں کے شکار سے حاصل کیجاتی ہے۔ اس حالت میں شکار کا ماحصل نہایت قابل قدر شے ہوتی ہے۔ شکار کا گوشت تو جلد خراب ہو جاتا ہے لیکن کھال زیادہ پائدار ہوتی ہے اور کپڑوں کے لئے استعمال کیجاتی ہے۔ اس لئے ابتدا میں اس نے اپنی عام مقبولیت کیوجہ سے مختلف قدیم اقوام میں زر کی حیثیت اختیار کر لی اور آج کل بھی اُن سے زر کا کام لیا جاتا ہے شکاری زندگی سے ترقی پاکر آدمی گلہ بانی کی حالت میں پہنچے اور اس دور میں مویشی اور بھیڑ بہت قیمتی اور قابل بیع و شرے ملکیت خیال کیجانے لگیں۔ انہیں آسانی سے منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اپنے پاؤں سے چلتی ہیں اور بہت سا دن تک رکھی جا سکتی ہیں اور اسطرح روپیہ کے بعض خدمات آسانی سے انجام دے سکتی ہیں۔ ان ممالک میں جہاں بردہ فروشی کا رواج تھا غلام ذریعہ مبادلہ بن گئے ذاتی زینت کا جذبہ انسان میں نہایت قدیم اور زبردست ہے اور چونکہ اس مقصد کے لئے استعمال کی جانے والی اشیا اکثر مقبول عام ہوتی ہیں، آسانی سے منتقل کیجا سکتی ہیں اور عرصہ تک قائم رہتی ہیں۔ اس لئے یہ بھی مثل زر کے گردش کرنا شروع کر دیتی ہیں، کوڑیاں، گھونگھے تسبیح کے دانے، زرد عنبر، منقش پتھر، اور ہاتھی دانت وغیرہ گلوبند اور پیٹی کی شکل میں لوگ لئے پھرتے ہیں اور انکے ذریعہ سے اشیا کی خرید و فروخت کرتے ہیں جب لوگ گلہ بانی سے ترقی پاکر زراعتی زندگی اختیار کرتے ہیں تو غلہ ذریعہ مبادلہ بن جاتا ہے۔ بعض جگہ زیتون کے تیل سے بھی یہ خدمت لیجاتی ہے۔ بادام یورپ کے بعض ممالک میں زر کی حیثیت سے استعمال کئے گئے ہیں اور ۱۶۱۸ء میں ورجینیا میں تمباکو نے یہ خدمت انجام دی ہے اور میری لینڈ میں ۱۷۳۲ء تک تمباکو اور مکا زر قانونی کا مرتبہ رکھتے تھے بعض جگہ خشک کی ہوئی مچھلیاں

اس غرض کے لئے استعمال کی گئی ہیں۔ انکے علاوہ جب ہم مصنوعی اور دیگر اشیار کی فہرست پر غور کرتے ہیں تو ہمیں مندرجہ ذیل چیزیں نظر آتی ہیں جنہوں نے مختلف مقامات اور زمانوں میں وسیلہ مبادلہ کی خدمت انجام دی ہے۔ مثلاً پارچہ سوتی، چٹائیاں، گوند، موم، چائے لوہے کی کیلیں وغیرہ۔ اور اگر بعض شواہد تاریخی پر اعتبار کیا جائے تو آثار قدیمہ کے طور پر جو نہایت منقش اوزار پتھر کے بنے ہوئے نکلتے ہیں وہ بھی یہی خدمت انجام دیتے تھے۔ لکڑی کے بنے ہوئے روپیوں کے جاری رہنے کے متعلق بھی ثبوت ملتا ہے۔

زر کے لئے موزوں شے کی خصوصیات ان تمام اشیار کی فہرست پر نظر کرنیکے بعد ہمیں یہ جستجو ہوتی ہے کہ معلوم کریں کہ جب زر کے طریقہ پر اس قدر مختلف النوع چیزیں استعمال کیجاتی تھیں تو اسکا کیا سبب ہوا کہ موجودہ عہد میں سب ترک کر دی گئیں اور یہ خدمت صرف دہات کے چند ٹکڑوں سے لیجانے لگی۔ زر کی خدمات کا ابتدا میں ذکر کیا جاچکا ہے اور اس کے مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچنا زیادہ دشوار نہیں کہ مختلف حالات اور مقامات میں زر کو مختلف خدمتیں تفویض کی گئیں۔ اور ان خدمات کی نوعیت کے اعتبار سے جس شے کو سب سے زیادہ اہل اس کام کے لئے پایا گیا اُس کا اس غرض کے لئے انتخاب کیا گیا۔ اس انتخاب کا یہ کام ہر عہد میں جاری رہا، اور جیسا کہ صفحات آئندہ میں بتلایا جائے گا۔ ابھی تک یہ ختم نہیں ہوا۔ کیونکہ مکمل زر ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکا۔ ہر عہد میں روپیہ کی مختلف خدمات میں سے کسی ایک یا دو کو زیادہ اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اور اُسی کے مطابق زر کی اصلاح کے لئے تجاویز سوچی اور تجربات عمل میں لائے جاتے ہیں۔ صنعت کی سادہ حالت میں زر کی ضرورت خریداروں اور فروشندوں کے درمیان چلتے رہنے کے لئے ہوتی ہے اور تب اُس کی خصوصیات یہ ہونی چاہئیں کہ وہ آسانی سے لیجایا جا سکے، مختلف سائز کے ٹکڑوں میں تقسیم ہو سکے تاکہ ہر رقم فوراً بن سکے، اور اپنی ظاہری صورت کے اعتبار سے یا ثبت کئے ہوئے چہرے کی وجہ سے شناخت کیجا سکے۔ مگر جب روپیہ، جیسا کہ آئندہ کے متعلق خیال ہے صرف معیار قدر اور پیمانہ

قدر کی خدمات انجام دیگا اور نظام مبادلہ میں اشیاء کے عوض اشیاء ملیں گی اور زر کی وساطت باقی نہیں رہے گی مندرجہ بالا صفات ایسی ضروری نہیں رہیں گی جتنی اب ہیں۔ اور قدر کا ثبات معہ نقل پذیری نہایت اہم خصوصیات ہو جائیگی لیکن ان پیچیدہ مسائل پر گفتگو کرنے سے قبل ہم زیر بحث خصوصیات کو انکی اہمیت کے لحاظ سے حسب ذیل ترتیب دینا چاہتے ہیں:۔

۱۔ قدر ۲۔ نقل پذیری ۳۔ غیر فنا پذیری ۴۔ یکسانیت ۵۔ سہم پذیری
۶۔ ثبات قدر ۷۔ شناخت پذیری

۱۔ قدر:۔ چونکہ زر کے ذریعہ قدر دار اشیاء کا لین دین کیا جاتا ہے اس لئے اس میں فی نفسہ قدر ہونا چاہیے۔ قدر کا کیا سبب ہے یہ ایک معرکۃ الآرا مبحث ہے۔ بعض علماء کے خیال میں افادہ اس کا سبب ہے۔ دوسرے علماء کو قدر پیہ اس وجہ سے اختلاف ہے۔ یہ عقیدہ صرف ان لوگوں کا ہے جو زر کے عینی نظریہ کو تسلیم کرتے ہیں ان میں سے اس کی مخالفت میں زر کا خدمتی نظریہ پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چونکہ زر مخصوص خدمات انجام دیتا ہے اس لئے اس میں قدر پیدا ہو جاتی ہے اور عزیز ہو جاتا ہے "ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد" دیگر علماء کا یہ خیال ہے کہ روپیہ کو قدر اس وجہ سے حاصل ہوتی ہے کہ ریاست اس پر اپنی مہر لگا کر اسے قانون کے ذریعہ قابل قدر بنا دیتی ہے۔ یہ زر کا ریاستی نظریہ کہلاتا ہے۔ یہ سب نظریئے اپنی اپنی جگہ نامکمل ہیں۔ صحیح نظریہ قدر زر کا غالباً قدر اشیاء کے عام نظریہ سے مختلف نہیں ہے۔ قدر جب ہی پیدا ہوتی ہے جب اس میں افادہ اور قلت پائی جائے زر کے قدر کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے اور اس کے متعلق ایمانداری کے ساتھ اختلاف رائے کا امکان ہے۔ لیکن زر کے لئے قدر لازمی ہونے میں شبہ کی گنجائش نہیں۔ فی زمانہ جو صورت بھی ہو اور جو نظریہ بھی قابل قبول قرار دیا جائے یہ یقین ہے کہ ابتدا میں زر کی مقبولیت کا سبب نہ ریاست کا حکم تھا نہ زر کی خدمات کا اعتراف بلکہ زر کی قدر ذاتی اس کی مقبولیت کا فیصلہ کرتی تھی علاوہ ازیں اپنی خدمات کی مکمل ادائیگی کے لئے خصوصاً خدمت ذخیرہ قدر اور ذریعہ مبادلہ کی ادائیگی کے لئے یہ لازمی

ہے کہ زر ایسی شے کا بنایا جائے جس کی تمام ممالک میں اگر مساوی قدر ممکن نہ ہو سکے تو کم از کم کافی قدر ہو اور اس لحاظ سے سونا اور چاندی کو عام طور پر مقبولیت حاصل ہے۔

۲۔ نقل پذیری:۔ زر کے لئے جو شے منتخب کی جائے اُسے صرف قدر دار ہی نہ ہونا چاہیئے بلکہ اس کی قدر اس کی جسامت اور وزن سے کچھ اس طرح متناسب ہونا چاہیئے کہ ایک طرف تو زر تکلیف دہ حد تک بھاری نہ ہو اور دوسری طرف تکلیف دہ حد تک مختصر نہ ہو۔ یونانیوں میں لوہے کا سکہ استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن موجودہ عہد میں یہ قطعاً ناممکن ہے۔ گذشتہ صدی میں یہ خدمت سویڈن میں تانبے سے لی جاتی تھی اور اب بھی غیر ترقی یافتہ اقوام اپنے چھوٹے معاملات میں اس کا استعمال کرتے ہیں۔ لیکن بڑے کاروبار کے لئے یہ بالکل ناموزوں ہے۔ بیل اور بھیڑیں یہ صحیح ہے خود چلتی ہیں۔ لیکن ان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا اور انکی نگہداشت ایک مستقل کام ہے۔ اسی طرح گو بعض حیثیتوں سے غلہ گھاس تیل، بادام وغیرہ زر کے لئے زیادہ موزوں ہیں لیکن ان کا حجم قدر کی تناسب کے اعتبار سے بہت زیادہ اور اسی لئے انکی نقل و حرکت سخت دشوار ہو گی۔ نقل پذیری کی خصوصیت زر کے لئے صرف اسی طرح ضروری نہیں ہے کہ آدمی روپیہ جیبوں میں لئے پھر سکیں۔ بلکہ ایک مقام سے دوسرے مقام اور ایک براعظم سے دوسرے براعظم میں نہایت کم خرچ میں جو سودے ہو جاتے ہیں وہ اسی کے ذریعہ سے ممکن ہیں۔ جس طرح اشیا بہت ارزاں ہونیکی وجہ سے نقل پذیری کی اہلیت نہیں رکھتیں اسی طرح بہت گراں ہونے کے باعث بھی انکی نقل پذیری میں دشواری کا امکان ہے۔ چونکہ جہاں تک معمولی سودوں کا تعلق ہے انکے لئے خوردبینوں اور کیمیاوی کانٹوں کی ضرورت ہو گی۔ مثلاً جواہرات وغیرہ معمولی کاروبار میں استعمال نہیں کئے جا سکتے۔

۳۔ غیر فنا پذیری:۔ تجارت میں گردش کرتے رہنے اور سرمایہ محفوظ طریقہ پر رکھنے کے لئے یہ لازمی ہے کہ زر جلد خراب اور ناقص نہ ہو۔ گوشت کی طرح سڑ نہ سکے، کافور کی طرح اڑ نہ جائے۔ لکڑی کی طرح

گل نہ جائے۔ لوہے کی طرح زنگ آلود نہ ہو جائے۔ فنا پذیر اشیاء مثلاً انڈے، خشک مچھلیاں، مویشی یا تیل وغیرہ۔ اس میں شک نہیں زر کی طرح استعمال کئے گئے ہیں لیکن جس چیز کو آج زر بنایا گیا اُسے دوسرے دن کھا لیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی اشیاء کا ایک بڑا ذخیرہ محفوظ نہیں رکھا جا سکتا اور انکی قدر بہت تغیر پذیر ہوتی ہے۔ نئے مختلف نوعیتوں کے ساتھ اس اعتراض کی زد سے بہت بڑی حد تک محفوظ ہیں چونکہ متعدد سال تک ان میں کوئی نمایاں نقص پیدا نہیں ہوتا۔

۴۔ یکسانیت:- زر کے لئے جو شے استعمال کیجائے اُس کے تمام اجزا اور صورتوں میں یکسانیت ہونی چاہئے یعنی انہیں ایک ہی میل اور قسم کا ہونا چاہئے تاکہ مساوی اوزان مساوی قدر کے ایک بن سکیں۔ کسی پیمانہ کے مطابق قیمت کے شمار کرنے کے لئے یہ لازمی ہے کہ پیمانہ مساوی اور یکساں ہو تاکہ دو کا دوگنا چار ہی ہو کم یا زیادہ نہ ہو جائے اگر ہم شمار کے لئے پیمانہ جواہرات کو بنا دیں تو یہ شاید ہی کبھی ممکن ہو کہ چار جواہر قیمت کے اعتبار سے دو جواہر کے دوگنے ثابت ہوں۔ قیمتی فلزات بھی اپنی اصلی حالت میں قطعی یکساں نہیں کئے جا سکتے مگر اس کی وجہ سے کوئی بڑی دقت نہیں ہوتی کیونکہ طلا و سیم خام میں جس قدر چاندی یا سونا ہے وہ آسانی سے کسوٹی پر پرکھا جا سکتا ہے اور صاف و مسکوک ہونیکے بعد تو وہ ایسے کھرے اور خالص ہو جاتے ہیں کہ ایک سکہ اور دوسرے سکہ میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا اور مساوی اوزان بالکل مساوی قدر رکھتے ہیں۔

۵۔ سہم پذیری:- اس خصوصیت سے آخری خصوصیت کو ایک قریبی رشتہ حاصل ہے۔ ہمیں شک نہیں کہ ہر شے کو بلا کسی انتہا کے تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ سخت ترین جواہرات توڑے جا سکتے ہیں اور لوہے کو لوہا کاٹتا ہے لیکن جو شے زر کے لئے استعمال کیجائے اس کے لئے امکان سہم پذیری ہی کافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ تقسیم ہونے کے بعد مجموعی قدر شے منقسمہ کی بالکل اسی قدر ہو جتنی کہ ابتدا میں تھی اگر ہم ایک کھال کے ٹکڑے کریں تو اسکی مجموعی قدر و قیمت ابتدائی قدر و قیمت سے کہیں زیادہ کمتر ہوگی۔ اور یہی صورت چوب عمارتی، سنگ اور دیگر اشیاء کی ہے جن کا دوبارہ اتصال ناممکن ہے لیکن فلزات کے ٹکڑے جب چاہیں دوبارہ پگھلا کر ایک کئے جا سکتے ہیں اور خرچ اس کے لئے ضائع شدہ دھات کو

شامل کرکے، بہت ہی حقیر رقم ہوتی ہے مثلاً فی اونس ایک پیسہ یا آدھ آنہ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سیم و طلا کے کسی ٹکڑے کی قدر بالکل اُس خالص سونے کے تناسب ہوتی ہے جو اُس میں موجود ہوتا ہے۔

۲۔ ثبات قدر:- یہ امر بدیہی ہے کہ زر کو قدر کی تبدیلیوں سے متاثر نہ ہونا چاہئے۔ وہ مختلف تناسب جن میں زر کا مبادلہ دیگر اشیاء سے کیا جاتا ہے انہیں جس قدر ممکن ہو سکے غیر مبدل رہنا چاہئے اگر زر محض پیمانہ قدر اور وسیلہ مبادلہ کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا تو یہ معاملہ نسبتاً معمولی اہمیت رکھتا۔ اگر قیمتیں اُسی تناسب سے فوراً بدل جایا کرتیں جس تناسب سے زر کی قدر میں اختلاف ہوتا تو کسی شخص کو نہ نفع ہوتا نہ نقصان لیکن عملی زندگی کا جہاں تک تعلق ہے لوگ زر کو طویل میعاد کے معاہدوں کے لئے معیار قدر کی حیثیت سے بھی استعمال کرتے ہیں۔ اور زر وہ ادائیگی قانون یا رسم کے ذریعہ سے اُسی یکساں غیر مبدل نرخ پر قائم رکھتے ہیں۔ درآنحالیکہ لائق ادا رقم کی قدر اصلی بہت کچھ بدل جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قدر زر کی ہر تبدیلی ہیئت اجتماعی کے لئے تھوڑی بہت مضرت رساں ثابت ہوتی ہے اور گذشتہ جنگ کے دوران میں مختلف ممالک کے زروں نے جو قلابازیاں کھائی ہیں اور جو ہیجان و اضطراب، بدامنی و انقلاب رونما ہوا ہے جس کی وجہ سے بڑے بڑے سرمایہ داران شبینہ کو محتاج ہوگئے۔ اگر اُن پر خیال کیا جائے تو کہنا پڑتا ہے کہ اس کے نتائج بہت برے اور دور رس ہوتے ہیں۔

ہر چند یہ امر قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر قرض خواہ کو نقصان ہوتا ہے اتنا ہی مقروض کو فائدہ ہو جاتا ہے۔ اور جتنا مقروض کو نقصان ہوتا ہے اتنا ہی قرض خواہ نفع میں رہتا ہے اور بصورت مجموعی باعتبار اُسی قدر دولتمند رہتی ہے جتنی کہ ابتدا میں ہوتی ہے۔ مگر یہ حقیقت سے دور ہے کیونکہ جب اصول ریاضی کے ماتحت تجزیہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک رقم کا ایک سے دیگر دوسرے کو دینا بسا اوقات دہندہ کو یابندہ کے مقابلہ میں زیادہ نقصان پہنچاتا ہے۔ ایک شخص جس کی آمدنی سو روپیہ مہینہ ہے جب دس روپیہ دینے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے تو اُسے زیادہ تکلیف محسوس ہوتی ہے بہ نسبت اُس وقت کے کہ جب اُس کی آمدنی میں دس روپیہ کا اضافہ کیا جاتا ہے کیونکہ نوے روپیہ کی آمدنی کے ساتھ روپیہ کا افادہ اسکی نگاہ میں زیادہ ہوگا اور ایک سو دس کی آمدنی کے ساتھ کم۔ اس اصول کے

ماتحت، ہر قسم کی قماربازی، سٹہ، خالص تخمین، سپیکولیشن یا دیگر انتقال دولت کے ناگہانی اور اتفاقی طریقے عام طور پر سبب ہوتے ہیں اپنے نقصان افادہ کا جس کا کوئی معاوضہ حاصل نہیں ہوتا۔ صنعت و تجارت اور اجتماع دولت کے تمام محرکات اُن سے پیدا ہونیوالی لذائذ کی توقعات پر منحصر ہیں اور رائج الوقت زر کی ہر تبدیلی کسی نہ کسی مقدار میں اس قسم کی توقعات کو تباہ اور سعی کے ان محرکات کو کم کرتی ہے۔ جنگ کے بعد جو یورپ میں کساد بازاری ہے اور بیکاری ترقی پر ہے اس کا بڑا سبب زر کے کمیائے عصر تلون قدر کو بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں جو کاروبار مندا بتلایا جاتا ہے اُسکا بڑا سبب قدر زر کی غیر ثباتی ہے۔

۷۔ شناخت پذیری: جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے اُس خصوصیت کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے کہ ایک شے میں اس بات کی اہلیت کا اندازہ ہو سکے کہ وہ آسانی سے پہچانی اور ممتاز کی جا سکتی ہے۔ وسیلہ مبادلہ کی حیثیت سے روپیہ ہاتھوں سے نکلتا رہتا ہے اور اگر ہر شخص کو جو رائج الوقت سکہ قبول کرتا، اُسے تولنا، پرکھنا اور جانچنا پڑتا تو اس سے بڑی دقت اور دشواری ہوتی۔ اگر روپیہ کی شناخت میں مہارت اور ذہانت کی ضرورت ہوتی تو غریب اور جاہل لوگوں کو بہت دھوکہ دیا جاتا۔ اس لئے ضروری ہوا کہ ذریعہ مبادلہ میں ایسے امتیازی نشان ہوں جن کی وجہ سے کسی قسم کی غلط فہمی کا امکان باقی نہ رہے۔ جواہرات اگر دوسرے تمام اعتبارات سے اچھا زر قرار بھی دیئے جا سکتے تب بھی اس حیثیت سے انہیں زر کے لئے قبول نہ کیا جاتا کیونکہ بڑا ماہر جوہری ہی سچے اور جھوٹے موتی میں امتیاز کر سکتا ہے۔

شناخت پذیری میں ہی ہمیں اثر پذیری کو بھی شامل کرنا چاہئے۔ یعنی شے کی وہ اہلیت جس سے کہ وہ ایسی صورت، مہر یا نقشہ کے نشان کو قبول کرتی ہے جو اسے ایک خاص قدر کا رائج الوقت زر بنا دیتی ہے۔ ہم اسے اور زیادہ سادہ الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ زر کی شے لائق سکہ سازی ہونا چاہئے تاکہ ایک حصہ جب مناسب قواعد کے ماتحت ریاست کی مہر لئے ہوئے جاری ہو جائے تو ہر شخص اُسے زر صحیح و قانونی باور کر سکے جو وزن، قدر اور جسامت میں اُسی طرح کے دوسرے نشان شدہ زر کے مساوی ہو۔ ایک اچھے سکہ شناخت میں کیا اجزا شامل ہیں اسکا بیان اس مضمون کے کسی دوسرے حصہ میں کیا جائیگا۔

(باقی)

زرتشت اور بُدھ

موازنہ سیرت و دعوت

بُرے لوگ اپنی پسماندہ قوم کے "فرزند رشید" ہوتے ہیں اور اپنی تمام صفات میں اپنے والدین کے خصائص کے حامل ہوتے ہیں جس ماحول میں انہوں نے تربیت پائی ہے اس کے اثرات کے محسوس نقوش بخط جلی اُن کی خاک بسر پیشانی پر ثبت ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جس قوم سے وابستہ دامن ہوتے ہیں اُس کی رفتار زوال میں اپنی ننگِ وجود زندگی سے اور بھی سرعت پیدا کر دیتے ہیں اور یہ جلوس ہلاکت غار فنا کے کنارے بہت جلد پہنچ جاتا ہے!

آن پہنچی سرِ گرداب فنا کشتیٔ عمر   ہر نفس بادِ مخالف کا ہے جھونکا ہم کو؟

لیکن بڑے لوگ اپنی مادر ملت کے گویا "ناخلف لڑکے" ہوتے ہیں جو اپنی ہی قوم کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے ہیں؟ یہ لوگ اپنے جسم قومی کا ایک "عضو مقطوع" ہوا کرتے ہیں، لیکن درحقیقت وہ اس فاسد نظام جسمانی کے اندر بمنزلہ ایک "قلب صحیح" کے ہوتے ہیں جو اپنے سینہ سے اس لئے الگ ہو گیا ہو تاکہ بدن کے ہمہ گیر "زہرباد" سے اپنے کو محفوظ رکھے اور اس "کان نمک" میں رہ کر خود بھی نمک نہ ہو جائے۔ یہی قلب جسم ملت کا اصلی مایہ حیات اور جوہر اصلاح ہوتا ہے اور ایک وقت میں اپنی قوت افزائی اور صحت بخشی سے بدن کو ایک حیات تازہ عطا کرتا ہے "اذا فسدت فسدت کلّھا، واذا صلحت صلحت کلّھا!"

الغرض قوم کے یہ مصلحین و مجددین گھر آباد کرنے ہی کے لئے گھر سے ہجرت کرتے ہیں اور قوم کی دوستی ہی کا جذبہ انہیں قوم کی دشمنی پر مجبور کرتا ہے "نصحت لکم، ولاکن لا تحبون الناصحین"

وہ ایک غیر معمولی طور سے قوی قلب و جگر رکھتے ہیں اور ایک کوہ شکن عزم و استقلال کے مالک ہوتے ہیں اور اپنی ان خداداد قوتوں کے پیہم ضربوں سے اپنی قوم کے سیلاب زوال کا

مُنہ پھیر دیتے ہیں اور اس گمراہ خلقت کو ایک نئی شاہراہ حیات پر ڈالدیتے ہیں۔

مگر یہ کام ایک "جوئے شیر" لانے سے کم مشکل نہیں ہوتا جس میں انکا جنون خیز عزم و ارادہ ہی کامیابی کی ناممکنات کو ممکن بنا دیا کرتا ہے۔

پانی میں ہی آگ لگانا دشوار   بہتے دریا کو پھیر لانا دشوار
دشوار تو ہے مگر نہ اتنا جتنا   بگڑی ہوئی قوم کا بنانا دشوار

عہد مسیحی سے قبل کے قرون میں اس قسم کے قریباً ۱۲ مردان کار ہم کو افق تاریخ پر نظر آتے ہیں جن کے "بطن ہمت" سے نئی قومیں پیدا ہوئیں اور قریب المرگ قوم کے لئے جن کی دعوت اصلاح صدائے "قم باذنی" ثابت ہوئی۔ ان میں سے ایک کے قدوم وجود نے سرزمین ہندوستان کو مفتخر فرمایا اور جسکا نام گرامی و اسم سامی مہاتما بدھ ہے (پرائیویٹ شخصی نام گوتم سدھارتھ ہے) خطۂ ہند کی ساری تاریخی عمر میں ایسا حیرت خیز انقلاب کبھی دیکھنے میں نہیں آیا جیسا کہ گوتم اعظم کے مشن کے ساتھ وابستہ ہے! قریباً اسی عہد کے گرد و پیش میں کوہستان ہمالیہ کے مغربی کنارے پر شمالی و مغربی گوشے میں ایک اور اولوالعزم پیغمبر کا پیکر مقدس نیم تاریخی فضا کے سایہ میں کھڑا نظر آتا ہے۔ یہ زرتشت ہے! ایران قدیم کی یہ عظیم المرتبت ہستی جسقدر تاریکی میں ہے، تاریخ عالم کا کوئی اور آفتاب عظمت ایسے گہن میں نظر نہیں آتا!

ہندوستان اور ایران میں قدیم ترین تعلقات رہے ہیں۔ دونو قومیں ایک ہی آرین سرچشمہ کی دو دھاریں ہیں لیکن ایک ہی اصل نسلی کے باوجود بعد میں یہ دونوں شاخیں اسقدر ایک دوسرے سے منحرف ہوگئیں کہ ایک واحد مبدءِ مشترک کی طرف تمسک خیال رجوع ہو سکتا ہے! تاریخ قدیم کے یہ دو عظیم الشان ملک دو مستقل شاہراہوں پر گامزن ہو گئے۔ جو قومیں ایک ہی خاندان کے گویا دو قبیلے تھے اور جن کے نسبی و مذہبی ہر دو قسم کے خصائص مشابہ تھے اُن میں ان دو قائدین اعظم نے بعد المشرقین پیدا کر دیا!

ان دونوں ہستیوں کی سیرتوں اور اُنکے پیدا کردہ انقلاب کا پہلو بہ پہلو مطالعہ کرنیکے

عہد متعلقہ کے سنین و سال کے تعین کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ میدان تاریخ میں وہ موقع
”میں راہ“ کی حیثیت رکھتا ہے جہاں ایران اور آریہ ورت کے دل اور دماغ تخیل
قیدے کی دو الگ دنیائیں بن گئے! امانت داران تاریخ اس واقعہ شگفت کو قریباً ۲ ہزار
قبل ولادت مسیح کی ایک واردات بتاتے ہیں۔ ڈاکٹر میکڈانل، مشہور محقق تاریخ، اس ابہام
ل میں ذرا قطعیت پیدا کر کے سنہ ۱۵۰۰ ق۔ م کا سن پیش کرتا ہے (ملاحظہ ہو ”ادبیات سنسکرت“
فہ میکڈانل، صفحہ ۱۲) مگر روزنامچہ والی صحت و حتمیت کا یہاں خواب بھی نہ دیکھنا چاہئے، یہ
ن و تقرر محض ایک اضافی زاویہ نگاہ سے صحیح ہے اس لئے کہ افق تاریخ کی بعید تاریکیوں
الس کی نظر دوربیں ایک رصدگاہی مشاہدہ عینی کر سکتی ہے؟! پھر اہل ایران و ہندوستان
ہذا فراق بینی و بینک“ کوئی واحد واقعہ مفارقت نہیں ہے۔ اپنے ابتدائی مرزبوم ایشیائی
ی سے ہجرت آریائی کے سیلاب کی بہت سی لہریں ایک دوسرے سے متفرق ہو ہو کر عرصہ
ز تک آتی رہیں جن کا سلسلہ کئی صدیوں تک طویل ہوتا ہے۔ بہرحال اس قیاس نے
اریخی نظریہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے کہ سنہ ۱۵۰۰ ق۔ م تک آرین مہاجرین پورے طور
اب اور دوآبہ گنگ و جمن میں خیمہ زن ہو گئے تھے اور وید مقدس کے نغمات حمد و ترانہائے
لی تدوین مکمل ہو چکی تھی۔ اس طرح ارض یہودا میں حضرت داؤد کی سلطنت کا اختتام اسی
صر ایک واقعہ ہو گا!

تواریخ میں بدھ اعظم کا دور زندگی عموماً ۴۸۳ و ۵۶۳ ق۔ م کے مابین محصور شمار
اتا ہے۔ اس تاریخی حقیقت کے یہ معنی ہوئے کہ کلدانیوں کے ہاتھوں ہیکل سلیمانی کی آتش زنی
یادگار واقعہ کے ۲۲ سال بعد بدھ کا جسد اطہر شکم مادر سے باہر آیا اور بیت المقدس کے
د ثانی کی تعمیر سے ۱۰ برس قبل اُس کا وصال ہوا!

لیکن حیات زرتشت کے متعلق جو سنین ہیں اُن کی تاریخی تنقید و تحقیق ایسی آسان نہیں!
مسئلہ کے متعلق دو مستقل نظریے ہیں۔ ایک روایاتی عقیدہ پارسیانِ بمبئی میں مروج ہے اور

یہی اہلِ تاریخ کی بھی مرجح اور مقبول رائے ہے۔ اس کا مفاد یہ ہے کہ زرتشت کے عرصۂ حیات کے آغاز و انجام کو سنہ ۶۶۰ ق، م اور سنہ ۵۸۳ ق۔ م کی تاریخیں متعین کرتی ہیں۔ وہ ۷۷ سال کی عمر میں مرا۔ بالفاظ دیگر ۲۷ سال قبل میلاد بدھ سے اور ٹھیک ایک صدی قبل اس کی وفات سے! پس وہ معاصر ہے جیرمیہ کا، اور دانشورانِ چین لاوٹزے و کنفیوسٹس اور حکمائے یونان سولن و ہیرقلیطس سے قریباً ایک صدی قبل وہ ایران کی زمین پر بقیدِ حیات تھا! یہ قیاس اُن روایات پر مبنی ہے جو نسلاً بعد نسل چلی آتی ہیں، نیز اُن تاریخی نوشتوں پر جو زرتشت کے اہلِ وطن اور دنیا کی دوسری قوموں کے ذخیرۂ معلومات میں امانت رہے ہیں۔

تعینِ عہد کے بارے میں دوسرا نظریہ زمانۂ زردشتی کو عقبِ تاریخ میں بہت دور تک لیجاتا ہے جس کی منزل کم و بیش سنہ [illegible] ق۔ م ہے۔ اس قیاس تاریخی کی دو ستونوں پر تعمیر ہوئی ایک ان میں سے یہ دلیل ہے کہ اس خیال کے ذریعہ سے کافی وقت ان تغیرات و محرفات کے لئے مل جاتا ہے جن میں سے ہو کر یہ مذہب گذرا۔ عہدِ ظہورِ دعوتِ زرتشت سے لے کر اس وقت تک کہ اسکا علم ہم کو ہمعصر کتابوں اور تاریخی دستاویزوں سے ہوا! ایک دوسرا معاصرانہ بیان دینِ زردشتی کے متعلق ہیروڈوٹس کی تاریخ سے ملتا ہے جو پانچویں صدی ق۔ م کا نامور یونانی سیّاح اور مورخ ہے۔ مزید براں ایک شہادت چھٹی صدی قبل مسیح کے دارائی کتبہ واقع جبل بیستون کی ہے اور قطع نظر ان کے مذہبی لٹریچر بھی اس نقطہ پر معتدبہ روشنی ڈالتا ہے۔

تاریخ کے اس عہد میں مذہب زردشتی کا صحیح تر نام مجوسیت ہونا چاہئے اس لئے کہ یہ قریباً تمام و کمال میجی کی دعوت تھی جس کے اندر دینِ زردشتی کے بعض سنن کا محض تبرک پایا جاتا تھا تعلیمات زرتشت کا صحیفہ ایک مختصر ضخامت کا مجموعۂ نغمات ہے جو گاتھ کے نام سے موسوم ہے۔ اسکا سررشتہ تصنیف براہ راست زرتشت تک پہنچتا ہے اور غیر منقطع سلسلۂ روایت کے استناد کی مضبوطی پر اسی چیز کو بانیٔ مذہب کی ذات سے منسوب کر سکتے ہیں۔ اس میں اگر

کوئی دوسرا عنصر ہے بھی تو وہ سرچشمۂ ابتدائی کی قریب ترین شاخیں ہیں یعنی زرتشت اعظم کے حوارئین اولین کے ملفوظات و رشحات! زرتشتیت اور مجوسیت کے درمیان اس درجۂ تفاوت راہ" دیکھا جاتا ہے کہ ہر دو کے ظہور کے اوقات کے درمیان ایک بمراحل وسیع تر مدت تسلیم کرنی پڑے گی۔ بمقابلہ اس مدت کے جو عموماً فرض کیجاتی ہے یعنی کل ۶۲ سال! جو وفات زرتشت (بشرطیکہ وہ ۵۸۳ھ ق۔م ہی کا واقعہ ہوا) اور دارا کے تخت نشینی کے جلوس اول (۵۲۱ھ ق۔م) کے مابین حائل ہے حقیقت یہ ہے کہ ۶۲ سال تو ۶۲ سال چھ یا سات صدیاں بھی اس یکسر انقلاب کی ارتقائی نشو و نما کے لئے کوئی غیر معمولی مہلت نہ ہوگی! ان قیاسات تاریخی اور اصول تنقید کی بنا پر زرتشت کی بعثت ۱۵۰۰ اور ۱۰۰۰ ق۔م کے درمیان رکھنی پڑے گی!

زرتشت کے زمانۂ حیات کو اس قدر ماضی بعید میں لیجانے کی دوسری وجہ فلسفۂ تاریخ کے اصول کی رو سے یہ ہے کہ لسانی نقطۂ نظر سے یہ قیاس زیادہ قرین عقل معلوم ہوتا ہے زرتشتی گاتھا اور رگ وید کی زبان باہم اس درجہ مشابہ ہے کہ یہ بات بلاشبہ ناممکن معلوم ہوتی ہے۔ کہ انکے اوقات تدوین کے درمیان اتنا بڑا بعد زمانی واقع ہو جتنا کہ اول الذکر نظریہ کی بنا پر سمجھا جاتا ہے اور جس کی ابتداء و انتہا ترانہائے وید کی تالیف اور ساتویں صدی کا اختتام ہیں۔ بخلاف اس کے قرائن و آثار ایسے ہیں کہ ہر دو صحائف ایک ہی عہد میں عالم وجود میں آئے یا کم از کم اُنکے اوقات پیدائش ایک دوسرے سے قریباً بالکل پیوستہ ہیں! یہ لسانی تفتیش یقیناً بہت مسلم الثبوت ہوا کرتی ہے اور بعض اوقات وہ تاریخ کے بڑے بڑے رازہائے سربستہ کی عقدہ کشائی کر دیتی ہے جن کا سراغ کسی دوسرے ذریعہ سے لگنا ناممکن ہوتا، کوئی فرضی لسانی خصوصیات کسی مختلف عہد کی تصنیف میں پیدا کرنا آسان کام نہیں۔ یہاں اصل و نقل باوجود ہر کوشش خفا کے بیشمار شواہد و علامات سے اپنی حقیقت کی غمازی کر دیتی ہے ذخائر تاریخ میں ایسی بھی کتابیں پائی گئی ہیں جن میں ارادہ

ایک فرضی قدامت کا رنگ پیدا کیا گیا ہے لیکن اس جعل نے زبان حال سے اپنی مخبری کر دی ہے۔ الغرض گاتھا اور ویدوں کی زبان کی ہم رنگی ان تمام شکوک و امکانات سے علانیہ بری معلوم ہوتی ہے اور اغلب یہ ہے کہ یہ دونوں مقدس نوشتے کم و بیش ہمعصر ہیں۔ لیکن اب اگر یہ خیال صحیح ہے جیسا کہ تمام بیرونی و اندرونی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے تو اسکا نتیجہ صریح یہ خیال ہوگا کہ زرتشت اعظم اور موسیٰ علیہ السلام نے دو الگ الگ ملکوں میں بیک وقت "آتش حق" کی تجلیاں دیکھیں! اور جس وقت اول الذکر اہل ایران کو ظلمات ضلالت سے نکالکر نور یزدانی کی طرف لا رہا تھا اُسی وقت آخر الذکر بنی اسرائیل کو مصر سے شامی حکومتوں کی بشارتوں کے درمیان نکالے لئے جا رہا تھا! یہ وقت غالباً تیرہویں صدی قبل مسیح ہے! اس لئے کہ بعض فضلائے تاریخ یہود، اسرائیلی ہجرت کی سال ۱۳۲۵ق۔ م بتاتے ہیں!

زرتشت اور بدھ کی دعوت اور سیرت کے بیشتر حالات ہم کو کتابوں سے معلوم ہوتے ہیں، لیکن یہ ذریعہ معلومات بدھ کے معاملہ میں زیادہ کار آمد ہے۔ ساکیہ منی کے مذہب کی کتابیں روز اول سے غیر معمولی حزم و احتیاط کے ساتھ محفوظ رہیں اور انکو کوئی بیرونی حادثہ پیش نہ آیا۔ خارجی آمیزش کے عناصر اگر ہیں بھی تو وہ بآسانی قابل شناخت ہیں اور یہ بالعموم وہی الحاقی ابواب ہیں جو اصل صحیفہ کی ہر فصل کے بعد بڑھا دئے گئے ہیں تاکہ "افسانویت کے شیدائی اپنے ذوق کو پورا کرلیں: نیز اس مرشد اعظم کے نیازکیشوں اور فدائیوں کو عقیدت و ارادت کے بہشتی پھولوں کی جو گلباری کرنی ہے وہ کرلیں۔ مزید برآں ان زوائد میں ایک اور جزو کے طور پر ہم سحر انگیز ترانہائے منقبت اور تسخیری اثرات والے اسمائے اعظم پاتے ہیں لیکن نیازونیائش کے اس ہنگامے میں ایک متلاشی حقیقت کی اصلی گوتم تک بلا دقت باریابی ہو سکتی ہے، جو پیپل یا جامن کے شجر مقدس کے نیچے بیٹھا ہوا میخانہ معرفت و فنائیت کی ساقی گری کر رہا ہے!

لیکن زردشت کے متعلق سارا ذخیرہ تاریخی ہمارے خواب تحقیق کو بالکل پریشان کر دیتا ہے۔ بنیادی صحیفہ کے ضمیمہ جات کی حیثیت سے نغموں اور ترانوں، افسانوں اور

داستانوں کا ایک بے پایاں دفترِ اساطیر و ساتیر موجود ہے جس کی ایجاد قرونِ قبل التاریخ سی متعلق ہی۔ یا پھر اُن صدیوں کی پیدائش ہی جو زمانہ بدعت و تحریف سے شروع ہو کر سکندرِ اعظم کے حملہ پر ختم ہو جاتے ہیں! ایران کی مذہبی ادبیات پر بڑی بڑی ہولناک افتادیں پڑیں اور دو مرتبہ مختلف اوقات میں تو یہ سارا مقدس ذخیرہ بال بال خطرۂ فنا سے بچا جبکہ اُس کے اوراقِ پریشان کے دلسوز عقیدتمندوں نے طوفانِ حوادث کے گزر جانے پر بعد میں از سرِ نو شیرازہ بندی کی! کسی وقت میں اس وسیع و ضخیم دفتر کے پورے دو نسخے جو از روئے روایت بارہ ہزار گائے کے چمڑوں پر لکھے ہوئے تھے اور شہر پرسی پولیس میں محفوظ تھے، لیکن سکندرِ یونانی نے جب ۳۳۰ ق۔م میں شہر مذکور کو فتح کیا تو اُس سب کو نذرِ آتش کر دیا۔ عہدِ حاضر کے عظیم الشان کتبخانوں کے مہتمین کے لئے یہ امر قابلِ غور ہے کہ اُنکی الماریوں کے بار کی کثرت و اہمیت کا کیا حال ہوتا اگر ایرانِ قدیم کی مذہبی دنیا اس قیامت خیز حادثۂ فاجعہ سے آشنا نہ ہوئی ہوتی!؟ خیر شاہانِ ساسانی کے علم کے نیچے جب دوبارہ ایران خاکِ مذلت سی اُٹھا تو دینِ آتشی کے سوختہ اوراق کے پرزے آتشِ اسکندری کی خاکستر سے پھر چنے گئے لیکن جب اس دفترِ ابتر کی بار دگر شیرازہ بندی ہوئی تو اُس سے مذہبِ مجوسیت کے صحائف کی جلدیں تیار ہو گئیں! زرتشتیت کے اس نقشِ ثانی کا سکہ ایران میں تیسری صدی مسیحی سے لے کر ساتویں صدی تک چلتا رہا۔ اس وقت مطلعِ عالم پر اسلام کا طوفان اُٹھا اور بہت جلد سارا ایران اُس کے آغوش میں تھا۔ موجودہ پارسیوں کے آبا و اجداد نے اپنی جانوں کی طرح اپنے عزیز از جان مذہب کی کتابوں کو ہی لے کر اپنے وطنِ محبوب کو خیرباد کہا اور ساحلِ بمبئی پر ایک بندرگاہِ پناہ اُنکو مل گیا جہاں اُنکی اولاد آج ہی موجود ہے اور جس جگہ انہوں نے آتشخانۂ پارس کی لائی ہوئی آگ کی طرح اپنی آتشیں شریعت کے باقیماندہ اسفار و کتب کو بھی اس وقت تک امانت رکھا اور دنیا کے تشنۂ ذخیرۂ تاریخ کو تفویض کر دیا۔

اس سارے دفتر کا اصلی مغزِ سخن گاتھ کا مختصر مجموعہ ہی۔ گاتھ پانچ جلدوں میں ہے جن

میں کل ، اترانے ہیں جو یاسن کہلاتے ہیں پہلی جلد میں ، یاسن ہیں، دوسری اور تیسری جلدوں میں چار چار اور چوتھی اور پانچویں جلدوں میں سے ہر ایک میں ایک ایک

کیا فلسفۂ تاریخ کا متفحص اور محتسب اس راز کے "درون خانہ" کچھ جستجو کرسکتا ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جو زرتشت کے لئے "صلائے قم" ثابت ہوئے اور دین زرتشتی نے خاک ایران سے سر نکالا؟ زرتشت ایک ایسے ملک میں رہتا تھا جو قطعاً زراعتی تھا، جہاں کے باشندے ایک سیدھی سادی قوم تھے جس کے افراد کاشتکار تھے یا گوالے اور جو قدیم و اولین آریائی مذہب رکھتے تھے اور اس مذہب کی ہندوستانی امت ہی کی سی ذہنیت و معاشرت یعنی زندگی، سیرابی، اور خوشحالی کے مرکزوں کی تلاش میں ادھر اُدھر نقل مکان کرتے پھرتے اور زمین و آسمان کے مناظر و مظاہر فطرت اُن کو مسحور اور مسرور کرتے! اس مذہب کی تفصیلات سے ہم زیادہ واقف نہیں لیکن یہ یقینی ہے کہ وہ آریہ ورت کے ویدک مذہب کا ایک مثنیٰ تھا۔ دونوں کی یکسانیت کی محسوس علامات دستیاب ہوتی ہیں۔ ایک خاصی طویل فہرست ان الفاظ کی دیجا سکتی ہے جو ہر دو ملکوں میں مستعمل تھے اور انکے معلومہ عقائد و مراسم کے آئینہ دار ہیں۔ ایرانی اہورا جس کے معنی پروردگار کے ہیں اور جو مزدہ کا خطاب ہے ہندوستانی لفظ اسورا کا پارسی بھائی ہے جو ورونا اور بعض دیگر ویدک دیوتاؤں کا اسم حسنیٰ ہے۔ ایران کا ہوما (شرب مقدس) ہندوستان کے سوما کا "نشۂ معنی" رکھتا ہے؟ ہندی آریوں ہی کی طرح ایرانی بھی دیوتاؤں کی قربانگاہوں پر عبادت کے وقت سبزی کا ایک فرش زمردیں بچھایا کرتے تھے۔ ہندوستان کا ایک دیوتا مترا ایرانی خدائے متھرا کے لباس میں نظر آتا ہے! مزید براں "مقدس آگ" اور "مقدس بیل" دونوں مذہبوں کی عبادات و رسمیات میں ایک اہم عنصر کی طرح پائے جاتے ہیں!

الغرض زرتشت کی قوم و ملک ایک خاص قسم کے خطرے کی دائمی طور سے آماجگاہ تھے۔ قزاقی پیشہ قبائل کے لوگ آئے دن انکی آبادیوں اور کشت زاروں کو تہ و بالا کرتے

رہتے تھے اور وقت مراجعت اُن کی سب سے بڑی متاع یعنی اُنکے مواشی کو ساتھ بھگا لیجاتے تھے۔ زرتشت نے اس دلخراش منظر کو دیکھا اور اُس کے معرفت آگیں دل و دماغ پر ایک دوگونہ الہام کا القا ہوا۔ اس نے کائنات کو حق و باطل کے ایک معرکہ گاہ کے رنگ میں دیکھا جس کے اندر خالق ہستی برسر حق گروہ کی قیادت کرتا ہے۔ زرتشت نے اپنی مظلوم قوم کو اس حیثیت کا مصداق قرار دیا اور اس عقیدے کو اپنے پیرؤوں کے دل میں راسخ کر دیا۔ اس سارے "عقائد نامہ" کی تہ میں یہ غایت کارفرما تھی کہ وہ اپنی قوم کو ایک زبردست مدافعت اغیار پر ابھارے اور انکے قلوب میں کامیابی کا ہمیشگی یقین نقش کر دے!

عہد ما بعد کی کتابوں میں زرتشت کی زندگی کے جو حالات و واقعات ہم کو ملتے ہیں وہ واقعہ اور افسانہ ہر دو کا معجون مرکب ہیں۔ روایات میں ایسا مذکور ہے کہ شروع ہی میں اُسکے قلب پر اس حقیقت کا پرتو پڑنے لگا تھا کہ وہ مرتبہ نبوت پر فائز کیا جانے والا ہے۔ اسی کی طرف اُس کی ایک ابتدائی نظم میں بھی کنایہ پایا جاتا ہے جو ایک عالم کشف و حالت انشراح میں لکھی گئی معلوم ہوتی ہے۔ روایت کے دوسرے اجزا اس وقت اس کی عمر کو ۳۰ سال بتاتے ہیں۔ لیکن اس کی دعوت کا ابتدائی دور بہت ہی ہمت شکن اور صبر آزما نظر آتا ہے۔ اولین کشف کے بعد ۱۲ برس تک اُس کو ایک مسلسل سیاحت و ہجرت کی حالت میں رکھا جاتا ہے اور اس اثنا میں وہ چھ اور روحانی مشاہدوں سے نوازا جاتا ہے جن میں اس کو اپنے منصب کا کامل تیقن حاصل ہو جاتا ہے اور اپنے مشن کی بسم اللہ کرنیکے لئے آخری اور ناطق احکام مل جاتے ہیں۔ لیکن اس تمام مدت میں اس کو کوئی مصدق یا رفیق کار نہیں ملتا۔ بالآخر وہ وشتاسپ شاہ بلخ کے دربار میں وارد ہوتا ہے اور تاجدار مذکور اُسکا اولین "صحابی" بنتا ہے جس کے ساتھ ہی وہ اپنی حکومت کے سارے وسائل کو نئے مذہب کی اشاعت کی راہ میں وقف کر دیتا ہے۔ بادشاہ کے علاوہ اس کے سارے اہل خاندان اور ارکان دربار بھی زرتشت کے علم دعوت کے نیچے جمع ہو جاتے ہیں۔ جب تائید غیبی سے یہ تمام مطلوبہ وسائل

حاصل ہوجاتے ہیں تو شریعت زرتشتی کے مقصدِ وحید کی طرف فوراً عنان توجہ پھیری جاتی ہے۔ مغلوب ومقہور ایرانیوں سے ایک صف مدافعت تیار کیجاتی ہے اور ”خدائے دانشور“ کے نام سے حملہ آور قزاقوں پر فوج کشی بول دیجاتی ہے، اور زرتشت کا ”دین آتشیں“ سچ مچ آگ اور خون کا کھیل کھیلنے لگتا ہے! زرتشت کے پرچم کے نصب کیے جانیکا یہ پہلا دن ہے!

زرتشت کے مذہب کی خاص اہمیت اور دلچسپی کا حامل اُس کا وہ عقیدہ ہے جو ذات ایزدی کے متعلق قائم کیا گیا۔ خدا کو جو نام دیا گیا وہ اہورا مزدہ تھا جس سے اس حقیقت روشنی پڑتی ہے کہ کم از کم وہ قبیلہ جس سے وہ ہم رشتہ تھا فطرت الٰہی کے متعلق اُس سے زیادہ گہرا تخیل رکھتا تھا جو صرف ایک مظاہر پرست قوم کے دماغ سے مخصوص ہوتا ہے! الفاظ کے معنی ہیں ”خدائے حکیم“ یعنی وہ خالق ہستی کے اندر ”حکمت کا مشاہدہ کرتا ہے“ حکمت نہ کہ صرف ایک غیر مدبر ”قوت محض“ جو عام ملحدانہ وکورانہ نظریہ ہے! زرتشتیت کی ترقی یافتہ ذہ کی یہ ایک ممتاز خصوصیت ہے اور تاریخ مذاہب میں ایک ایسا ”نشان راہ“، جو انسانی کی اس راہ میں ایک اہم منزل طے کر لینے کا سراغ دیتا ہے!

مزدہ کے خط وخال اہل ہند کے کسی دیوتا کی صفات سے نہیں ملتے، بجز ورُونا اور یہ استثنا بھی ایک جزوی نوعیت رکھتا ہے۔ ورُونا دیوتا کے ساتھ مزدہ کا یہ تشابہ صر انہیں معدودے چند بھجنوں کی حد تک ہے جو اول الذکر کے متعلق پائے جاتے ہیں۔ ساتہ یونان کے سارے ”دارالاصنام“ میں اس کی شبیہ کسی سے نہیں ملتی، باستثنائے زا کے جو محض اپنی بعض انتہائی صفاتِ عالیہ میں یہ مقام حاصل کر سکا ہے!

اہورا مزدہ کی ہستی مظاہر فطرت کے وجود کے ہم معنی نہیں ہے، برخلاف اس کے اُنکا خالق ہے! وہ آفتاب وماہتاب میں جلوہ آرا نہیں ہے بلکہ اُس کی منزل گاہ کسی فضا قدس کی روحانیت میں واقع ہے۔ عرش وکرسی پر چڑھنے سے اُس تک رسائی نہیں

[illegible] ”فکر صحیح“ [illegible] وہ محض کوئی مجرد

یا روح نہیں ہے بلکہ اُس کی حقیقت کی تعبیر صاف صاف ایک شخصیت سے کی گئی ہے، چنانچہ زرتشت اس سے براہ راست ہم کلام ہوتا ہے، مشورہ لیتا ہے اور یہ استمزاج چھوٹے بڑے ہر قسم کے امور کے متعلق ہوا کرتا ہے، وہ اُس سے وقتاً فوقتاً بکثرت سوالات و استفسارات کرتا رہتا ہے، چنانچہ (ایک گویا "حدیث قدسی" میں) اہورا مزدہ اس سے خطاب کرکے کہتا ہے کہ "اے زرتشت! تیری التجاؤں اور دعاؤں کی مخاطب ایک بڑی ذات ہے" (یاسن ۴۳-۱۰)

اہورا مزدہ کی کبھی ایسی تصویر نہیں کھینچی گئی جو جسمانیت کے شائبہ سے آلودہ ہو۔ ہم کبھی "پھولوں کے ہار" اس کے زیب گلو نہیں دیکھتے، نہ اس کے موکب شاہی کی "رتھوں" کا جلوس نکلا کرتا ہے جو ہندوستانی اور عہد عتیق کے بعض دیگر ممالک کے خداؤں کے ٹھاٹھ ہیں! وہ انسانی قسم کے علائق سے پاک تر ہے، چنانچہ کبھی اُس کی "حرم محترم" کا ذکر سننے میں نہیں آتا، البتہ کبھی کبھی اس کے فرزندان ارجمند کا حوالہ دیکھا جاتا ہے مگر یقیناً یہ سب اُس کی اولاد معنوی ہیں اور بلاشبہ عبارت ہیں اُس کی صفات سے! زرتشت کے فلسفہ الٰہیات میں خدا کا شخصی وجود جسمانیت کے جملہ لوازم کا مستلزم نہیں ہے، چنانچہ اگرچہ زرتشت کا خدا کوئی آلات حواس نہیں رکھتا لیکن وہ بغیر کان کے سنتا ہے، بدون آنکھ کے دیکھنے پر قادر ہے، اور پوری طرح سمیع و بصیر، علیم و خبیر، اور مجیب الدعوات اور وہاب عطیات ہے! ہر بندے کو بالراست اس تک رسائی حاصل ہے اور عبادت خداوندی میں اس شرط کو خاص دخل ہے۔

زرتشت اپنی امت کے ساتھ عموماً و اصولاً چولی دامن کا ساتھ رکھنا چاہتا ہے لیکن بعض اوقات "اللہ سے واصل" ہونے کی تگ و دو "مخلوق میں شامل" رہنے میں مانع آتی ہے اور "برزخ کبریٰ میں" "حرف مشدد" کی صفات نسبتہً کم ہو جاتی ہیں، چنانچہ ایک موقع پر وہ اپنے کو کھیتی باڑی کے کام سے بالاتر بتاتا ہے لیکن اس کی تعبیر اور توجیہ وہ ایک دوسرے زاویہ نگاہ سے کرتا ہے اور اُسکو کسی عار یا کسر شان کے خیال سے منسوب

کرنے سے باز رکھنا چاہتا ہے۔ پس وہ خود کہتا ہے کہ "میں جو ایک معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں دوسرے مشاغل میں ضرورت سے زیادہ کیونکر دخل دے سکتا ہوں اور زراعت و فلاحت کے فرائض سے کس طرح عہدہ برا ہو سکتا ہوں؟ صراط مستقیم کا ایک راہبر و تلبیۂ انی کی خطوط کشتی کا حق ادا کرنے سے قاصر ہے!" (یاسن ۳۳-۶)

اپنے ملفوظات کے دوران میں ایک جگہ اُس کی زبان پر قربانی کا لفظ بھی آتا ہے لیکن اُس کے خصائص و شرائط کچھ دوسرے ہیں اور یہ پیشکش خدا اور اسکی ایک خاص صفت کو نذر دیا گیا ہے اور اس کی غایت بھی خاص ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے "ہم تیری ذات اور تیری صفات "حق" کے سامنے بصد ادب اپنی قربانیاں پیش کرتے ہیں تاکہ اُس "دار القرار" یا ملک لایبلی" میں وہ ہم کو "فکر صحیح" کے ذریعہ منزل کمال و تکمیل پر فائز المرام کریں (یاسن ۴۴-۲)

لیکن زرتشت اپنی امت کے سواد اعظم کے فرائض یہی قرار دیتا ہے کہ وہ زمین کا تردد کریں اور اپنے مویشی کی داشت و پرداخت، اور ساتھ ہی ساتھ اپنے نفوس کے اندر "امیشا، اسپینٹا" کی نشو و نما کرتے رہیں۔

یہ "امیشا اسپینٹا" مذہب زرتشتی کا بہت ہی اہم اور غیر معمولی عنصر ہیں۔ اگرچہ ان کی حقیقت و ماہیت بتانا بہت ہی مشکل ہے لیکن زرتشت انہی کی عینک سے تمام حقائق و امور کو دیکھتا ہے اور یہی چیزیں زرتشتیت کی پیشانی پر بخط جلی لکھی ہوئی ہیں۔ اہورآمزدہ اس ملت کا خدا ہے اور اسکی ذات واحد کے سوا کوئی اور ہمسر یا فرد تر قسم کے دوسرے خدا نظر نہیں آتے۔ بخلاف ازیں عہد وید کے ہندوستان میں، نیز یونان و مصر قدیم میں قوائے فطرت عرصہ دراز تک مستقل اور جداگانہ خداؤں کی حیثیت سے شمار ہوتے رہے۔ اُنکی باہمی منزلت کے متعلق دوسرا عقیدہ یہ بھی تھا کہ وہ آپس میں ایک ہی خاندان کے مختلف افراد کی طرح باہم دگر ہم رشتہ و مساوی رتبہ ہیں۔ ایران عتیق کے مذہب کی "بزم خداوندان" بھی کم و بیش ایسی ہی تھی تاآنکہ زرتشت نے ایک بالکل دوسری قسم کی الٰہیات کی بنیاد ڈالی۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ زرتشتیت کے عرش یزدانی

پر بھی ہم کو اہورامزدہ کے گرد کچھ صورتیں حلقہ زن نظر آتی ہیں جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ انکو مزدہ ہی نے اپنی ہستی سے وجود بخشا ہے لیکن پھر ان کی نوعیت کچھ اس قسم کی ہے کہ وہ نہ تو منصب الوہیت کی حامل ہیں اور نہ اہورامزدہ کی خدائی میں شریک وسہیم! بعض اوقات اُن کو شخصیتوں کے پیکر میں دکھایا جاتا ہے، کبھی وہ صفات الٰہی کی شکل میں جلوہ گر ہوتی ہیں کبھی باہم دگر ایک دوسرے کے قالبوں میں حلول کر جاتی ہیں، اور کبھی اُنکا مستقر کارفرمائی قلب انسانی ہوتا ہے! اُنکی تعداد بے شمار ہے جن میں سے بعض بعض کا ظہور شاذونادر ہوا کرتا ہے اور بعض کے مظاہر شب و روز مصروف نمود رہتے ہیں۔ انہی ارواح وصفات میں سے چھ کو زرتشتیت کے نقش ثانی مجوسیت میں چھ ملائکہ مسومین و مقربین" کا رتبہ دیا گیا ہے۔ گاتھ کے متون میں اس "بزم خاص" کی تعداد قریباً دو چند ہے لیکن سب کی حقیقت اصل پر ایک پردہ سا پڑا ہوا معلوم ہوتا ہے اور ہم انکے مدارج تقرب و دوری کو متعین کرنے سے بالکل قاصر ہیں۔

ان پر اسرار اور مجہول الکیف ہستیوں میں سے "روح حق" اور "فکر صالح" کا دوسروں کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ تکرار کے ساتھ ذکر آتا ہے اور قیاس غالب یہ ہے کہ انہی کو اہورامزدہ کی بارگاہ میں سب سے زیادہ فوق و تقدم حاصل ہے۔ ان دو کے بعد "جبروت" کا مرتبہ ہے اور بعد ازاں "رحمانیت" کا نمبر آتا ہے۔ اس آخر الذکر صفت میں شخصیت و جسمیت کے لوازم بہ نسبت دوسروں کے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ رحمانیت کے بعد "فلاح" اور "بقا" عموماً دست بدست نظر آتے ہیں! اور پھر یکے بعد دیگرے "تقدیر"، "آتش" و "روح ثور"، "خالق ثور" "روح القدس"، "طاعت"، "نجات" اور "حیات اصلح" ملتے ہیں! لیکن "ہستی حق" کی اس سارے مجمع میں بالاتری کا یہ حال ہے کہ اُسکا ذکر صحیفہ گاتھ کی نصف سے زیادہ آیات میں آتا ہے بعض اقتباسات :۔

"تو نے فی الواقع "حق" کو پیدا کیا" (یاسن ۳۱-۸)

"کون ہے اے مزدہ "فکر صالح" کا خالق ؟" (یاسن ۴۴-۴)

"کس نے "جبروت" کی معیت میں "رحمانیت" کے لعل گرانمایہ کو زندگی بخشی ؟ " (یاسن ۴۴-۳)"

کبھی کبھی یہ جماعت مشیران مزدہ کے لباس میں نظر آتی ہے -

اہورا مزدہ کے یہ سب آلات کار ہیں چنانچہ وہ اپنی جگہ پر خود مستقل العمل نہیں "رحمانیت" ایک پیامبر کی حیثیت رکھتی ہے اور احکام قضا و قدر کی ارسال و ترسیل کرتی ہے "جبروت" کا کوئی مستقل بالذات وجود نہیں ہے بلکہ وہ دوسری صفات کے متعلقات کی نوعیت رکھتی ہے اور اسم مضاف کے طور پر آتی ہے، مثلاً جبروت حق، جبروت فکر صالح وغیرہ وغیرہ - "رحمانیت" "فلاح" اور "بقا" کی صفات خداوندی مخلوق کے حصے میں بطور عطیے کے دیدی گئی ہیں، لیکن انسان کی مملوکہ ہو کر وہ اپنی مستقل ہستی کو جداگانہ حیثیت سے بھی قائم رکھتی ہیں اور انسانی وجود میں جزو لاینفک بنکر مدغم نہیں ہو گئی ہیں۔ وہ بمنزلہ ایک داعیۂ عمل کے کام کرتی ہیں اور گویا مزدہ کے کارندے ہیں۔ "روح ثور" تمام جانوروں اور مواشی کی جان جان ہے اور "خالق ثور" انکا محافظ اور بیشگاہ مزدہ میں انکا شفیع و وکیل ہے "آتش" اہورا مزدہ کی رسول خاص اور دست راست ہے "روح القدس" خود مزدہ کی روح قلب ہے، اور انسانی قلوب کی مایۂ حیات بھی وہی ہے "طاعت" وہ داعیۂ نفس ہے جو نفوس کو اطاعت حق کا امر و اثر آفرینی کرتا ہے۔ اور "نجات دہندہ" یا "ساؤشیانت" کے لقب میں روئے سخن خود زرتشت کی طرف ہے! "حیات اصلح" شاید کوئی نادر الوجود چیز ہے جس کا ذکر ملفوظات زرتشت میں صرف ایک جگہ آیا ہے!

"امیشا سپنتا" دراصل دوسرے خدا نہیں ہیں بلکہ وہ ذات او صفات الہی کے باہمی فصل و امتیاز کی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ نیز بندہ و معبود کے مابین ایک مشترک برزخ کا سامان فراہم کرتی ہیں تاکہ اس سے ہر دو کے درمیان ایک رشتہ روحانی کا معنوی تعلق پیدا ہو جائے۔ تخلقوا باخلاق اللہ!

یاسن ۳۱ کی آیات ۱۹ و ۲۱ کا مفہوم یہ ہے:

"جس شخص کے دل میں حق کا پرتو ہے اُس کے کلمات حق کو سننا ہر آدمی کا فرض ہے (ذالک لمن کان لہٗ قلب او القی السمع) وہ ایک عارف حقیقت ہے اور ایک طبیب حیات! (شفاء لما فی الصدور و ہدی و رحمۃ) مزدہ اہورا اپنی قدرت کاملہ سے فلاح، بقا، حقانیت، جبروتیت، اور فکر صالح کے ساتھ اُس شخص کو ایک نسبت سرمدی عطا کرے گا جس کے قلب و روح اور جس کے اعضاء و جوارح نے مزدہ کا مقام خلت حاصل کر لیا ہے (اللہ ولی الذین آمنو یخرجہم من الظلمات الی النور)"

یاسن ۵۱ کی آیت ۲۰ -

"اپنی برکات و سعادات آپ ہم کو عطا کرینگی، آپ سب جو کہ ایک ہی وجود کے اندر جذب وحدت ہو گئی ہیں اور جہاں حق، فکر صالح، رحمانیت، اور مزدہ میں کوئی تمیز باقی نہیں رہی ہے۔ یہ وعدہ ہمارے ساتھ پورا ہوگا اور جو شخص پورے خلوص عبودیت کے ساتھ اہورآمزدہ کی پرستش کریگا وہ نصرت غیبی اور تائید ایزدی کا ضرور مورد بنے گا۔"

زمانۂ مابعد کی روایات میں ان صفات کا قوائے فطرت کے ساتھ ایک رشتۂ تعلق پیدا ہو گیا اور ہر صفت ایک خاص مخلوق کے ساتھ وابستہ ہو گئی۔ چنانچہ "حق" آگ کی حفاظت کرنے لگا۔ "فکر صالح" حیوانات کا محافظ بنا، "جبروت" نے فلزات کو اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا "رحمانیت" ساری زمین پر سایہ افگن ہو گئی "فلاح" و "بقا" کے توجہات و نوازشات کے ماتحت تمام اشجار و انہار آ گئے۔ لیکن گاتھ کے صفحات کا جہانتک تعلق ہے وہاں یہ تقسیم عمل و تعلقات علوی و سفلی نظر نہیں آتے۔ یہ بظاہر مذاہب قدیم کے کسی صحیفہ کے مطالب سے مشابہت نہیں کھاتے، بجز اس کے کہ ہم بائیبل کے باب پیدائش کی آیت ۲۶ کے مضمون میں اسکا کچھ توارد فرض کریں یا پھر حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کے اس واقعہ

اس کو تشبیہ دیں جس میں پیغمبر ممدوح کے سامنے تین آدمی متمثل ہو کر آئے ہیں!

گاتھ کے اندر وہ انسانی پیکروں میں نظر نہیں آتے۔ یہ قلب ماہیت بعد کی کتابوں میں ہوئی ہیں، چنانچہ رحمانیت ایک نسوانی ہستی ہے اور اہورا مزدہ کی دختر نیک اختر بن گئی ہے (یاشت ۴۵-۴) لیکن نسائیت کا تخیل کچھ زیادہ آگے نہیں بڑھتا اور اساطیر کی کسی مکمل عمارت کی بنیاد اس پر تعمیر نہیں کی جاتی۔ اس عقیدے نے مذہب زرتشتی میں کوئی قابل اعتنا اہمیت یا دخل حاصل نہیں کیا اور زرتشتیت کی عمومی ذہنیت سے بالکل الگ اس کو ایک استثنائی معاملہ سے تعبیر کر سکتے ہیں، چنانچہ دوسری دو صفات "فلاح" اور "بقا" جن کے نام بھی نسوانی ہیں اس لئے تغیر جنسیت سے محفوظ رہی ہیں، اور تین اور جن کے نام تذکیر و تانیث سے بے تعلق ہیں یعنی "حق"، "فکر صالح"، اور "جبروت" ان میں بھی کسی مخصوص صنف کا اظہار نہیں پایا گیا۔ "آتش" "طاعت" وغیرہ کا بھی یہی حال ہے۔

(باقی)

مستشرقین کی سترھویں بین الاقوامی کانگریس

اس دفعہ سولہ برس کے بعد مستشرقین کی کانگریس کا اجلاس اگست کے آخری ہفتہ میں آکسفورڈ میں منعقد ہوا۔ لڑائی اور اس کے بعد صلح کی پریشانیوں نے یورپ والوں کو ابتک اتنا موقع نہیں دیا کہ وہ اپنے پرانے امن کے مشغلوں کو از سرنو جاری کرسکیں۔ علمی تحقیق امن کے زمانہ کا ایک بڑا ضروری اور اہم مشغلہ ہے۔ چنانچہ آکسفورڈ کے اس اجلاس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ زندگی پھر آہستہ آہستہ اپنے پرانے مشغلوں اور دلچسپیوں کو پیدا کررہی ہے۔ اس اجلاس میں یورپ اور امریکہ کے ان سب اداروں اور تعلیم گاہوں کے نمائندے موجود تھے جو مشرقی علوم کی تحقیقات سے کسی قسم کی بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ انگلستان، امریکہ، اور فرانس کے نمائندوں کے علاوہ جرمن گورنمنٹ نے، پروفیسر سی۔ ایچ بیکر کو جو آجکل موجودہ گورنمنٹ میں وزیر تعلیمات ہیں اور عربی علوم و تہذیب سے دلچسپی رکھتے ہیں، بحیثیت نمائندہ بھیجا۔ جرمنی کے اور مشہور لوگوں میں پروفیسر ایچ لوڈرس، ای لٹمان، اے فشر، پی کاہلے اور سی الیف لیہمان ہاپٹ کی شرکت بھی قابل ذکر ہے۔ فرانس کی گورنمنٹ کی طرف سے موسیو کولان اور پیرس یونیورسٹی کی طرف سے پروفیسر اے فوشے شریک اجلاس ہوئے۔ پروفیسر جے بلوک نے پیرس کی سوسیتے ایشاٹک اور مجلس السنہ پیرس کی نمائندگی کی۔ پروفیسر بریسٹڈ نے ممالک متحدہ امریکہ کی نیابت کی۔ ان سب لوگوں کی موجودگی اور انکے ساتھ یورپ کے بہت سے ملکوں کے تماشائیوں کے ایک جگہ اکٹھا ہونے سے آکسفورڈ کی فضا میں ایک خاص دلچسپی پیدا ہوگئی اور پورا ہفتہ ایسا باتوں ہی باتوں میں گذر گیا کہ کسی کو معلوم ہی نہ ہوا۔ اس ہفتہ میں مضامین پڑھے گئے، دعوتیں اور چائے نوشیاں ہوئیں، تصویریں کھچیں، الگ الگ ملاقاتیں ہوئیں، غرضکہ یہ سب دلچسپیاں ایسی ہیں کہ ہفتہ تو ہفتہ مہینہ گذر جائے اور پتہ نہ لگے۔

مضامین کے لحاظ سے نشستیں الگ الگ روزانہ ہوتی تھیں۔ تقسیم یوں تھی۔ اول تقسیم عامہ جس میں عام دلچسپی کے مضامین پڑھے گئے۔ دوم اسیریالوجی اور ملحقہ مضامین، سوم مصریات و افریقیات، چہارم وسط و شمالی ایشیا۔ پنجم مشرق اقصی۔ ششم (الف) ہند قدیم۔ ششم (ب) ہند جدید، جنوبی ہند اور لنکا۔ ششم (ج) ایران

ارمینیا اور قاف۔ ہفتم عبرانیات اور ارمیات۔ ہشتم اسلامیات اور ترکیات۔ نہم مشرقی فنون لطیفہ۔

بعض وقت بڑی دقت یہ ہوتی تھی کہ وہ شخص جس کی وفاداریاں اور دلچسپیاں بٹی ہوتی ہیں اور جو ایک حریص کی طرح ایک ہی وقت میں بہت سی چیزیں چاہتا ہے، ایک ہی وقت دو جگہ نہیں شریک ہو سکتا تھا۔ اگرچہ انتہائی کوشش کی گئی تھی کہ اس قسم کا کوئی تصادم نہ واقع ہو لیکن انسانی دلچسپیاں اتنی ہیں اور انکی نوعیتیں اتنی مختلف ہوتی ہیں کہ ان پر حاوی ہونا ناممکن ہے۔ مثال کے طور پر ایک ہندوستانی مسلمان کو لیجئے جسے اسلامی مضمونوں سے اس لئے دلچسپی ہوتی ہے کہ اسکی تہذیب و معاشرت کا گذشتہ اسلام سے وابستہ ہے اور ہندی مضمونوں سے اس لئے کہ وہ اس کی موجودہ زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن پھر بھی منتظمین واقعی قابل داد ہیں کہ اس قسم کا تصادم بہت کم واقع ہوا۔

اس اجلاس کی دلچسپی میں ایک مزید اضافہ خود آکسفورڈ اور اسکے نواح کی پرسکون فضا سے بھی ہوا۔ اس مقام کا جائے وقوع بجائے خود پرلطف ہے، دریا اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا منظر، زمین کا نشیب و فراز سبزہ و شادابی نہایت پرفریب ہیں۔ آکسفورڈ انگلستان کی ذہنی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ انگلستان میں سب سے پہلے یونیورسٹی کے تخیل کو لوگوں نے نہیں سمجھا۔ ہنری دوم نے بادشاہ فرانس سے کچھ ناچاقی کے باعث اپنے اُن طالبعلموں کو جو پیرس میں تعلیم پا رہے تھے واپس انگلستان بلا لیا، کسے معلوم تھا کہ یہ نوجوان پیرس سے ایک نیا تخیل انگلستان لائیں گے، اور آکسفورڈ کی خانقاہ میں ایک یونیورسٹی کی بنیاد رکھیں گے۔ انسانی تاریخ میں اتفاقات اور انکے اثرات کو ذرا غور سے دیکھا جائے تو انسانی ارادہ و تدبیر پست ہمت پڑ جائیں۔ بعض دفعہ باتوں سے ایسی باتیں اور چیزوں سے ایسی چیزیں پیدا ہوتی ہیں جن کا کسی کو اُس وقت وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ یورپ کی ساری تعلیم گاہوں کو دیکھئے۔ یہ سب پہلی خانقاہیں تھیں جہاں لوگوں کا شغل سوائے اللہ اللہ کے اور کچھ نہ تھا بارہویں، تیرہویں صدی عیسوی میں بھلا کون یقین کرتا کہ ساربون کے گرجا کے سامنے اگسٹ کونٹ جیسے شخص کا بت نصب ہوگا۔ انسانی ترقی کی تاریخ انہیں اتفاقات اور غیر متوقع باتوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔

ہندوستان سے بعض یونیورسٹیوں نے اپنے نمائندے نامزد کر دئے تھے اور میں سمجھتا ہوں لوگ محض کانگریس میں شرکت ہی کی غرض سے انگلستان تشریف لائے۔ بھنڈرکار انسٹیٹیوٹ کیطرف سے پروفیسر ایچ آر دیوکار

صاحب نے نمائندگی کی۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب گورنمنٹ دہلی کی طرف سے شریک اجلاس ہوئے اور عربی زبان اور اس کے محاوروں پر ایک مضمون بھی پڑھا۔ مسٹر عبدالحق صاحب عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے تشریف لائے تھے اور ابو تمام کی شاعری پر ایک مضمون پڑھا۔ مصری گورنمنٹ کی طرف سے موسیو طٰہ حسین صاحب نمائندہ تھے اور باوجود اس کے کہ اُنکے کئی مضمونوں کا پروگرام میں اعلان کیا گیا تھا صرف ایک مضمون اجلاس میں غالباً وقت نہ ہونیکے باعث پڑھ سکے۔ اُنکے مضمون یہ تھے:۔

(۱) لیبنٹز اور معتزلیوں کی تعلیمات میں بعض مشترک امور۔

(۲) ابتدائی ہجریوں کے مذہبی مباحث کا فن بلاغت پر اثر۔

(۳) قرآن میں ضمیر صیغہ غائب کا استعمال اسم اشارہ کی طرح۔

موصوف نابینا ہیں۔ یہ تیسرا مضمون چھپا ہوا تقسیم کر دیا گیا تھا لیکن انہوں نے اپنی تقریر میں لفظ بلفظ وہی کہا جو اس چھپے ہوئے مضمون میں تھا۔ عام طور پر انکی تحقیقات یورپ میں نہایت وقعت سے دیکھی جاتی ہیں۔ طٰہ حسین صاحب پیرس یونیورسٹی کے ڈی لٹ ہیں، فرانسیسی نہایت عمدہ اور شستہ بولتے ہیں، تقریر بھی فرانسیسی ہی میں کی تھی، انکی بیوی ایک شریف فرانسیسی خاتون ہیں۔ مجھ سے وہیں اجلاس میں ملاقات ہوئی اس کے بعد انہوں نے سہ پہر کو مجھے اپنے مکان پر بلایا۔ مکان پر جو اُن سے گفتگو ہوئی اس سے اور زیادہ عزت انکی میرے دل میں بڑھ گئی۔ مجھ سے کہنے لگے:۔

”آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی اور یہ معلوم کر کے اور بھی خوشی ہوئی کہ آپ اس تعلیم گاہ میں پڑھے جس سے میری بہت سی یادیں وابستہ ہیں“

میں۔ جی ہاں۔ میں نے عرصہ سے آپ کی تعریف سنی تھی خصوصاً اپنے ان نوجوان مصری دوستوں سے جو میرے ساتھ ساربون میں پڑھتے ہیں۔ یہ سب آپ کے گرویدہ ہیں۔

موصوف۔ ہاں میں اچھا خاصا بدنام ہوں۔ قاہرہ میں اپنے بعض ہندوستانی شاگردوں سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ ہندوستان کے بعض رسائل نے مجھے کافر ملحد کے لفظوں سے یاد کیا ہے۔

میں۔ مجھے یقینی طور پر معلوم نہیں کہ آیا آپ کے لئے یہی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں یا اسی قسم کے دوسرے

الفاظ جو ذریکم پڑے ہیں۔ یہ ہم لوگوں کی بدقسمتی ہے کہ ابھی ہم یہ نہیں سمجھتے کہ علمی تحقیق کرنے والا مذہب و آئین، رسم و رواج اور اپنے بیگانے کا فرق نہیں کرتا۔ وہ کوئی بات اس لئے نہیں کہتا کہ لوگوں کی دل آزاری ہو۔ وہ کسی مسئلہ کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرنے کا ویسا ہی مجاز ہے جس طرح لوگ بعض رایوں کو اپنا عقیدہ بنانے کا حق رکھتے ہیں۔

موصوف۔ ہر اس زندگی میں جہاں نمو ہے قدیم و جدید کی کشمکش ہونی ضروری ہے۔ اسلامی اور مشرقی ممالک اس کشمکش سے گذر رہے ہیں۔ ہمارا مستقبل اسی قدر درخشاں ہوگا جس قدر ہم اس کشمکش میں اپنا توازن قائم رکھ سکیں گے۔ میں مصر کے نوجوانوں کی ذہنیت کو جانتا ہوں۔ وہ ہر بات میں جدت کے لئے بیتاب ہیں۔ یہ بیتابی بڑی خطرناک ہے۔ دوسری طرف ہمارے ہاں وہ جماعت ہے جو زندگی کو رسم و مذہب کے آہنی شکنجہ میں جکڑے ہوئے ہے جو ذرا سی بات کو جو انکے عقیدہ کے خلاف ہے کفر سمجھتی ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا میری کتاب ”الادب الجاہلی“ پر لوگوں نے کس نقطہ نظر سے اعتراض کئے۔ ہر مذہبی عقیدہ یا رسم ہمیشہ معقول دلیل نہیں ہوا کرتی۔ اس ناروا داری کو یہاں تک میرے ساتھ برتا گیا کہ مصر کے عربی رسائل نے میرے مضمون چھاپنے سے انکار کر دیا اور مجبوراً مجھے دمشق کے ایک ماہوار رسالے میں اپنے مضامین بھیجنے پڑتے ہیں۔ اپنے مخالف کو سننا بھی لوگوں کو گوارا نہیں۔ اب اس وقت علماء کی جماعت سمجھتی ہے کہ روز بروز موجودہ علوم کے پھیلنے سے انکا رہا سہا اثر بھی زائل ہو رہا ہے۔ انہیں اپنا بھرم قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہر روز پبلک کے لئے ایک نیا شخشخہ چھیڑ دیں۔ بڑی دقت یہ ہے کہ ان میں بعض لوگ مخلص ہیں اور سچے محب وطن ہیں۔ ابھی حال میں ان میں سے بعض نے اشتراکیت سے دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ یہ غریب اپنے خیالات کی پیچیدگیوں اور انکے لازمی نتیجوں سے بیخبر ہیں۔ وہ بڑی آسانی سے اس بات کو پس انداز کر دیتے ہیں کہ اشتراکیت اپنے منطقی نتیجوں کے لحاظ سے مذہبی اور رسمی عقیدوں کے بالکل خلاف ہے۔ اشتراکیت کسی ”آسمانی بادشاہ“ کے وجود کی قائل نہیں۔ اشتراکیت کے نزدیک مذہب و آئین اور رسم و رواج سب انسانی انسٹی ٹیوشن ہیں اور ہر وقت انسان کو حق ہے کہ انہیں بدل دے۔ اشتراکیت کو تو یورپی لبرل ازم کی برخلاف مذہب و رسم کو بہ حیثیت ”واقعات“ نہ کہ بہ حیثیت ”واقعیت“ تسلیم کرنے سے بھی انکار ہے۔ اب اگر کسی مصری شیخ سے یہ کہا جائے تو وہ ناراض

ہوگا۔ اس جماعت کا خلوص قابل داد ہے لیکن انکی سادہ لوحی قابل افسوس ہے۔

میں۔ مشرق میں ہم سب کو تقریباً ایک ہی قسم کے مسائل درپیش ہیں۔ ان مسائل کے حل بھی بڑی حد تک یکساں ہونگے۔ ہندوستان کے مسلمان ترکی اور مصر کی ذہنی پیشقدمی اور معاشرتی ترقی دیکھ کر ممکن ہے جنبش میں آئیں۔ آپ کی پیش قدمیوں سے ہمارا تذبذب اور ڈر ذرا کم ہوگا۔ اچھا یہ فرمائیے، اس وقت کے مصری سیاسی حالات پر آپ کی کیا رائے ہے۔

موصوف۔ یہ ایک مستقل کشمکش ہے جسکا ختم ہونا نامعلوم ہے۔ لیکن مجھے نئی نسل سے بہت امیدیں ہیں۔ ہمارا مقابل بہت زبردست ہے اور بہت عاقل ہے۔ ہمارا اور اسکا مقابلہ کمزور اور زبردست کا مقابلہ ہے۔ ہم اپنی کمزوریاں دور کر رہے ہیں جب وہ دور ہوجائیں گی انگلستان کو مصر میں رہنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

میں۔ کیا آپ کے خیال میں خلافت کا نظام ممکن ہے؟

موصوف۔ خلافت کے متعلق تو میری رائے وہی ہے جس کا اظہار مصر کے وزیر تعلیمات نے ایک دفعہ اپنی تقریر میں کیا تھا۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ "خلافت مصر کے قدیم ستاروں کی طرح ہے کہ جان بوجھکر انکا توڑنا حماقت اور اگر ٹوٹ جائیں تو پھر بنانا! اس سے بڑھ کر حماقت"۔ ترکی نے غلطی کی کہ خلافت کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ ڈالا لیکن اب یہ کوشش کہ خلافت قائم کیجائے اس سے زیادہ بڑی غلطی ہوگی۔ اصل میں خلافت کا نظام سلطنت اگر اسے حقیقی معنی میں قرآنی تعلیم کے مطابق رکھا جائے تو موجودہ جمہوری اصول جہانداری کے خلاف ہے۔ جہانتک اسلامی ممالک میں آپس میں رشتہ قائم کرنے کا تعلق ہے اس کا زیادہ اور مفید طریقہ یہ ہے کہ مختلف اسلامی ممالک کے علمی ادارے ایک دوسرے سے تعلقات رکھیں تاکہ جو جو علمی و ذہنی ترقیاں ایک جگہ ہوں ان سے دوسرے بھی واقف اور مستفید ہوسکیں سیاسی حیثیت سے خلافت کا قیام اسلامی ممالک کے لئے محض بیکار ہے۔

غرضکہ اس دلچسپ مقالات میں تقریباً دو گھنٹے گفتگو ہوئی۔ میرے ساتھ جعفری صاحب تھے۔ یہ ہمارے

فرانسیسی مطلق نہیں سمجھتے تھے۔ عربی تھوڑی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ گفتگو کا مفہوم میں انہیں اردو میں سمجھا دیتا تھا یا طہٰ حسین صاحب خود عربی میں انہیں سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ پروفیسر طہٰ حسین صاحب کی بیوی ایک فرانسیسی خاتون ہیں۔ چونکہ موصوف نابینا ہیں اس لئے یہی ہر جگہ انکی رہبری کرتی ہیں۔ لوگوں سے ملاتی ہیں اور لکھنے پڑھنے کا کام بھی سارا یہی کرتی ہیں۔ ایک بچی بھی ہے جو عربی اور فرانسیسی دونوں بولتی ہے۔ میاں بیوی دونوں نہایت خلیق اور ملنسار ہیں۔ طہٰ حسین صاحب کی گفتگو میں ایک خاص قسم کی نرمی اور خاکساری ہے جس سے ہر شخص پر عجیب اثر پڑتا ہے۔ اس کے بعد اُن سے کانگریس کے اجلاسوں میں روزانہ ملاقات ہوتی رہی اور ہندوستان کے متعلق اکثر گفتگو رہتی تھی۔ موصوف کو ٹیگور سے بہت دلچسپی ہے۔

✢

اس اجلاس کی اختتامی رسم ایک دعوت تھی۔ اس دعوت کے بعد پروفیسر بکیؔر نے جرمن گورنمنٹ کی طرف سے انگلستان کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے تقریر کچھ دیر جرمن میں اور پھر انگریزی میں کی۔ موصوف نے فرمایا کہ جب تک مشرق و مغرب ایک دوسرے کو اچھی طرح نہ سمجھیں اُس وقت تک انسانیت کی ترقی کی بنیادیں مضبوط نہیں کی جا سکتیں موسیو کولاںؔ نے فرانسیسی گورنمنٹ اور مسٹر برسٹڈؔ نے ممالک متحدہ امریکہ کی گورنمنٹ کیطرف سے شکریے ادا کئے۔

✢

میں روز اپنے فرانسیسی پروفیسروں کو کہتے سنتا تھا کہ دیکھو آج میں فلاں سے اٹھارہ برس کے بعد اور فلاں سے ۲۰ برس کے بعد ملا۔ لڑائی کے بعد یہ اپنی قسم کا پہلا اجتماع تھا جہاں یورپ و امریکہ کے محقق اکٹھا ہوئے اور اپنی پرانی بھولی بسری ملاقاتوں کو تازہ کیا۔ ہم لوگ ذرا مشکل ہی سے اس بات کا اندازہ کرتے ہیں کہ یورپ کی زندگی کے توازن کو جنگ نے کس بری طرح بگاڑا ہے کہ آج تک اس کے پیر لڑکھڑاتے ہیں۔

مثنوی

(یہ مثنوی ہمارے محترم استاذ جناب مولنا سید شرف الدین صاحب نے ۵ ر نومبر ۲۵ء کو جامعہ کے یوم تاسیس کے جلسہ میں پڑھی تھی ۔ مولنا کا خیال اردو میں ایک ترکیب بند کہنے کا تھا لیکن چند طلبہ اور اساتذہ کے اس اصرار پر کہ کچھ فارسی میں ہونا چاہیئے یہ مثنوی لکھی گئی اور بہت مقبول ہوئی ۔)

بیا ساقیا بادۂ ناب دہ
اگر بادہ نتوانی زہر آب دہ
چہ زہر آب ؟ کاں تلخی افزایدم
چہ تلخی ؟ کہ در کام خوش آیدم
چہ تلخی ؟ کہ جاں در خروش آردم
ز بے ہوشیِ غم بہ ہوش آردم
بسا نوش کاں ہوش را در ربود
بسا نیش کاں ہوش را در فزود
بداں نوش کاں ہوش بر بادت
خوش آں نیش کاں دانش افزایدت
بد آں مایہ شادی کہ رنج آردت
خوش آں مایہ رنجے کہ گنج آردت
چناں گنج را کس خریدار نیست
کہ جز مایۂ رنج و آزار نیست
بجاں شو خریدار آں رنج را
کہ باشد کلید آں دو صد گنج را
نیاگانِ ما کز جہاں آفریں
شب و روز بر جانِ شاں آفریں
ز آسودگی روئے بر تافتند
پس از رنجہا گنجہا یافتند
بسے رنج بردند بر روئے خاک
بداوند در رنج خوش جانِ پاک
چہ غم کارِ ما شد گر امروز پست
بہ نیروئے یزداں کشائیم دست
کمر بر کمرگاہ بندیم چست
بسازیم یک یک شکستے درست
شد از پیش ما آں مسیحا نفس
کہ بودے بہ ہر رنج فریاد رس

به هر دردِ ما چاره ساختے
به تدبیرِ درماں بپرداختے
نه بینیم او را دریں انجمن
دریغا نه دید او بهارِ چمن
دریغا چمن را نیامد بهار
که ناگه سر آمد بر او روزگار
ولے پاک شوئیم، دل را ز غم
نباید که باشیم زیں ساں دژم
نباشیم زاندوه بر خاک پست
سوئے پاک یزداں برآریم دست
که اے داورِ دوراں مہر کن
برآریم ایں کوهِ غم را ز بُن
تو یاری ده و کار آساں بکن
که ایں اندوه ما برآرید ز بن
ز هر بیم و اندیشه آزاده ایم
که بر خاک راهِ تو افتاده ایم
ز گیتی بریدیم یکسر امید ئو
ز مهرِ تو جوئیم هر دم نوید
یکا یک به هر کار یار خود یم
هماں در تگاپوئے کارِ خود یم
کنوں ورز میں پائے افشاردیم
همه رنج را شادی انگاردیم
همه ناگواره گواره کنیم
هنر در جہاں آشکاره کنیم
که این ست نیروئے افتادگاں
ز بند زر و ناں آزادگاں
فشاندیم یک یک بپائے تو جاں
تو اے جامعه شادماں زنده ماں
نه مردی تو هم اے مسیحا نفس
که ایں جامعه زنده دارِ تو بس
به گیتی تو همواره پایندهٔ
تو مرده زندهٔ زندهٔ

ماموں جان

(گذشتہ سے پیوستہ)

تیسرا ایکٹ

سربریاکف کے مکان میں ڈرائنگ روم تین دروازے: داہنی جانب، بائیں جانب اور بیچ میں

دن کا وقت

وائنٹسکی اور سونیا بیٹھے ہیں اور یلینا اینڈریونا کسی خیال میں محو ٹہل رہی ہے۔

وائنٹسکی۔ پروفیسر صاحب نے کشادہ دلی سے خواہش ظاہر کی ہے کہ ہم سب اس کمرے میں آج ایک بجے جمع ہوں (اپنی گھڑی دیکھتا ہے) پندرہ منٹ باقی ہیں۔ وہ دنیا کو کوئی پیام پہنچانا چاہتے ہیں۔

یلینا۔ غالباً کچھ کاروبار کی نسبت کہیں گے۔

وائنٹسکی۔ کاروبار سے انہیں کوئی نسبت نہیں۔ سوائے مہملات لکھنے یا بڑبڑانے اور حسد کرنے کے انہیں کسی کام سے نسبت نہیں۔

سونیا۔ (عاجزی کے ساتھ) ماموں جان، پھر وہی!

وائنٹسکی۔ اچھا، اچھا، مجھے معاف کرو سونیا۔ توبہ۔ (یلینا اینڈریونا کی طرف اشارہ کرکے) انہیں دیکھتی ہو۔ کاہلی اور بے کاری نے انہیں ایسا کمزور کر دیا ہے کہ چلنے میں انکے قدم ڈگمگاتے ہیں۔ میری حسین، میری نازک عورت!

یلینا۔ تم دن بھر بک بک کرتے ہو۔ تم تھکتے نہیں؟ (غمزدہ ہو کر) ناک میں دم ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔

سونیا۔ (کاندھے ہلا کر) کرنے کو تمام کام ہے۔ کوئی کام کرنے پر آئے تو [illegible] کام ہے۔

ملینا۔ مثلاً ؟۔

سونیا۔ تم زمین کے کام میں ہمیں مدد دے سکتی ہو۔ یہ نہیں تو بچوں کی تعلیم، مریضوں کی تیمارداری بیسیوں کام ہیں جب ابا نہیں آئے تھے اور تم یہاں نہیں تھیں تو میں اور ماموں جان خود بازار جاتے تھے اور آٹا فروخت کرتے تھے۔

ملینا۔ مجھے یہ کام نہیں آتے۔ نہ یہ دلچسپ کام ہے۔ صرف ناولوں میں وہ بھی ایک خاص مقصد کی غرض سے لوگ بچوں کو پڑھاتے یا کسانوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ میں ناتجربہ کار کیسے ایکدم انہیں پڑھانے لگوں یا تیمارداری کروں ؟

سونیا۔ میں نہیں سمجھتی کوئی کیسے ان کاموں سے احتراز کر سکتا ہے۔ کچھ دن ٹھہرو تمہیں خود بہ خود یہ کام آجائیں گے۔ (اُس کی کمر میں ہاتھ ڈالتی ہے) بے دل کیوں ہوتی ہو (ہنستی ہے) جی کڑھانے سے فائدہ ؟ تمہاری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرو اور تم بیکاری اور پریشانی کے شکار ہو۔ ماموں جان کو دیکھو۔ انہیں کوئی کام نہیں بس تمہارے پیچھے سایہ کی طرح رہتے ہیں۔ میں اپنا کام چھوڑ کر تم سے باتیں کرنے دوڑ آئی ہوں۔ میں کاہل ہوگئی ہوں۔ کیا کیا جائے۔ ڈاکٹر میخائل استروف ہمیں دیکھنے کبھی کبھی آتے تھے، مہینہ میں ایک بار وہ بڑی مشکل سے یہاں آنے کو راضی ہوئے تھے اور اب جب دیکھو وہ آجاتے ہیں۔ وہ اپنے جنگل کا کام بھول گئے اور مریضوں کو انہوں نے تج دیا۔ بڑی ساحرہ ہو۔

وائنٹسکی۔ بے دل کیوں ہوتی ہو ؟ کیوں صدمے اٹھاتی ہو ؟ (جوش میں) آؤ ! میری جان میری پیاری ہوش میں آؤ ! تمہاری رگوں میں جوانی کا خون ہے۔ جوانی تمہارا حق ہے۔ زندگی میں ایک دفعہ تمام بندشوں کو توڑ دو ! جلدی کرو اور بے تابانہ کسی آبی روح سے محبت کرنے لگو۔ زلال جیسی پاک و صاف روح کے ساتھ تعلق پیدا کرلو۔ محبت کے آبنائے میں غوطہ لگاؤ اور تمہارا بڈھا پروفیسر اور ہم سب تمہیں دیکھیں اور حیرت کریں۔

ملینا۔ (خفگی سے) خدا کے لئے بس کرو ! مجھ پر رحم کرو ! (باہر جانے کو ہوتی ہے)

وائنٹسکی۔ (اُسے روکتا ہے) اچھا اچھا مجھے معاف کرو۔ توبہ . . . . . میں تمہارے ہاتھ جوڑتا ہوں (اس کے

ہاتھ چومتا ہے) صلح! صلح!

یلینا۔ تم فرشتوں کا تحمل توڑ سکتے ہو۔

واینتشکی۔ صلح کی یاد میں تمہارے لئے ایک گلاب کی ڈالی لاتا ہوں؛ میں نے آج صبح یہ پھول تمہارے لئے جمع کئے تھے۔ خزاں کے گلاب۔ خوبصورت، غم انگیز گلاب۔ ۔ ۔ ۔ (باہر جاتا ہے)

سونیا۔ خزاں کے گلاب۔ خوبصورت، غم انگیز گلاب۔ ۔ ۔ ۔ (دونوں کھڑکی کے باہر جھانکتی ہیں)

یلینا۔ بالکل ستمبر کا موسم ہے۔ یہاں جاڑے کیسے گذار سکوں گی؟ (ایک وقفہ) ڈاکٹر کہاں ہے؟

سونیا۔ ماموں جان کے کمرے میں۔ وہ کچھ لکھ رہے ہیں۔ میں خوش ہوں کہ ماموں جان گئے۔ میں تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔

یلینا۔ کاہے کی بات؟

سونیا۔ کاہے کی بات! (اپنا سر یلینا کے سینہ پر رکھ دیتی ہے)

یلینا۔ کیا؟ کیا؟ صوفی پیاری کوئی بات؟ (اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہے)

سونیا۔ میں حسین نہیں ہوں۔

یلینا۔ تمہارے بال خوبصورت ہیں۔

سونیا۔ نہیں! (گھومتی ہے تاکہ اپنے کو آئینہ میں دیکھے) نہیں! جب کوئی عورت سادہ ہوتی ہے تو ہمیشہ اُس سے یہی کہتے ہیں "تمہاری آنکھیں خوبصورت ہیں، تمہارے بال خوب ہیں"۔ ۔ ۔ ۔ چھ سال سے میں اُس پر جان دیتی ہوں۔ اپنی ماں سے زیادہ اُسے چاہتی ہوں۔ ہر لمحہ اُس کے وجود سے باخبر رہتی ہوں میں اُسکے ہاتھ کی آہٹ کو پہچانتی ہوں اور دروازہ تکتی ہوں۔ میں انتظار کرتی ہوں۔ ہر لمحہ خیال کرتی ہوں اب آیا۔ اب آیا! سمجھتی ہو؟ یلینا میں تم سے بتاتی ہوں میں تمہارے پاس اُس کی ہی باتیں کرنے آتی ہوں، اب وہ روز یہاں رہتا ہے لیکن مجھ پر نظر بھی نہیں ڈالتا۔ مجھے نہیں دیکھتا۔ ۔ ۔ کیسا ظلم ہے! مجھے مطلق امید نہیں۔ کوئی امید نہیں، کوئی نہیں! (مایوسانہ) ارے اللہ مجھے موت دے۔ میں رات رات بھر دعائیں مانگتی ہوں۔ ۔ ۔ ۔ اکثر اُس کے پاس جاتی ہوں۔ اُس سے بات کرنا شروع کرتی ہوں، اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتی ہوں۔

تمام افتخار جاتا رہا میری قوت ختم ہوگئی۔ مجھے خود پر قابو نہیں ہے۔ میں ضبط نہ کرسکی، اور میں نے کل ماسوں جان سے کہدیا کہ اُسے چاہتی ہوں۔ . . . اور سب نوکروں کو خبر ہوگئی ہے کہ میری اس پر جان جاتی ہے۔ ہر شخص اُسے جانتا ہے۔

یلنا۔ اور وہ ؟

سونیا۔ نہیں۔ وہ مجھے خاطر میں نہیں لاتا۔

یلنا۔ (غور کرتے ہوئے) وہ عجیب آدمی ہے . . . سمجھتی ہو کیا؟ میں اس سے بات کروں گی . . . . . میں سلیقہ اور طریقے سے اس معاملہ کو چھیڑوں گی . . . اشاروں میں اسے سمجھاؤں گی . . (ایک وقفہ) ہاں، واقعی۔ کب تک آخر تم بیچاری اس تذبذب میں رہو گی؟ میں جاؤں؟

(سونیا اپنا سر ہلاکر اپنی رضامندی ظاہر کرتی ہے)

یلنا۔ ٹھیک، یہ معلوم کرلینا مشکل نہیں کہ وہ تمہیں چاہتا ہے یا نہیں، میری جان آزردہ نہ ہو پریشان نہ ہو۔ میں اُس سے ایسے سلیقہ سے بات کروں گی کہ اُسے خیال بھی نہ ہوگا۔ ہمیں جو کچھ معلوم کرنا ہے وہ یہ ہے کہ ہاں یا نہیں۔ (ایک وقفہ) اگر نہیں تو بہتر ہے کہ وہ یہاں آنا ترک کردے، ایں؟

(سونیا رضامندی کے طور پر سر ہلاتی ہے)

یلنا۔ صبر اور برداشت اُس وقت آسان ہے جب کوئی معشوق کو نہ دیکھے۔ دیر نہ کرنا چاہئے۔ فوراً دریافت کرنا چاہئے۔ وہ مجھے کچھ نقشے دکھانے کو کہتے تھے۔ جاؤ اُن سے کہو میں اُن سے ملنے آتی ہوں۔

سونیا۔ (کشمکش اور اضطراب میں) مجھ سے سب حال سچ سچ بتادو گی؟

یلنا۔ کیوں نہیں میرے نزدیک، حقیقت، خواہ وہ کیسی ہی زہرآلود اور مہلک کیوں نہ ہو۔ اتنی خوفناک اور مضر نہیں جیسا تذبذب۔ میری جان مجھ پر اعتبار کرو۔

سونیا۔ بیشک، بیشک! میں اُس سے جاکے کہتی ہوں تم اُس کے نقشے دیکھنا چاہتی ہو (جاتی ہے مگر دروازہ پر رکتی ہے) نہیں تذبذب اچھا ہے . . . اس میں کم از کم آس تو ہے . . .

یلنا۔ کیا کہا۔

سونیا۔ کچھ نہیں۔ (جاتی ہے)

یلنا۔ کسی کے راز سے باخبر ہو جانا اور اُس کے لئے کچھ نہ کر سکنا اس سے زیادہ قابلِ افسوس کوئی بات نہیں۔ (سوچتے ہوئے) وہ اسے نہیں چاہتا۔ یہ ظاہر ہے لیکن وہ اس سے کیوں شادی نہیں کر لیتا۔ وہ خوبصورت نہیں ہے لیکن ڈاکٹر جیسے شخص کی عمر کیلئے وہ بہترین بیوی ہوگی کیسی سمجھدار کیسی نیک اور بھولی ۔ ۔ ۔ ۔ (ایک وقفہ) بیچاری کی تکلیف کا میں اندازہ کر سکتی ہوں، شروع سے آخر تک ایک ناقابلِ قیاس بے تکے پن میں زندگی گذارنا جس میں کوئی روشن پہلو نہیں، انسانوں کے بجائے صرف خشک اور مردہ سایوں، بے روح گوشت اور ہڈی کے ڈھانچوں کے درمیان جن کی گفتگو بھدی ہے اور جو گنوار ہیں، اُن لوگوں کے درمیان جو سور کھانے اور سونے کے سوا کچھ نہیں جانتے وہ، فیا الکزنڈریونا بیچاری افق پر کبھی کبھی ان سب سے مختلف ان سب سے خوبصورت، دلچسپ، دلربا، اس چاند کے مشابہ نظر آتی ہے جو تاریکی میں یکدم نکل آئے۔ ۔ ۔ ایسے آدمی کے سحر سے مغلوب ہونا ۔ ۔ ۔ اپنی ہستی اس پر وارنا ۔ ۔ ۔ میں یقین کرتی ہوں کہ میں خود اس سے متاثر ہوں۔ ہاں جب وہ نہیں آتا تو میرا دل بیٹھنے لگتا ہے اور میں اس وقت بھی اُس کے خیال سے مسرور ہو رہی ہوں ۔ ۔ ۔ وہ ماموں جان کہتا ہے کہ میری رگوں میں جوانی کا خون ہے، زندگی میں ایک دفعہ تمام بندشوں کو توڑ دو، بے شک۔ شاید یہی مجھے کرنا چاہئے ۔ ۔ ۔ اے کاش، اے کاش میں تم لوگوں کے پاس سے بھاگ جا سکتی، آزاد و مسرور چڑیا کی طرح اڑ سکتی، اے لوگو، تم سب کے پاس سے، تم سب کے سوئے ہوئے چہروں سے، تم سب کی بے معنی گفتگو سے آزاد ہو سکتی، تم سب کو بھلا سکتی ۔ ۔ ۔ لیکن میں بزدل ہوں ۔ ۔ ۔ میرا ضمیر مر گیا ہے، میرا ضمیر مجھے تکلیف دیتا ہے ۔ ۔ ۔ وہ یہاں روز آتا ہے۔ میں سب جانتی ہوں وہ یہاں کس کے پاس آتا ہے۔ ایک مجرم، مجرم احساس پہلے ہی سے میرے دل میں موجود ہے۔ میں سونیا کے قدموں پر گرنے کو تیار ہوں۔ اُس سے معافی مانگنے کے لئے، رونے کے لئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

استروف۔ (ایک نقشہ لئے داخل ہوتا ہے) تسلیم! (اُس سے ہاتھ ملاتا ہے) آپ میرا دستی کام دیکھنا چاہتی تھیں۔

یلنا۔ آپ نے کل مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ مجھے دکھائیں گے . . . . اس وقت آپ کو فرصت ہی؟

استروف۔ ہاں ہاں کیوں نہیں (تاش کی میز پر نقشہ کھول کر پھیلاتا ہے اور ڈرائنگ کی کیلوں سے اُسے تختے پر گاڑتا ہے) کہاں پیدا ہوئی تھیں آپ؟

یلنا۔ پیٹرس برگ میں۔

استروف۔ اور تعلیم کہاں حاصل کی؟

یلنا۔ مدرسہ موسیقی میں۔

استروف۔ میں جانتا ہوں آپ کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں۔

یلنا۔ کیوں نہیں؟ یہ سچ ہے کہ میں دیہات اور گاؤں وغیرہ سے واقف نہیں لیکن میں نے پڑھا بہت کافی ہی

استروف۔ میری اپنی میز یہاں ہے، اس گھر میں . . . . آئوان پٹروویچ کے کمرے میں جب میں کام سے تھک جاتا ہوں یا پریشان یا اداس ہوتا ہوں میں سب کام چھوڑ کر یہاں آتا ہوں اور گھنٹہ دو گھنٹہ تک اس سے جی بہلاتا ہوں . . . . آئوان پٹروویچ اور صوفیا الکزنڈریونا اپنی تسبیحوں کے دانے کھٹکاتی ہیں اور میں اُن کے پاس بیٹھتا ہوں اور اپنے نقشہ میں رنگ بھرتا ہوں ــــ اور مجھے سرور اور آرام محسوس ہوتا ہے اور جھینگر چرچر کرتا ہے۔ لیکن اس قسم کی عیاشی میں بہت نہیں کرتا۔ صرف مہینہ میں ایک بار . . . (نقشہ کو دکھلاکے) اب اسے دیکھو! یہ ہمارے ضلع کا اب سے پچاس برس پہلے کا نقشہ ہے۔ سیاہ اور ہلکا سبز رنگ جنگلوں کو ظاہر کرتا ہے، آدھا رقبہ جنگلوں سے بھرا ہوا تھا۔ سبز رنگ پر جہاں سُرخ رنگ کی دھاریاں ہیں یہاں بارہ سنگھے اور جنگلی بکرے بکثرت پائے جاتے تھے۔ میں نے نباتات اور حیوانات ساتھ ساتھ دکھائے ہیں۔ اس جھیل کے کنارے ہنس، بطخ اور مرغابیاں پائی جاتی تھیں اور پرانے لوگ کہتے ہیں کہ یہاں ہر طرح کی چڑیوں کی "ایک سلطنت" تھی ان کا کوئی شمار نہیں تھا۔ انکے غول کے غول اُڑتے تھے۔ گاؤں اور دیہاتوں کے آس پاس تم دیکھتی ہو ادھر اُدھر ہر طرح کی آبادیاں ہیں۔ پرانی خانقاہیں، ہوائی تیلی گھر اور دوسرے کارخانے . . . . یہاں سینگ والے جانور اور گھوڑے بکثرت تھے۔ انہیں نیلے رنگ سے دکھایا ہے۔ مثلاً یہاں دیکھو نیلا رنگ گہرا دکھایا ہے یہاں گھوڑوں

کے مستقل گلے تھے اور ہر گھر میں کم از کم تین گھوڑوں کا اوسط تھا۔ (ایک وقفہ) اچھا ذرا نیچے دیکھو۔ یہ پچیس برس پہلے کی تصویر ہے۔ تم نے دیکھا اب صرف ایک تہائی رقبہ میں جنگل ہیں۔ بکرے اب یہاں نہیں رہے مگر بارہ سنگھے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب تیسرے حصہ کو دیکھو۔ یہ اس ضلع کی موجودہ حالت ہے۔ کہیں کہیں ہرا ہے وہ بھی ذرا ذرا سے دھبے کی شکل میں۔ تمام بارہ سنگھے غائب ہو گئے اور ہنس بھی۔ ۔ ۔ ۔ پرانی آبادیات، خانقاہوں اور کارخانوں میں سے کسی کا نشان نہیں رہا۔ اصل میں یہ اُس تدریجی ابتری کا نقشہ ہے جو ہمارے ضلع میں دس پندرہ برس کے اندر تکمیل کو پہنچ جائے گی۔ تم کہو گی یہ تہذیب کا اثر ہے کہ۔ پرانی زندگی خود بخود نئی زندگی سے بدل جاتی ہے۔ بیشک۔ میں اسے سمجھتا ہوں اگر ان تباہ شدہ جنگلوں کی جگہ شاہراہیں یا ریلیں ہوتیں، اگر کارخانے، اسکول اور دوسرے تجارتی سامان ہوتے تو دہقان زیادہ تندرست، زیادہ ذہین اور زیادہ فارغ البال ہوتے لیکن تم دیکھتی ہو۔ یہاں اس قسم کی چیزوں میں سے کوئی چیز نہیں۔ آج تک دلدلیں اور مچھر باقی ہیں، وہی راستوں کی کمی، مفلسی، ناداری، میعادی فصلی بخار اور ضلع میں آگ لگنا ۔ ۔ ۔ یہ ابتری ہماری معمولی سے زیادہ سخت کشمکش حیات کا نتیجہ ہے یہ ابتری جہالت، بے علمی اور رواداری کے فقدان کے باعث ہے۔ اس وجہ سے ہے کہ بے بس بھوکا اور بیمار انسان اپنی بقیہ زندگی کے تحفظ اور بقا کے لئے، اپنے بچوں کی زندگی برقرار رکھنے کے لئے غیر محسوس طور پر اُس چیز پر جو اُس کی بھوک کو مار سکے ہاتھ ڈالتا ہے اور بغیر اندیشۂ فردا اُسے مسمار کرکے تباہ کرتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ اب تو قریب قریب ہر چیز مسمار ہو چکی لیکن اس کی جگہ پر کرنے کے لئے اب تک کوئی چیز پیدا نہیں کی گئی۔ (سرد مہری سے) تمہارے چہرہ سے ہویدا ہے کہ تمہیں میری باتوں میں دلکشی نہیں معلوم ہوتی۔

یلنا۔ لیکن یہ سب میری سمجھ سے باہر ہو تو ۔ ۔ ۔ ۔

استروف۔ اس میں سمجھ سے باہر بات ہی کیا ہے۔ تمہارا جی ہی نہیں لگتا۔

یلنا۔ صاف بات یہ ہے کہ میں کچھ اور سوچ رہی ہوں۔ معاف کرنا میں ذرا سا امتحان لینا چاہتی ہوں مگر بڑی مشکل ہے کہ سوال کیسے شروع کردوں۔

استروف۔ امتحان؟

یلنا۔ ہاں ایک امتحان . . . لیکن کوئی بڑا مشکل امتحان نہیں۔ تشریف رکھئے (دونوں بیٹھ جاتے ہیں) ایک نوجوان خاتون کی بات ہے۔ اس وقت بالکل صاف صاف بے لاگ گفتگو کروں گی، نہ کوئی تکلف نہ کوئی حجاب، کہوں؟

استروف۔ ہاں

یلنا۔ میری سوتیلی لڑکی کی بات ہے۔ اُسے پسند کرتے ہو؟ کیوں؟

استروف۔ ہاں اس کی بڑی عزت کرتا ہوں۔

یلنا۔ بہ حیثیت ایک عورت کے تمہیں اس میں کوئی دلکشی نظر آتی ہے؟

استروف۔ (ایک وقفہ کے بعد) نہیں۔

یلنا۔ ایک بات اور، تم نے کچھ محسوس نہیں کیا؟

استروف۔ کچھ نہیں۔

یلنا۔ (اُسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر) تمہیں اُس سے محبت نہیں . . . تمہاری آنکھیں کہہ رہی ہیں . . . وہ خوش نہیں ہے . . . سمجھتے ہو . . . تم یہاں آنا ترک کردو۔

استروف۔ (اُٹھ بیٹھتا ہے) میرے دن گذر گئے۔ علاوہ اس کے مجھے اس سے زیادہ ضروری کام کرنے ہیں (اپنے کاندھے ہلاتا ہے) ان چیزوں کے لئے کہاں سے وقت لاؤں؟ (گھبرا جاتا ہے)

یلنا۔ بس بس! کیسی ناخوشگوار، کیسی دل خراش گفتگو ہے! میں یوں کانپ رہی ہوں گویا میرے کاندھوں پر دس من بوجھ ہو۔ خیر . . . اللہ تیرا شکر ہے، اب کچھ نہیں ہے ہمیں اسے بھول جانا چاہئے۔ سمجھو اس وقت کوئی بات نہیں ہوئی . . . مگر یہاں سے چلے جاؤ۔ تم سمجھدار آدمی ہو . . . تم سب سمجھتے ہو۔ (ایک وقفہ) مجھے حرارت ہے۔

استروف۔ اگر تم نے ایک دو ماہ قبل کہا ہوتا تو، شاید، میں نے اس پر غور کیا ہوتا، لیکن اب . . . (اپنے کاندھے ہلاتا ہے) اور اگر وہ پریشان ہے تو بے شک . . . مگر ایک بات ہے جو میری سمجھ میں نہیں آتی۔ آخر

تمہیں ہمیں دخل دینے کی کیا پڑی تھی؟ (اُسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہے اور اس پر انگلی اُٹھاتا ہے) شریر عورت! چلتی ہوئی بنی ہوئی عورت!

یلنا۔ کیا مطلب؟

استروف۔ (ہنستا ہے) شریر عورت! مانتا ہوں، سونیا خوش نہیں ہے اور رنجیدہ ہے۔ درست ہے۔ مگر تمہیں اس میں دلچسپی کی کیا وجہ؟ (اُسے بات نہیں کرنے دیتا اور جوش سے) براہ مہربانی متحیر ظاہر ہونے کی کوشش نہ کیجئے۔ تم خوب سمجھتی ہو روز یہاں کس کے لئے آتا ہوں.... بتاؤ کس کے لئے؟ بولو.... تم سب جانتی ہو۔ اے خوبصورت شکاری، اے حسین صیاد، مجھے یوں نہ ستاؤ، مجھ پر یوں نظر نہ ڈال میں ایک صید ضعیف ہوں۔.....

یلنا۔ (گھبرا جاتی ہے) حسین صیاد! میں سمجھی نہیں۔

استروف۔ اے خوبصورت بازوؤں والی چکنی مچھلی!.... تمہیں شکار ضرور ملنا چاہئے! اس مہینہ بھر میں یہاں کچھ نہ کر سکا۔ میں سب کچھ بھول گیا۔ میں تمہاری تلاش میں، تمہارے حصول میں سرگرداں وسرگرم ہوں۔ اور تم اس سے خوب لطف اٹھاتی ہو، خوب.... اچھا، میں ہارا، تم اس امتحان سے پہلے ہی یہ جانتی تھیں۔ (اپنے ہاتھ جوڑ کر اور اپنا سر جھکا کر) میں سر تسلیم خم کرتا ہوں، آؤ اور مجھے نگل جاؤ!

یلنا۔ تم دیوانے ہو!

استروف۔ (اپنے دانت بند کرکے ہنستا ہے) ارے۔ پُرفریب عورت....

یلنا۔ سچ کہتی ہوں میں اتنی خراب اور کمینی نہیں ہوں جتنا تم سمجھتے ہو! میں قسم کھاتی ہوں کہ میں نہیں ہوں! (باہر جانے کی کوشش کرتی ہے)

استروف۔ (راستہ روک کر) میں آج جا رہا ہوں۔ میں یہاں پھر نہیں آؤں گا، لیکن.... (اُس کا ہاتھ لیتا ہے اور ادھر اُدھر دیکھتا ہے) ہماری ملاقات کہاں ہوگی؟ جلدی بولو، کہاں؟ کوئی آ نہ جائے جلد کہو.... (جوش میں) کیسی خوبصورت ہو، کتنی حسین ہو! ایک بوسہ.... بس میں تمہارے ان شان دانسوں کی چمک والے بالوں کا بوسہ لے سکتا....

یلنا۔ میں یقین دلاتی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔

استروف۔ (اُسے بولنے سے روکتے ہوئے) یقین کیوں دلاتی ہو؟ کوئی ضرورت نہیں۔ بیجا اور غیر ضروری الفاظ کی ضرورت نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ اُف تم کیسی خوبصورت ہو! تمہارے ہاتھ کتنے گورے ہیں! (اُس کے ہاتھ چومتا ہے)

یلنا۔ بس بس ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے چھوڑ دو ۔ ۔ ۔ ۔ (اپنے ہاتھ چھڑا لیتی ہے) تم اپنے کو بھولے جا رہے ہو۔

استروف۔ کہو، کہو! ہم کل کس مقام پر ملیں گے؟ (اپنے ہاتھ اس کی کمر میں ڈالتا ہے) تم دیکھتی ہو یہ ناگزیر ہے؛ ملاقات ضرور ہوگی (اُسے چومتا ہے، اسی وقت وائنٹسکی گلاب کا ایک گچھا لیے ہوئے آتا ہے اور خاموشی سے دروازے پر رک جاتا ہے)

یلنا۔ (وائنٹسکی کو نہ دیکھکر) مجھے چھوڑ دو ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے جانے دو ۔ ۔ ۔ ۔ (اپنا سر استروف کے سینہ پر رکھ دیتی ہے) نہیں! (باہر نکل جانے کی کوشش کرتی ہے)

استروف۔ (اُسے کمر سے پکڑ کر) کل جنگلات کے علاقہ میں آنا ۔ ۔ ۔ ۔ دو بجے ۔ ۔ ۔ کیوں؟ کیوں؟ آؤ گی نہ؟

یلنا۔ (وائنٹسکی کو دیکھ کر) مجھے جانے دو، (بے حد تنگ آ کر بدحواس ہو جاتی ہے اور کھڑکی کے پاس جاتی ہے) یہ بھی کوئی بات ہے! واہ

وائنٹسکی۔ (گلاب ایک کرسی پر رکھ دیتا ہے۔ گھبراہٹ میں اپنا چہرہ اور اپنی گردن رومال سے پونچھتا ہے) کچھ حرج نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ کوئی ۔ ۔ ۔ ۔ کوئی حرج نہیں ۔ ۔ ۔ ۔

استروف۔ (بات کو ٹالتے ہوئے) جناب والا آج تو موسم برا نہیں ہے۔ صبح بادل گھرے ہوئے تھے اور خیال تھا بارش ہوگی، مگر اب دھوپ نکل آئی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اب کے خزاں کا موسم بہت خوشگوار ہے۔ ۔ ۔ ۔ اور جاڑوں کی فصل نہایت امید افزا (نقشہ تہ کرتا ہے) صرف دن چھوٹے ہوتے جا رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ (باہر جاتا ہے)

یلنا۔ (جلدی سے وائنٹسکی کے پاس جاتی ہے) کوشش کرو۔ اپنی امکانی کوشش کرو کہ میں اور میرا

شوہر آج یہاں سے چلے جائیں! سنتے ہو؟ آج ہی!

وائنٹسکی (اپنا چہرہ پونچھتا ہے) کیا؟ ہاں ہاں . . . بہت خوب . . . میں نے سب دیکھ لیا، ملنیا۔ سب . . . . . .

یلنیا۔ (مرعوب ہوکر) سنتے ہو؟ میں آج یہاں سے ضرور چلی جاؤں!

(سربریاکف، تلی گن اور مارینا داخل ہوتے ہیں)

تلی گن۔ حضور والا، میری طبیعت خود بخود کچھ گری سی جا رہی ہے۔ گذشتہ دو دن سے میرا جی الٹ رہا ہے میرا سر مجھے کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے . . . . . .

سربریاکف۔ اور سب لوگ کہاں ہیں؟ مجھے یہ مکان پسند نہیں بالکل آسیبی گھر معلوم ہوتا ہے ۲۶ بڑے بڑے کمرے، لوگ جس کا جدہر جی میں آتا ہے جاتے ہیں اور پکارتے پکارتے حیران ہو جاؤ کوئی بولتا ہی نہیں (گھنٹی بجاتا ہے) ماریا وسلیونا اور یلنیا اینڈریونا سے کہو یہاں آئیں۔

یلنیا۔ میں موجود ہوں

سربریاکف۔ دوستو میں التجا کرتا ہوں کہ بیٹھ جاؤ۔

سونیا۔ (یلنیا اینڈریونا کے پاس جاکر بے صبری سے) کیا کہا انہوں نے؟

یلنیا۔ سنو سنو۔

سونیا۔ تم کانپ رہی ہو! تم سرخ ہو رہی ہو! (اُس کے چہرہ کو تجسس نظروں سے دیکھ کر) میں سمجھتی ہوں . . . شاید ابا نے کہا کہ اب نہیں آئیں گے . . . کیوں؟ (ایک وقفہ) کہو، ہاں؟

(یلنیا اینڈریونا سر ہلاتی ہے)

سربریاکف۔ (تلی گن سے) آدمی بیمار رہ کر بھی کسی نہ کسی طرح رہ سکتا ہے لیکن اگر میں نہیں برداشت کر سکتا تو گاؤں میں رہنے کے طریقے کو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین سے اٹھا کے مجھے کسی دوسرے سیارہ میں پھینک دیا گیا ہے۔ بیٹھ جائیے، صاحبان میں کہتا ہوں تشریف رکھئے! سونیا! (سونیا اُسے نہیں سنتی ہے وہ اپنا سر جھکائے رنجیدہ کھڑی ہے) سونیا! (ایک وقفہ (وہ سنتی نہیں) (مارینا سے) تم بھی بیٹھ جاؤ،

انا جانی (انا بیٹھ جاتی ہے اور موزہ بنتی ہے) صاحبان میں عرض کرتا ہوں جیسی کہ مثل ہے اپنے کان توجہ کی کھونٹی پر کھڑے کر دیجئے (ہنستا ہے)

وائنشکی۔ (غصہ میں) شاید میری ضرورت نہیں ہے؟ میں جا سکتا ہوں؟

سریریاکف۔ نہیں تمہاری سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

وائنشکی۔ کس مقصد سے؟

سریریاکف۔ مقصد . . . تم خفا کیوں ہو؟ (ایک وقفہ) اگر مجھ سے کوئی قصور ہوا تو براہ کرم معاف کیجئے۔

وائنشکی۔ یہ لہجہ چھوڑئے۔ ہمیں اصل کام سے غرض ہے۔ میرے ٹہرانے کی کیا وجہ ہے؟

(ماریا واسیلیوونا داخل ہوتی ہے)

سریریاکف۔ یہ لو اماں بھی آگئیں۔ صاحبان میں شروع کرتا ہوں (ایک وقفہ) حضرات، میں نے آپ کو اسلئے جمع کیا ہے کہ میں اعلان کر دوں کہ جناب انسپکٹر جنرل یہاں تشریف لانے والے ہیں۔ خیر مذاق سے کیا فائدہ۔ ایک نہایت اہم بات ہے۔ میں نے آپ سب کو زحمت دی ہے تاکہ میں آپ سے مشورہ کر سکوں اور مجھے آپ سب کی عنایتوں سے امید ہے کہ آپ اس امداد سے دریغ نہ کریں گے۔ میں ایک جفاکش کتابی آدمی ہوں اور عملی زندگی اور واقعات کی دنیا سے مجھے کبھی سابقہ نہیں پڑا۔ میں ان لوگوں کی امداد کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا جو ان مسائل کو سمجھتے ہیں اور ان کا تجربہ رکھتے ہیں اور میں آئوان پیٹرووچ تم سے اور الیا ایلیچ تم سے اور اماں آپ سے درخواست کرتا ہوں . . . تو بات یہ ہے کہ کل من علیہا فان۔ یعنی ہم سب فانی ہیں۔ میں بڈھا اور بیمار ہوں اور اس لئے میں سمجھتا ہوں یہ وقت ہے کہ دنیا کے کم از کم وہ معاملات جو میرے خاندان سے متعلق ہیں طے کر دوں۔ میری زندگی ختم ہو چکی مجھے اپنا کچھ خیال نہیں ہے مگر میری جوان بیوی ہے اور ایک ناکتخدا لڑکی ہے (ایک وقفہ) میرے لئے یہ ناممکن ہے کہ گاؤں میں زندگی گذاروں۔ ہم گاؤں کی زندگی کے لئے نہیں بنے ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ شہر کی زندگی کے لئے اس تھوڑی سی جائداد کی آمدنی کافی نہیں۔ مثلاً اگر ہم جنگل فروخت کر ڈالیں تو یہ ایک مستثنیٰ امر ہے جسے ہر سال نہیں دہرایا جا سکتا۔ ہمیں ایسے ذرائع اور وسیلے تلاش کرنا چاہئیں جن سے کم و بیش مستقل آمدنی

کی صورت نکل آئے۔ میں نے ایک ایسی صورت سوچی ہے اور اسے آپ صاحبان کی خدمت میں پیش کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں۔ تفصیلات کو چھوڑ کر میں اسے اجمالی طور پر آپ سے بیان کرتا ہوں۔ ہماری جائداد کی آمدنی کا اوسط اصل روپیہ پر دو فیصدی سے زیادہ نہیں ہے میں اسے بیچنا چاہتا ہوں اگر ہم تمام روپیہ بنک میں جمع کر دیں تو ہمیں چار سے پانچ فیصدی تک منافع ہو سکتا ہے اور میرا خیال ہے کہ خرچ وغیرہ نکالنے کے بعد ہم اس سے کچھ کم ہزار روپیہ بچا بھی لیں گے جس سے ہم فن لینڈ میں ایک چھوٹا سا مکان خرید سکتے ہیں

وائنٹسکی۔ معاف کیجئے گا . . . . یقیناً میرے سننے میں غلطی ہوئی! پھر سے فرمایئے۔

سربریاکف۔ روپیہ بنک میں جمع کر دیں اور اس کے سود کی آمدنی کی بچت سے فن لینڈ میں ایک مکان خریدیں۔

وائنٹسکی۔ فن لینڈ نہیں، تم نے اور کچھ کہا تھا۔

سربریاکف۔ میں جائداد فروخت کرنا چاہتا ہوں

وائنٹسکی۔ کیوں نہیں۔ آپ جائداد فروخت کریں گے، کیا خوب خیال ہے . . . . اور یہاں ہمارے لئے اور اپنی بڈھی اماں کے لئے اور سونیا کے لئے کیا فکر کی ہے؟

سربریاکف۔ یہ سب ہم بعد میں طے کریں گے، ہم ہر چیز ایک ساتھ تو طے نہیں کر سکتے۔

وائنٹسکی۔ ایک منٹ ٹھہرو۔ یہ ظاہر ہے کہ اب تک میں بے وقوف ہی رہا۔ اب تک میں ہمیشہ یہی سمجھتا رہا کہ جائداد کی مالک سونیا ہے۔ میرے باپ نے یہ جائداد میری بہن کے جہیز کے لئے خریدی تھی۔ اب تک میں خاموش رہا میں نے ایک ترک کی طرح قانون میں معنی نہیں پہنائے بلکہ سوچتا رہا کہ میری بہن کی جائداد کی وارث اس کی بیٹی سونیا ہوگی۔

سربریاکف۔ بیشک جائداد کی وارث سونیا ہے۔ اس سے کون اختلاف کرتا ہے؟ سونیا کی مرضی کے بغیر جائداد فروخت کرنے کی میں جرأت نہیں کر سکتا۔ علاوہ اس کے یہ تو میں سونیا کے فائدہ ہی کے خیال سے کر رہا ہوں۔

وائنٹسکی۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی، سمجھ میں نہیں آتی! یا تو میرا دماغ بیکار ہو گیا ہے یا . . . . یا . . . . .

ماریا۔ الکزنڈر سے بحث نہ کرو۔ باور کرو وہ ہم سب سے زیادہ سمجھتا ہے کہ کس بات میں فائدہ ہے۔

وائنٹسکی۔ نہیں مجھے تھوڑا سا پانی دینا (پانی پیتا ہے) جو جی میں آئے کہو۔ جو جی میں آئے کہو!

سربریاکف۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تم اس قدر برافروختہ کیوں ہو۔ میں نہیں کہتا کہ میری تجویز بہترین ہے اگر تم سب کی رائے میں یہ ناموزوں ہے تو میں اصرار نہیں کرتا۔

(ایک وقفہ)

تلی گن۔ (بدحواسی میں) حضور والا علم بڑی چیز ہے۔ میں علم کو صرف عزت ہی کی نظر سے نہیں دیکھتا بلکہ میں اسے ایک اپنی ذاتی وراثتی چیز سمجھتا ہوں۔ میرے بھائی گریگوری ایلیچ کی بیوی کا بھائی۔ شاید حضور والا جانتے ہوں گے؛ کنستنتن ٹرد فی مچ لیکڈمینوف ایم اے تھا . . . . .

وائنٹسکی۔ چپ رہو مفت خورے، ہم کام کی باتیں کر رہے ہیں . . . . ٹھہر کر۔ کچھ دیر کے بعد . . . . .
(سربریاکف سے) ہاں اس سے پوچھو۔ جائداد اس کے چچا سے خریدی گئی تھی۔

سربریاکف۔ اوہ! میں اُس سے کیوں پوچھوں؟ کس لئے؟

وائنٹسکی۔ اُس وقت جائداد پچانوے ہزار روبل میں خریدی گئی تھی۔ میرے باپ نے صرف ستر ہزار ادا کئے اور پچیس ہزار قرض رہا۔ اب سنو . . . . جائداد ہرگز نہ خریدی گئی ہوتی اگر میں اپنا حصہ وراثت اپنی بہن کو جسے میں بے حد چاہتا تھا نہ دیدیتا۔ اس سے زیادہ یہ کہ میں نے دس سال تک ایک غلام کی طرح اس جائداد پر کام کیا اور تمام قرضہ ادا کر دیا . . . .

سربریاکف۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے کیوں یہ تذکرہ چھیڑا۔

وائنٹسکی۔ جائداد قرضہ سے پاک اور اچھی حالت میں صرف میری ذاتی محنت کی وجہ سے ہے اور اب جب کہ میں بڑھا ہو چلا تو مجھے ٹھکرایا جاتا ہے۔

سربریاکف۔ میں نہیں سمجھتا تمہارا مطلب کیا ہے۔

وائنٹسکی۔ میں اس جائداد کا انتظام پچیس سال سے کر رہا ہوں۔ میں نے انتہائی جانفشانی اور محنت سے

اکٹھا کر کر کے تمہیں روپیہ بھیجا اور ان تمام سالوں میں تم نے ایک مرتبہ میرا شکریہ ادا نہیں کیا۔ اس تمام مدت میں۔ جب میں جوان تھا جب بھی اور اب بھی۔ تم نے مجھے پانچسو روبل سالانہ تنخواہ دی۔ ایک حقیر ذلیل رقم! اور تم سے اتنا نہ ہوا کہ ایک روبل کا بھی اضافہ کرتے۔

سربریاکف۔ آئوان پیٹرووچ، مجھے اسکی شکایت بیکار ہے؟ میں عملی آدمی نہیں ہوں اور ان باتوں کو نہیں سمجھتا۔ تم اس میں جس قدر چاہتے اضافہ کر سکتے تھے

وائنٹشکی۔ میں نے چوری کیوں نہیں کی؟ کیسے تعجب کی بات ہے کہ تم لوگ مجھے ملامت نہیں کرتے کہ میں نے چوری کیوں نہیں کی؟ ایسا کیا ہوتا تو میں آج یوں مفلس اور بے زر نہ ہوتا۔

ماریا۔ (سختی سے) وائنٹشکی!

تلی گن۔ (غصہ میں) وانیا، میرے پیارے میاں، بس کرو . . . میں تو کانپا جاتا ہوں . . . . . تعلقات میں کیوں فرق ڈالتے ہو؟ دل صاف رہنے چاہئیں (اس کا بوسہ لیتا ہے) بس کرو

وائنٹشکی۔ پچیس برس تک میں اس چار دیواری کے اندر اماں کے ساتھ بند رہا . . . . . ہمارے خیالات اور احساسات صرف تمہارے لئے تھے، تمہارے تھے۔ دن کو ہم تمہارا اور تمہارا اور تمہارے کاموں کا ذکر کرتے تھے۔ ہمیں تم پر ناز تھا۔ تمہارا نام ہم عزت کے ساتھ لیتے تھے، راتیں ہم کتابیں اور رسالے پڑھ پڑھ کے ضائع کرتے تھے، افسوس، افسوس۔

تلی گن۔ بس، وانیا بس . . . . میری سمجھ میں نہیں آتا . . . . .

سربریاکف۔ (غصہ میں) میری سمجھ میں نہیں آتا تم کیا چاہتے ہو۔

وائنٹشکی۔ ہمارے لئے تم ایک بلند تر ہستی تھے اور ہمیں تمہارے مضامین زبانی یاد ہو گئے تھے۔ لیکن اب میری آنکھیں کھلی ہیں! میں اب سمجھا! تم آرٹ پر مضمون لکھتے ہو اور تم آرٹ کی بابت ایک حرف نہیں سمجھتے! تمہاری جن تصانیف کو میں اس قدر پسند کرتا تھا وہ کوڑی کی بھی نہیں ہیں! تم نے ہمیں فریب دیا!

سربریاکف۔ اسے روکو! میں جاتا ہوں!

یلنا۔ آئوان پیٹرووچ، میں تم سے کہتی ہوں کہ چپ رہو! سنتے ہو؟

وائنٹسکی۔ نہیں چپ ہوں گا۔ (سریریاکف کو جانے سے روک کر) ٹھہرو! مجھے ابھی بہت کہنا ہے، تم نے میری زندگی تباہ کی! میں زندہ نہیں رہا۔ میں زندہ نہیں رہا، تمہارے طفیل میں نے اپنی عمر کے بہترین ایام برباد کر دیے۔ تم میرے سب سے بڑے دشمن ہو۔

تلی گن۔ میں سن نہیں سکتا۔۔۔ میں سن نہیں سکتا۔۔۔ میں جاتا ہوں (بڑے غصے میں باہر چلا جاتا ہے)

سریریاکف۔ تم مجھ سے چاہتے کیا ہو؟ اور تمہیں مجھ سے اس طرح گفتگو کرنے کا کیا حق ہے؟ بے وقوف کہیں کے اگر جائداد تمہاری ہے تو لے جاؤ۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے!

یلینا۔ میں اس کال کوٹھری سے اسی وقت جاتی ہوں (رونی آواز میں کہتی ہے) میں ان حالات میں ایک منٹ یہاں نہیں ٹھہر سکتی!

وائنٹسکی۔ میری زندگی تباہ ہو گئی! مجھ میں ہنر، ہمت، ذہانت تھی! اگر مجھے معمولی اوسط قسم کی زندگی ملی ہوتی تو آج میں ایک شوپن ہار، ایک دستیفسکی ہوتا۔۔۔۔ میں دیوانوں کی طرح بک رہا ہوں! میں پاگل ہوا جا رہا ہوں۔۔۔ اماں، میں بڑی مصیبت میں ہوں! اماں!

ماریا۔ (ڈانٹ کر) جو الکزنڈر کہے اس پر عمل کرو۔

سونیا۔ (انا کے پیروں پر گر کر اور سراسیمہ ہو کے) انا جانی! انا جانی!

وائنٹسکی۔ اماں! میں کیا کروں؟ کچھ نہ بولو، بولنے کی ضرورت نہیں میں جانتا ہوں کیا کروں! (سریریاکف سے) تم بھی یاد کرو گے! (بیچ کے دروازے سے نکل جاتا ہے)

(ماریا واسیلیونا اس کے پیچھے جاتی ہے)

سریریاکف۔ کوئی حد ہے! اس پاگل آدمی کو یہاں سے لیجاؤ۔ میں اسکے ساتھ ایک مکان میں نہیں رہ سکتا جب دیکھو لڑنے کو موجود (بیچ کے دروازے کی طرف اشارہ کرتا ہے)۔ ہر وقت میری جان کے پیچھے۔۔۔۔ اسے گاؤں بھجوا دو ورنہ میں یہاں سے جاتا ہوں، لیکن اس کے ساتھ ایک مکان میں رہوں یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔۔۔۔

یلینا۔ (اپنے شوہر سے) ہم یہ جگہ آج ہی چھوڑ دیں گے! ہمیں اسی وقت اسباب باندھنا چاہیے!

سربریاکف۔ پاگل ذلیل آدمی!

سونیا۔ (پیروں پر جھکی ہوئی اپنا سر باپ کی طرف موڑتی ہے۔ روتے ہوئے سسکیاں بھر بھر کے) ابا جان رحم رحم۔ ماموں جان اور میں رنجوں کے مارے ہیں! (اپنی کمزوری پر غالب آکے) ابا جان رحم کیجئے! یاد کیجئے جب آپ اس سے زیادہ کم عمر تھے ماموں جان اور ننا کیسے تمہارے لئے رات رات بھر بیٹھ کے مسودے صاف کرتے تھے اور ترجمے کرتے تھے . . . . رات رات بھر . . . . رات رات بھر . . . ماموں جان اور میں آرام نہیں کرتے تھے اور کام کرتے تھے۔ ہم اپنے اوپر ایک پیسہ خرچ کرتے ڈرتے تھے اور سب آپ کو بھیجتے تھے . . . . ہم نے بیکاری کی روٹی نہیں کھائی۔ میں یہ سب غلط کہہ رہی ہوں۔ غلط کہہ رہی ہوں، لیکن ابا جان آپ کو سمجھنا چاہئے، سب سمجھنا چاہئے۔ آپ ترس کھائیے!

یلنا۔ (غصہ میں اپنے شوہر سے) الکزنڈر خدا کے لئے اسے منا لو . . . میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں!

سربریاکف۔ بہت اچھا میں اس سے بولونگا۔ میں اس کو کوئی الزام نہیں دیتا میں اس سے خفا نہیں ہوں لیکن یہ تم بھی مانو گی کہ اس کا طرز عمل عجیب ہے۔ بہت خوب، میں اس کے پاس جاتا ہوں (بیچ کے دروازے سے باہر جاتا ہے)

یلنا۔ اس سے نرمی سے بات کرنا، اسے دلاسا دینا . . . . (اس کے ساتھ باہر جاتی ہے)

سونیا۔ (انا سے لپٹ کے) ارے انا جانی! انا جانی!

مارینا۔ کیوں گھبراتی ہے، لڑکی مرغے چیخیں گے اور چپ ہو جائیں گے . . . چیخیں گے اور چپ ہو جائیں گے . . . .

سونیا۔ انا جانی!

مارینا۔ (اسکا سر سہلا کر) تم تو ایسی کانپ رہی ہو جیسے سردی لگ گئی! بس، بس، بن ماں کے بچے، اللہ رحم کرے! ایک چائے کی پیالی یا چونے کا پانی پینے سے طبیعت ٹھیک ہو جائے گی . . . . رنج نہ کرو، بیٹی (غصہ میں بیچ کے دروازے کو دیکھکر) اچھے خاصے انسان سے پاگل ہو گئے ہیں! اللہ ان سے سمجھے!

(منظر کے پیچھے ایک ریوالور کے فیر کی آواز آتی ہے، یلنا اینڈریونا کی ایک چیخ سنائی دیتی ہے سونیا

کانپتی ہے)

مارنیا۔ ہائے یہ کیا! خدا غارت کرے ۔

سربریاکف۔ (دوڑتا ہوا آتا ہے، خوف سے پیر ڈگمگاتے ہیں) اسے پکڑلو! اسے پکڑلو! وہ پاگل ہو گیا ہے

(یلینا اینڈریونا اور وائنشکی دروازے پر جھگڑتے ہیں)

یلینا۔ (اس کے ہاتھ سے روالور چھیننے کی کوشش کرتے ہوئے) اسے چھوڑ دو! میں کہتی ہوں اسے چھوڑ دو!

وائنشکی۔ مجھے جانے دو، ہیلن! مجھے جانے دو! (اس سے اپنے کو چھڑا کر وہ اندر آتا ہے اور سربریاکف کو تلاش کرتا ہے) کہاں گیا؟ یہ ہے! (اس پر پستول چلاتا ہے) لیتے جاؤ! (ایک وقفہ) خالی گیا پھر خالی گیا! (وحشیانہ لہجہ میں) خدا غارت کرے۔ خدا اسے غارت کرے .... (پستول زمین پر پھینک دیتا ہے اور تھک کر ایک کرسی پر گر جاتا ہے۔ سربریاکف بدحواس ہے۔ یلینا دیوار کا سہارا لیتی ہے جیسے بیہوش ہونے کو ہے)

یلینا۔ مجھے یہاں سے لے چلو! مجھے یہاں سے لے چلو! مجھے مار ڈالو .... میں یہاں نہیں رہ سکتی نہیں رہ سکتی۔

وائنشکی۔ (مایوسانہ) ارے! میں کیا کر رہا ہوں! میں کیا کر رہا ہوں!

سونیا۔ (آہستہ سے) انا جانی! انا جانی!

پردہ

(باقی)

شذرات

ہر آدمی جسے بچوں سے سابقہ پڑا ہو جانتا ہے کہ انکے ہاتھوں کے لئے ہمیشہ کچھ کام ہونا چاہئے۔ بچوں کو بیکار رکھنا انہیں شرارت پر مجبور کرنا ہے۔ اجتماعی زندگی کی نفسی کیفیتیں انفرادی بچپن سے بہت کچھ ملتی ہیں۔ چنانچہ جماعتوں کے پاس بھی جب کوئی معقول شغل نہیں ہوتا تو وہ اپنی قوت کو فتنہ و فساد میں صرف کرنیکی کوشش کرتی ہیں۔ ہندوستان کے غلاموں نے ترک موالات کی تحریک میں آزادی حاصل کرنے کی ایک زبردست کوشش کی۔ اس مقصد کو حاصل کرنیکے لئے اپنی سمجھ کے موافق ذرائع بھی تجویز کئے اور ان پر کاربند بھی ہوئے۔ اور اسمیں کچھ عرصہ تک ایسے منہمک رہے کہ کسی فتنہ و فساد کے لئے وقت ہی نہ ملا۔ یہ تحریک سوائے اپنے بالواسطہ نتائج کے بعض اندرونی کمزوریوں کی وجہ سے چند سال کے بعد آگے نہ چل سکی۔ قوم کے ہاتھ خالی ہوئے تو بھائیوں نے سنگٹھن اور تنظیم، شدھی اور تبلیغ کے نام سے بھائیوں کے گلے کاٹنے شروع کئے۔ تاکہ ہاتھوں کے لئے کچھ تو کام ہو! "لیڈروں" نے قوم کو بہت کچھ سمجھایا لیکن قوم نے جو "درس عمل" پا چکی تھی انکی کسی بات پر کان نہ دھرا۔ اور اپنے نئے شغل میں خلوص انہماک سے مصروف رہی۔ لیڈروں نے کانفرنسیں کیں۔ تجویزیں منظور کیں، اپیل شائع کئے۔ لیکن صورت حال میں ذرا تبدیلی نہ ہوئی۔ "قوم" سے گذر کر معاملہ "اکابر قوم" تک پہنچا۔ انمیں سے اکثر چونکہ میدان عمل سے دور رہ کر قوم کو ہدایات دینے کے عادی ہوتے ہیں اس لئے میدان کارزار کی اطلاعوں نے انکے لئے ایک ذہنی مسئلہ کی شکل اختیار کر لی اور یہ سمجھنے لگے کہ متحارب جماعتیں ایسے تخیلات و مقاصد کے لئے برسر پیکار ہیں جن میں باہمی سمجھوتہ ممکن ہی نہیں۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہندو مسلمان "لیڈروں" میں اچھی خاصی تعداد اس خیال کی قائل ہوگئی کہ ایک ہی آسمان تلے اور ایک ہی زمین کے ٹکڑے پر بسنے والی یہ دو قومیں ہندو اور مسلمان کبھی باہمی مفاہمت سے کسی مفید سیاسی فیصلہ پر نہیں پہنچ سکتیں۔

انہیں "لیڈروں" میں کچھ لوگ تھے جنکے قوائے عمل اگرچہ اس مسموم فضا میں تقریباً دوسروں کی طرح

ہی شل تھے تاہم دماغ ابھی کام کرتا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ ہر چند اس وقت کام کچھ نہیں بن پڑتا لیکن کم سے کم اس ذہنی مرض کا علاج تو کرنا چاہئے جس نے اچھے اچھے قوم پرستوں" کو "فرقہ پرست" بنا دیا ہے۔ اس کوشش میں بھی بہت سی ناکامیاں ہوئیں لیکن بالآخر مسلمانوں کی ایک باا ثر جماعت نے یہ تسلیم کرکے کہ ہندو مسلمانوں کا جھگڑا دراصل آنے والی آزادی میں اپنے اپنے حصہ کا جھگڑا ہے۔ آئندہ سیاست ملکی کے بعض اہم مسائل کے متعلق وہ تجاویز ملک کے سامنے پیش کیں جو "تجاویز دہلی" کے نام سے موسوم ہیں۔ ان تجاویز نے گفت وشنید کا دروازہ کھولا۔ اور کانگریس نے اس موقع کو غنیمت جانکر کوشش شروع کی کہ مختلف جماعتیں کس طرح اپنے باہمی مطالبات میں کچھ لیکر کچھ دیکر ہم آہنگی پیدا کرلیں۔ تاکہ اس روزافزوں ذہنی خطرہ سے نجات کی صورت ہو کہ ہندو مسلمان کسی طرح ایک آزاد ہندوستان میں ایک دوسرے کا حق غصب کئے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔

ادھر ہندوستانیوں کی باہمی نااتفاقی کو دیکھکر بعض کم ظرف برطانوی مدبرین نے طعنے دینے شروع کئے کہ اچھا تم آزادی چاہتے ہو۔ اپنے باہمی مسائل کا تو کوئی تصفیہ کرلو۔ کوئی ایسا دستور ہی بنا لو جس میں مختلف الخیال سیاسی جماعتیں ہم آہنگ ہوجائیں۔

کانگریس نے مختلف جماعتوں کو دعوت دی۔ اور پنڈت نہرو کی صدارت میں ایک نہایت ممتاز کمیٹی نے دستور اساسی بنا ڈالا۔

سچ پوچھئے تو یہ دستور سازی بیکاری کا شغل ہے۔ دستور اساسی مرتب ہوتا ہے اس وقت جب قوم اپنی آزادی حاصل کرچکتی ہے یا اسے حاصل کرنیکی قوت اپنے اندر پیدا کرلیتی ہے اور اس حقیقت کے یاد دلانے کی کیا ضرورت ہے کہ ہم اس وقت غلام ہیں اور ہم میں سے بہت سے غلام رہنے پر قانع ہیں۔ ہندوستان کے حقیقی دستور اساسی میں تو قوموں، اور علاقوں کے حقوق کی تقسیم میں خود اس حصہ کو بہت دخل ہوگا، جو یہ قومیں یا علاقے حصول آزادی کی دشوار کشمکش میں لیں گے۔ کاغذ پر اگر ہندوؤں مسلمانوں کو سب حقوق دے دئے جائیں اور جنگ آزادی میں ہندو تنہا لڑیں یا مسلمان تنہا تو کیا دستور کے

اندر انکی اعتباری حیثیت وہی رہ سکتی ہے یا رہنی چاہئے جو کاغذ پر پہلے سے لکھدی گئی ہے۔ ہندوستان کا دستور اساسی اس کے ہندو مسلمان فرزندوں کے خون سے اور شاید اس سے زیادہ اس کے محنتی اور جفاکش، صابر، مستقل مزاج اور گمنام فرزندوں کے پسینہ کی بوندوں سے لکھا جائیگا۔ قصر حریت کی مکین انہیں لوگوں کی آئندہ نسلیں ہوسکتی ہیں جو اس کی تعمیر میں اپنا خون پسینہ ایک کرینگے۔ اور باغ آزادی کی ترنگیں انہیں کے جانشینوں کے حصہ میں آئیں گی جو اپنے خون سے اس چمن کی آبیاری کرینگے۔

لیکن خیر۔ یہ دستور سازی بیکاری کا شغل ہی سہی۔ اس وقت دیکھنا یہ ہے کہ بیکاری کے اس کام کو ہندوستانیوں نے کس طرح انجام دیا۔ ہم نہرو رپورٹ کی خامیوں سے بیخبر نہیں اور اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس میں ترمیم و اضافہ کی ضرورت ہے اور یقین کرتے ہیں کہ یہ ترمیمیں ہو بھی جائیں گی۔ لیکن باوجود ان خامیوں کے علم کے، اور کونسا انسانی کام ہے جس میں خامیاں نہ ہوں۔ ہم اس رپورٹ کے مرتب کرنے والوں کو مبارکباد دئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ انہوں نے اپنے مشکل کام کو نہایت خوبی سے انجام دیا۔

افسوس یہ ہے کہ کام کی خوبی کو شخصیتوں کے تصادم نے نظروں سے بہت کچھ چھپا دیا ہے۔ اس وقت مسلمانانِ ہند کیطرف سے جو بڑے وسیع پیمانہ پر اس دستاویز کی مخالفت ہو رہی ہے اس میں بے شک مسلمانوں کے سیاسی خیالات اکثریت کیطرف سے بعض صورتوں میں بیجا بے اعتمادی کا حصہ بھی ہے لیکن کوئی شخص جو حالات کو قریب سے دیکھ رہا ہو اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ یہ اصولوں کی لڑائی نہیں شخصیتوں کے ٹنٹے ہیں۔ اشخاص کے متعلق رائے دینا بہت ہی مشکل اور پرخطر کام ہے۔ لیکن یہ خواہش ظاہر کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ کاش ان میں سے کوئی شخصیت تو اتنی بڑی ہوتی جو محض ذاتی اقتدار کے خیال سے ارفع ہوکر ان گتھیوں کو سلجھا سکتی۔ کیا اس بات میں مولانا محمد علی اور محمد علی جناح ان توقعات کو پورا کر سکیں گے جو قوم کے ہر بہی خواہ کو اسوقت ان سے ہیں؟

ہم جامعہ کے اس پرچہ کے ساتھ نہرو رپورٹ کا مکمل اردو ترجمہ اس وجہ سے ہدیۂ ناظرین کر رہے ہیں کہ وہ اپنی مخالفت یا موافقت کو رپورٹ کی سفارشات کے برے یا اچھے ہونے پر یا اس کے دلائل کے غلط یا صحیح ہونے پر منحصر رکھیں اور اگر ہو سکے تو شخصیتوں کے جھگڑوں سے الگ ہو کر رائے قائم کریں۔

رپورٹ کے مطالعہ اور فہم میں سہولت کے لئے ہم چند سطریں اس کے مطالب کی تقسیم کے متعلق بھی لکھنا چاہتے ہیں۔ اس رپورٹ میں ۴ مباحث خاص توجہ کے مستحق ہیں یعنی ذمہ دار حکومت کا مسئلہ، نوآبادی طرز کی حکومت کا مسئلہ، دیسی ریاستوں کا سوال، اور ہندو مسلم مسئلہ انپر علیحدہ علیحدہ تفصیل سے لکھنے کا یہ موقع نہیں۔ لیکن ناظرین کی سہولت کے لئے چاروں مسائل پر ایک ایک مختصر نوٹ درج ذیل کیا جاتا ہے۔ انشاء اللہ "جامعہ" کے صفحات میں ان مباحث پر آئندہ مفصل مضامین بھی شائع ہوں گے۔

"اپنی حکومت، اپنے ہاتھوں، اپنے لئے" یہ ذمہ دار حکومت کی تعریف ہے۔ مگر اس طرز حکومت کی تاریخ اگر دیکھی جائے تو وہ کچھ اور ہے، اور قومی حکومت کا نصب العین جو امریکہ کے مشہور پریزیڈنٹ لنکن کے مقولہ سے ظاہر ہوتا ہے کچھ اور۔ قرون وسطیٰ میں اکثر بڑے شہروں کو یہ حق حاصل تھا کہ اپنے شہر میں نمائندوں کے ذریعہ سے حکومت کریں اور ان کی منتخب کی ہوئی مجلسوں کو کافی اقتدار بھی تھا لیکن رفتہ رفتہ ان مجلسوں میں نمائندے بھیجنا صرف چند رئیس خاندانوں کا حق رہ گیا۔ اور شہر کے باقی باشندوں کی حیثیت صرف رعایا کی سی ہو گئی جس کا آخر میں یہ نتیجہ ہوا کہ شہروں کی آزادی اور ذمہ دار حکومت دونوں یا انقلاب یا بغاوت یا بیرونی حملوں یا شاہی اثر کے ہاتھوں تباہ ہوئیں۔ صرف وینس کی ایسی ریاست تھی جو متعدد صدیوں تک قائم رہ سکی۔

انگلستان میں بھی قرون وسطیٰ میں شہروں کا یہ حق تسلیم کیا جاتا تھا، لیکن اس کی حیثیت چند

وجوہ سے بالکل بدل گئی۔ یورپ کے دوسرے ملکوں میں بادشاہت کو امراء پر اس وجہ سے فتح حاصل ہوئی تھی کہ ملک کی حفاظت صرف بادشاہ کرسکتا تھا۔ جزیرہ ہونیکی وجہ سے انگلستان میں بیرونی حملوں کا زیادہ خوف نہ تھا، اور اسی لئے امراء بادشاہ کا بہتر مقابلہ کرسکے۔ کئی بار انہوں نے بادشاہ کو اپنے حقوق منظور کرنے پر مجبور کیا۔ اور اس پر دباؤ ڈالنے کے لئے اکثر اپنی جماعت میں سے چند نمائندے مقرر کردئے جو بادشاہ کے ساتھ رہتے تھے اور تمام مجلسوں اور درباروں میں شریک ہوتے تھے۔

امراء کے خلاف بادشاہوں نے تاجروں اور چھوٹے زمینداروں کو ابھارا۔ اور آخر میں یہ نتیجہ ہوا کہ بادشاہ۔ امراء اور "عوام کے نمائندے" تینوں حاکم بن گئے، اور حکومت کرنے کا حق قانوناً اپنے ذمہ لے لیا۔ مگر یہ حکومت کسی طرح سے ذمہ دار نہیں تھی اور نہ امراء اور "عوام" کے نمائندے صحیح معنوں میں "منتخب" ہوتے تھے۔

سترہویں صدی کی civil War نے بادشاہ کے ہاتھ سے حکومت کی باگ چھین لی۔ ۱۶۸۸ کے انقلاب نے جو کچھ حقوق اس کے پاس رہ گئے تھے "عوام" کو بخش دئے، اور اس کے بعد سے پارلیمنٹری حکومت کا دور شروع ہوگیا۔ مگر پارلیمنٹ کے انتخاب میں عوام کو رائے دینے کا کوئی موقعہ نہ تھا۔ یہ حق صرف ایک خاص حیثیت کے زمینداروں اور شہر کے رئیسوں کو حاصل تھا، اور جائداد وغیرہ کے ساتھ وراثت میں باپ سے بیٹے کو ملتا تھا۔ حکومت بھی صرف اس لحاظ سے ذمہ دار تھی کہ پارلیمنٹ کے اراکین کو وزارتیں بنانے اور بگاڑنے کا حق تھا۔ اس لحاظ سے نہیں کہ عوام کی رائے اور خواہش کے مطابق حکومت ہوتی تھی۔ ۱۸۳۲ اور ۱۸۶۷ میں رائے دینے والوں کے حلقہ میں بہت توسیع کی گئی، اور تب ہی سے سمجھنا چاہئے کہ حکومت درحقیقت ذمہ دار ہوئی

اٹھارہویں صدی کے آخر میں جب امریکہ کی نوآبادیوں نے انگلستان کے خلاف بغاوت کی تو انہوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ بغیر نمائندگی کا حق دئے کسی قسم کا ٹکس وصول کرنا سیاسی اخلاق کے خلاف ہے۔ اور انہوں نے لڑکر انگلستان سے اپنی آزادی حاصل کی۔ نوآبادیوں کی کامیابی اور اس کے فوراً

بعد فرانسیسی انقلاب نے یورپ کی قوموں کو بیدار کر دیا۔ اور ۱۸۴۸ تک علاوہ ہسپانیہ اور اطالیہ کے تقریباً تمام ملک ذمہ دار حکومت کسی نہ کسی شکل میں حاصل کر چکے تھے۔

یہ تو ہر جگہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ حکومت کو قوم کی مرضی کے خلاف نہ چلنا چاہیئے۔ لیکن یہ طے کرنا بہت مشکل ہے کہ حکومت کو کس کے روبرو ذمہ دار ہونا چاہیئے۔ اگر انتخاب اکثریت کے مطابق ہوتا ہے تو قلیت کے حقوق بالکل مارے جاتے ہیں۔ اور اگر اقلیت کا پورا لحاظ کیا جائے تو انتخاب کا مسئلہ پیچیدہ ہو جاتا ہے انگلستان میں انتخاب بہت سادے اور سلجھے طریقہ پر ہوتا ہے۔ لیکن وہاں اکثر ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ جو پارٹی پارلیمنٹ میں اکثریت میں ہوتی ہے اس کے ملک میں موافقین دراصل اقلیت میں ہوتے ہیں۔ دوسرے ممالک میں نمائندگی صحیح ہوتی ہے مگر ایوانوں میں فریقوں کی تقسیم ایسی بے ڈھنگی ہو جاتی ہے کہ وزارت قائم کرنا دشوار ہوتا ہے، وزارتیں زیادہ دن تک قائم نہیں رہ سکتیں اور اگر رہیں بھی تو اپنی ہیئت ترکیبی کی وجہ سے کوئی مستقل پالیسی اختیار نہیں کر سکتیں۔

پھر بھی صبر اور استقلال نے بڑی حد تک ذمہ دار حکومت کی مشکلیں آسان کر دی ہیں۔ لیکن روسی انقلاب نے اس مسئلہ کی ایک اور شکل پیش کی ہے جو موجودہ ذمہ دار حکومتوں کے اصول کے تو بالکل موافق ہے لیکن عملی صورت میں بالکل نہیں نبھ سکتی۔ اگر ذمہ دار حکومت کی بنیاد اکثریت کی رائے پر ہے تو قوم کے اس طبقہ کو جو تعداد میں سب سے زیادہ ہے۔ یعنی مزدور اور کسان حکومت پر بالکل حاوی ہونا چاہیئے مزدوروں اور کسانوں کی اکثریت تو ہر ملک میں ہے، اور اگر وہ سب اسی طرح سے ہم آہنگ ہو جائیں جیسے روس کے مزدور اور کسان تو موجودہ ذمہ دار حکومت بالکل ناممکن ہو جائے۔ سرمایہ دار طبقوں کے پاس اسکا ایک ہی جواب ہے، اور وہ اطالیہ کا انقلاب اور Mussolini کی حکومت ہے۔ لیکن وہ اسی قدر کم ذمہ دار ہے جیسے روس میں پرولے تاریات کی حکومت!

"نوآبادی درجہ" کی حکومت برطانوی سلطنت کی خصوصیت امتیازی ہے اور تاریخ دستوری میں برطانیہ کی مہتم بالشان کارگذاری! حکومت کو تضاد مقاصد پر قائم رکھنے کے بجائے اشتراک اغراض پر قائم کرکے کم وبیش خود مختار قوموں کا ایک جتھا بنالینا جو دنیا کی تمام طاقتوں پر فرداً فرداً اور اکثر مجموعی حیثیت سے بھی بھاری ہو تدبر برطانوی کا وہ کارنامہ ہے جس پر برطانیہ بجا فخر کر سکتا ہے۔ ایک تمدن رکھنے والے لوگ، اکثر نسلی رشتوں سے وابستہ، مختلف ممالک کے رہنے والے اپنے معاشی اور سیاسی اغراض میں باہمی ایسی ہم آہنگی پیدا کرلیں کہ ایک کے فائدہ میں دوسرے کا فائدہ اور ایک کے نقصان میں دوسرے کا نقصان ہو یا اگر کبھی ایک کو نقصان اٹھانا پڑے تو کبھی دوسرا اس کی خاطر نقصان اٹھالے، ایسا سیاسی تجربہ ہے جس سے انسانیت کے مستقبل کے لئے اچھی راہوں کا تخیل قائم ہو سکتا ہے۔ اور یہی صورت فی الواقع برطانوی سلطنت کے ان اجزائے ترکیبی نے پیدا کرلی ہے جو "نوآبادی طرز" کی حکومت رکھتے ہیں۔ نوآبادی طرز کی حکومت رکھنے والے ممالک سلطنت برطانوی کے اندر خود مختار جماعتوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان سب کا درجہ برابر ہے تاج برطانیہ کی مشترک وفاداری انہیں باہم متحد کرتی ہے، اپنے اندرونی اور بیرونی معاملات میں یہ ایک دوسرے کے ماتحت نہیں اور آزادی کے ساتھ بحیثیت رکن برطانوی دولت مشترکہ میں شریک ہیں۔

نہرو رپورٹ نے ہندوستان کا دستور اساسی اسی نوآبادی طرز کی حکومت کا نمونہ پر رکھا ہے خود نہرو کمیٹی کے اراکین میں بعض اور انکے علاوہ انڈین نیشنل کانگریس میں ایک بڑی جماعت اس خیال کی ہے کہ ہندوستان کے لئے نوآبادی طرز حکومت مناسب نہیں۔ ہندوستان اسوقت تک صحیح معنوں میں آزاد نہیں ہو سکتا جبتک کہ سلطنت برطانیہ سے اسکا تعلق بالکل منقطع نہ ہو جائے۔ دونوں خیال کے حامی اپنی طرف وزنی دلائل رکھتے ہیں۔ ایک طرف نوآبادی طرز کی حکومت اگر دنیا کے آئندہ سیاسی مناقشات کو رفع کرنے اور بین الاقوامی تعاون کی امید دلاتی ہے وہاں مختلف تمدنوں کے وجود سے دنیا کی رنگا رنگی کے قائم رہنے اور اس محفل عالم کی رونق کا خیال یکسانیت کے خلاف لوگوں کو اکساتا ہے اور ہر قوم یہ سمجھی ہے کہ وہ دنیا کی فلاح میں بہترین حصہ اسی طرح لے سکتی ہے کہ ان چیزوں کو تمدن عالم کے

لئے پیش کرے جو صرف اس کے ساتھ مخصوص ہیں۔ خیر۔ اہل سیاست کو تو یہ خیالات بہت دور افتادہ معلوم ہونگے۔ میدان سیاست کے مرد اپنی نظر کو بہت دور نہیں جانے دیتے۔ لیکن اس مسئلہ میں اگر زیادہ دور بینی سے کام نہ لیا جائے تو بھی اسکا حل بہت آسان نہیں۔ ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ میں بالکل نوجوان لوگوں کو چھوڑ کر بڑا حصہ ایسا ہی ہے جو نوآبادی طرز کی حکومت کو ہندوستان کا مقصود قرار دینے پر آمادہ ہے۔ نوجوان برطانوی سیاست کے تلخ تجربوں کے باعث برطانیہ سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتے۔

سچ یہ ہے کہ یہ مسئلہ اس وقت ایک علمی سی حیثیت رکھتا ہے۔ کہ نہ ہم میں اسوقت نوآبادی طرز کی حکومت لے لینے کی قوت ہے۔ نہ خودمختاری حاصل کر لینے کی۔ اور نہ یہ کسی دوسرے سے مل سکتی ہے نہ وہ۔ ہاں جسوقت ہندوستان کے لوگ اپنے اندر یہ قوت پیدا کر لیں گے کہ وہ نوآبادی طرز کی حکومت حاصل کر لیں تو اس وقت ان میں وہ قوت بھی ہوگی جو انہیں خودمختاری کامل لینے کے قابل بنا دے۔ اس وقت سلطنت برطانیہ کے اندر رہنے یا اس سے باہر جانے کا مسئلہ حقیقی سیاست کا ایک مسئلہ ہوگا اور تمام حالات کو پیش نظر رکھ کر ہندوستان فیصلہ کریگا۔ یہ ضروری ہے کہ ہندوستان کو اپنی آزادی حاصل کرنے میں برطانوی سامراج کا جس طرح مقابلہ کرنا ہوگا اور جنگ آزادی کی ابتدائی منزلوں میں ہی جو جو دشواریاں اسپر ڈالی گئی ہیں وہ سب آزاد ہندوستان کو برطانوی تعلق کے توڑنے پر آمادہ کرینگی۔ اور اس وقت غالباً جمہوریت ہند اسی گروہ کے خیالات پر کاربند ہوگی جو اسی وقت سے برطانیہ اور ہندوستان کے اغراض و مقاصد کے اختلاف اور تمدن، مذہب، نسل، سب کے تباین کی بنیاد پر برطانیہ سے علحدگی کو ضروری قرار دے رہا ہے۔ اس کے علاوہ کون جانتا ہے کہ خود انگلستان کے اغراض بھی اس کی اجازت دے سکیں کہ وہ ہندوستان کو اپنے خاندان سیاسی میں برابر کا رکن بنالے، ہندوستان کی وسعت، اس کی آبادی، اس کی تجارت اور صنعت کے غیر محدود امکانات ایسی چیزیں ہیں کہ برطانوی سلطنت میں اس کا بحقوق مساوی شریک ہونا شاید انگلستان اور دوسری نوآبادیوں کو خود گوارا نہ ہو۔ اور جب ہندوستان واقعی نوآبادی طرز کی حکومت اور خودمختاری میں انتخاب کرنے کا اہل ہو اس وقت انگلستان اور اس کی نوآبادیاں ہی

اسے خود مختار کر دینا زیادہ پسند کریں لیکن فی الحال اس انتخاب کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرنا خود مختاری اور نوآبادی طرز کی حکومت کے علمی مقابلہ سے زیادہ ضروری ہے۔ لیکن زیادہ مشکل بھی!

دیسی ریاستوں کا مسئلہ بھی اپنی نوعیت میں ایک نرالا مسئلہ ہے۔ ہندوستان کی سڑکوں، نہروں ریلوں کے نقشے اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ جسم اجتماعی کی یہ رگیں بلا امتیاز برطانوی اور دیسی ریاستوں کے علاقہ میں ہو کر گذرتی ہیں اور صحیح احساس سیاسی رکھنے والے کو اس دن کی خبر دیتی ہیں جب یہ جسم اجتماعی اپنی وحدت کو محسوس کرے گا اور اس کے مختلف علاقے جس میں دیسی ریاستیں بھی شامل ہیں اعضا کی طرح اپنے اپنے وظائف کو پورا کریں گے۔ اُدھر سیاسی اور اخلاقی تخیلات کی رو صاف بتلا رہی ہے کہ اس براعظم کا نظم کن اصولوں کا پابند ہوگا۔ جہاں ذمہ دار اور نیابتی حکومت کا مطالبہ دنیا کی سب سے زبردست حکومت سے قبول کر سکنے کا حوصلہ ہو اور اخلاقی عالم کی عدالت کے سامنے اس حکومت کو بھی اصولاً اس سے انکار کی مجال نہ ہو اور وہ بطور منزل مقصود اسے تسلیم کرنے پر مجبور ہو۔ وہاں غیر ذمہ دار شخصی حکومت کو یہ امید کہ وہ اپنے کو اسی غیر ذمہ دار حیثیت میں قائم رکھ سکے گی۔ ایک موہوم امید ثابت ہوگی جس میں قانونی موشگافیاں کچھ بہت زیادہ تبدیلی پیدا نہیں کر سکتیں۔ ہاں، قانونی موشگافیاں ایک لازمی نتیجہ کے پیدا ہونے میں رکاوٹ ڈال سکتی ہیں اور تاخیر کا باعث ہو سکتی ہیں، اس لئے کہ رکاوٹ اور تاخیر میں فریق غالب کا فائدہ ہے۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس تاخیر اور رکاوٹ سے برطانوی ہند کے آزادی حاصل کرنے والے عناصر میں تلخی بھی پیدا ہوگی۔ اور دیسی ریاستیں ہندوستان میں ہیں انگلستان میں نہیں! برطانیہ کے لئے بیشک یہ نہایت مفید دلیل ہے کہ دیسی ریاستیں اسپر اصرار کریں کہ انکے معاہدے ملک معظم سے ہیں حکومت ہند سے نہیں اور ملک معظم کی حکومت پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ اپنے ان حلیفوں کی حفاظت کے لئے ہندوستان میں تمام ان افواج بری و بحری کے ساتھ مسلط رہے جو اس تحفظ اور "ایفاء عہد" کے لئے ضروری ہیں۔ برطانیہ کی پابندی عہد کے متعلق دنیا تو زیادہ دھوکہ میں نہیں۔

البتہ اس موقع پر عہد کے مقدس اور ناقابل تحریف و تبدیل ہونے کا خاصہ احتمال ہو لیکن اگر برطانیہ اس حیلہ قانونی کی آڑ لیکر جائز ہندوستانی مطالبات کے پورا کرنے میں تاخیر کرے گا تو وہ بھی اسی قدر کوتاہ اندیشی سے کام لیگا جتنا کہ وہ ہندوستانی جو ہندوستان کی آئندہ حکومت سے اپنے کو محفوظ رکھنے کی کوششیں ابھی سے کر رہے ہیں۔

دیسی ریاستوں کیطرف عام ہندوستانی ارباب سیاست کا جو رویہ ہے اس سے بہتر کی خواہش دیسی ریاستیں نہیں کرسکتیں۔ برطانوی ہند کے ممتاز لوگوں کی پرورش اور مختلف تعلیمی اور خیراتی کاموں میں ان والیان ریاست سے جو مالی مدد وقتاً فوقتاً ملتی رہی ہے اس کا اثر ہمارے سیاسیین پر محسوس طریق سے موجود ہے۔ اور قدامت پرستی کا فطری جذبہ بھی چاہتا ہے کہ دیسی ریاستیں قائم رہیں اور پھلیں پھولیں۔ لیکن قیام اور پھلنے پھولنے کی تدبیر یہ نہیں ہے کہ ایک پردیسی سامراج سے رشتہ مضبوط کرکے اپنی قوم کے حق آزادی کو بیچ دیا جائے بلکہ اس کی صحیح تدبیر یہ ہے کہ ریاستیں سیاسی دنیا کی نئی قوتوں کو سمجھیں۔ اور اپنے نظام میں وہ تبدیلیاں پیدا کریں جنکا پیدا ہونا بس وقت کا سوال ہے۔ ہم اس موقع پر سرملکم ہیلی کی اس تقریر سے چند جملے نقل کرتے ہیں جو انہوں نے حال میں بنارس میں کی تھی۔ والیان ریاست سرملکم کے مشورہ کو سرلسلی اسکاٹ کی قانونی بحثوں پر ترجیح دیں تو انکے مستقبل کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوگا۔

سرملکم نے ٹھیک کہا کہ " دیسی ریاستوں کی حیثیت کا مدار عہدناموں کی تاویلوں یا دستور کے دفعات پر اس قدر نہ ہوگا جتنا کہ اس ترقی پر جو وہ اپنے حکمرانوں کے تحت میں کر سکینگی اور ترقی پذیر ہندوستان کے ساتھ ملکر کام کرسکنے کی صلاحیت پر۔ یہ لا ہے۔ کیونکہ قوموں اور ریاستوں کے درمیان معاملات میں واقعات کی منطق اور زندگی کی محرک قوتیں بالآخر زیادہ فیصلہ کن اثر رکھتی ہیں اور معاہدوں کے الفاظ اور دستور کے دفعات کم!

نہرو رپورٹ میں مندرجہ بالا مباحث اس لئے ہیں کہ دستور بنانے کے سلسلہ میں انکا آنا لازمی

تھا۔ لیکن یہ وہ مسائل نہیں جن کا پہلے سے تصفیہ ہندوستان کی آزادی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہو۔ وہ مسئلوں کا مسئلہ ہندو مسلم مسئلہ ہے۔ اور دراصل اسی گتھی کے سلجھانے کے لئے کوششوں کا جو سلسلہ عرصے سے جاری تھا فی الحال نہرو رپورٹ اس کی آخری کڑی ہے۔ نہرو رپورٹ کی سب سے بڑی خدمت اس باب میں یہ ہے کہ اس نے ثابت کر دیا ہے اور جہاں تک ہمارا علم ہے اس ثبوت کو معقول طریق پر اب تک رد نہیں کیا جا سکا کہ ایک جمہوری نیابتی نظام حکومت کے قیام سے مسلمانوں کو بہ حیثیت ملک کی سب سے زیادہ با اثر اقلیت کے نقصان کا کوئی اندیشہ نہ ہونا چاہئے۔ انکے لئے جہاں وہ بہت چھوٹی اقلیت میں مجالس قانون ساز میں نشستیں محفوظ ہوں لیکن آبادی کے تناسب سے جہاں وہ اکثریت میں ہیں وہاں اس قسم کے تحفظ نشست کی کوئی ضرورت نہیں۔ سندھ کی علیحدگی کے متعلق مسلمانوں کا مطالبہ کمیٹی نے منظور کیا ہے۔ اور مذہبی معاملات کو اکثریت کی مداخلت سے محفوظ کرنے کے لئے حقوق بنیادی میں یہ دفعہ شامل کر دی ہے کہ ہر ہندوستانی کو ضمیر کی آزادی اور مذہب کے اقرار اور اس پر عمل کی پوری آزادی حاصل ہوگی۔

ہمارا گمان ہے کہ نہرو کمیٹی کے مصنفین اور موافقین نے ہر وقت مسلمان رائے عامہ کو اپنی سفارشات کے غیر جانبدار ہونے کا یقین شخصی تشریح و توضیح سے نہیں دلایا۔ اور اس شخصی تغافل نے اکثر مسلمان رہنماؤں پر وہ اثر ڈالا جو کاش نہ پڑتا لیکن جن کا پڑنا سمجھ میں آتا ہے۔ مسلمان اقلیت میں ہیں اور بدقسمتی سے پچھلے چند سال سے ان میں اپنی مظلومیت کا مرثیہ پڑھنا فیشن ہو گیا ہے۔ وہ اگر تھڑ دلے ہیں تو اکثریت کا فرض ہے کہ انکے بیجا جذبات تک کا پاس کرے۔ اور ہمارا خیال ہے کہ اگر مسلمان رہنماؤں کے سامنے نہرو رپورٹ کی سفارشات کو رکھنے میں زیادہ شخصی اخلاق اور نرمی سے کام لیا جاتا تو مسلمانوں کی طرف سے مخالفت کی یہ نوعیت نہ ہوتی جو اس وقت نظر آ رہی ہے۔ رپورٹ کے مسلمان مخالفین کی تقریروں اور تحریروں کو غور سے پڑھئے تو پنڈت موتی لال کے "غرور"، "تمرد" کا ذکر زیادہ ہوگا اور سفارشات کے غلط یا نامعقول ہونے کا کم۔

بہر حال اس وقت مسلمانوں کی ایک کافی باا ثر جماعت نہرو کمیٹی کی سفارشات کی مخالفت کر رہی ہے ۔ افسوس کہ یہ مخالفت شخصی بنیاد پر ہونے کی وجہ سے اکثر نامعقول ہو جاتی ہے۔ اور اپنے مطالبات کو صحیح اور موثر طریق پر پیش نہیں کر سکتی اگر حشو و زوائد سے مسلمان مخالفت کو پاک کیا جائے تو ہمارا خیال ہے کہ مسلمانوں کا یہ طبقہ نہرو رپورٹ میں مندرجہ ذیل تبدیلیاں چاہتا ہے :۔

۱۔ پنجاب اور بنگال میں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں انکے لئے قانون ساز مجالس میں نشستیں محفوظ ہونی چاہئیں۔

۲۔ مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کو کم سے کم ⅓ نشستیں دیجائیں ۔

۳۔ مرکزی حکومت کے اختیارات میں تخفیف اور صوبہ کی حکومتوں کے اختیارات میں اضافہ ہونا چاہئے ۔

ان مخالفوں کے علاوہ ہندو مسلمانوں کا ایک طبقہ وہ ہے جو ہندوستان میں برطانوی راج چاہتا ہے اور وہ ظاہر ہے کہ نہایت شدت سے اس رپورٹ کا مخالف ہے البتہ اس وقت اپنی مخالفت میں مدد مسلمانوں کے اس طبقہ احرار سے بھی لے رہا ہے جن کے ساتھ اسکا اشتراک عمل ابتک ایک ناممکن سی شے سمجھی جاتی تھی ۔

اس آخری طبقہ کے ساتھ تو دلیل یا بحث بیکار ہے ۔ اس لئے کہ وہاں مقاصد کا بنیادی اختلاف ہے ۔ البتہ دوسرے گروہ کی مخالفت پر نئی کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کو ضرور غور کرنا چاہئے ۔

ہماری رائے میں مرکزی حکومت کے اختیارات میں کمی اور صوبہ کی حکومتوں کے اختیارات میں اضافہ کا مطالبہ بالکل صحیح مطالبہ ہے اور کمیٹی کو معقول حد تک اسے ضرور منظور کرنا چاہئے ۔

مرکزی جماعت قانون ساز میں مسلمانوں کی ایک تہائی نشستیں محفوظ ہونے کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ اگر فرض یہ کیا جاتا ہو کہ رائے ہمیشہ فرقہ وارانہ اصولوں پر دیجائیگی تو پھر مسلمانوں کی ایک تہائی کی اقلیت بھی اتنی ہی غیر موثر ہوگی جتنی ایک چوتھائی کی اور اچھا ہوتا کہ مسلمان اہل سیاست اس ظاہری لیکن بے سود رعایت کے لئے اتنا زور نہ دیتے ۔ لیکن اگر مسلمانوں کو ایک تہائی نشستیں دینے سے پنجاب

میں سکھ صوبہ میں اپنے لئے آبادی کی نسبت سے زیادہ نشستوں کے تحفظ کا مطالبہ نہ کرنے لگیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ آل پارٹیز کانفرنس کو مسلمانوں کے اس مطالبہ کو بھی اس لئے مان لینا چاہئے کہ یہ ایک ایسی جماعت کا مطالبہ ہے جس کے تعاون بغیر ہندوستان میں آزادی کا خیال ذرا محال ہی سا ہے اور جسے اگر کسی وجہ سے اکثریت پر ابھی پورا بھروسہ نہیں تو قابل معافی ہی۔

پنجاب اور بنگال میں نشستوں کے تحفظ کا مطالبہ بالکل بے معنی اور مسلمانوں کی شان کے منافی ہے۔ نہرو کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں کافی وضاحت کے ساتھ یہ بات ظاہر کی ہے کہ تحفظ نشست کے بغیر پنجاب اور بنگال میں مسلمان اپنی آبادی کے تناسب سی زیادہ نشستیں حاصل کر سکتے ہیں۔ اس امکان اور اس قوی احتمال سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن مسلمان معترضین کہتے ہیں کہ ہم کمزور ہیں مقروض ہیں، غیر منتظم اور پراگندہ ہیں، ہم اپنی آبادی کی نسبت سی مقابلہ میں نشستیں کیسے جیت سکتے ہیں۔ ہمیں وقت دو کہ ہم مضبوط ہو جائیں۔ قرض چھڑالیں، تنظیم کر لیں۔ پھر ہمیں تحفظ کی ضرورت نہ ہوگی۔ خود مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے ہم اس مطالبہ کو بہت مضر سمجھتے ہیں۔ ہمارا خیال ہی کہ مسلمانوں کو محض انکی ماضی کے صدقہ میں جو حقوق دئے جاتے رہے ان سے انکی ترقی اور بیداری میں بڑی رکاوٹ پیدا ہوئی اور یہی حال اس صورت میں ہوگا۔ اگر کمزور ہونے، مقروض ہونے اور غیر منظم ہونے کے باوجود مسلمانوں کو اپنی نشستیں ملجائیں تو پھر یہ کیوں صورت حال کو بدلنی کی کوشش کرینگے؟ اپنی کمزوری، عدم تنظیم کے خمیازہ ہمیں اٹھانا چاہئے تاکہ ہم ان سے نجات پانیکی تدبیریں نکالیں۔ اور اگر کچھ عرصہ پنجاب اور بنگال میں مسلمان کچھ نقصان اٹھا کر بھی اپنی قوت کو مجتمع اور منظم کر سکیں تو وہ نقصان اس فائدہ کی بہت ارزاں قیمت ثابت ہوگا جس کے ادا کرنے کے لئے دور اندیش مسلمانوں کو تیار رہنا چاہئے آخر میں ہم مسلمانوں سے ایک گذارش کرنا چاہتی ہیں اور وہ یہ ہی کہ انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ خاص مراعات اور تاریخی حیثیت کی بنا پر مخصوص حقوق کا مطالبہ بظاہر کتنا ہی ضروری اور وقتی اعتبار سے مفید معلوم ہوتا ہو دراصل مسلمانوں کے مستقبل کو بگاڑنے کی یقینی تدبیر ہے۔ مسلمانوں کو اگر جمہوری آزاد ہندوستان میں باوقار وجود قائم رکھنا ہے تو انہیں آزاد مقابلہ کے لئے بھی تیار رہنا چاہئے۔ اقلیت کی حیثیت سی انکے

منہ پر تو کبھی تناسب آبادی یا تحفظ کا ذکر ہی نہ آنا چاہیے۔ انکا مستقبل اس سے درست نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنی تعداد کی نسبت سے آزادی کی برکات میں حصہ لے سکیں گے اور انکی تعداد کم ہے! ۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ مسلمان اپنی آبادی کی نسبت سے زیادہ آزاد ہندوستان کے لئے مفید ہو سکتے ہیں اور اسلئے آزادی کے برکات میں آبادی کے تناسب سے زیادہ کے مستحق قرار دئے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہ اسی وقت جب حصول آزادی کی کشمکش میں اپنی تمام صلاحیتوں سے کام لیں اور حصول آزادی کے بعد اس کے قیام میں اپنی تمام ذہنی اور جسمانی، جمالی، اور جلالی قوتوں کو صرف کریں۔ مسلمانوں کا مطالبہ یہ ہونا چاہیے کہ ہمیں ہماری صلاحیت کے مطابق ملے، ہماری خدمت اور افادہ کی نسبت سے ملے۔ اور انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ ملتا قوموں کو وہی ہے جس کی وہ اہل ہوتی ہیں۔ ہم اگر کمزور ہیں تو اپنی کمزوری کو رفع کریں۔ جاہل ہیں تو تعلیم کے لئے اوروں سے زیادہ کوشش کریں، غریب ہیں تو اسراف کو روکیں، مقروض ہیں تو اتحادی بنکوں میں اوروں سے زیادہ دلچسپی لیں۔ آزادی کا ملنا کھیل نہیں اور اس کے لئے کوشش کئے بغیر اس میں ساجھی بننا بھی ناممکن ہے۔ کاش مسلمانوں کی قوت اپنی خیالی عظمت کو تسلیم کرانے کی اتھلی اور بے وزن کوششوں میں صرف ہونیکی جگہ اس عظمت کی بنیادیں مضبوط کرنے میں صرف ہو۔ اس لئے کہ جبتک یہ بنیادیں مضبوط نہیں اسوقت تک دستور اساسی کے مسودہ میں چاہے مسلمانوں کو کچھ بھی ملجائے لیکن حقیقت میں وہ وہی پائیں گے جو ہیں۔ اور انکے یہ اعلانات کہ وہ ہندوؤں سے بھی لڑ کر حق لیں گے اور انگریزوں کو بھی ملک سے نکال باہر کرینگے شیخیاں ہیں جن پر دشمن ہنستے ہیں اور دوست روتے۔

READ

ISLAMIC CULTURE

A FIRST CLASS QUARTERLY REVIEW

EDITED BY

MARMADUKE PICKTHALL.

IT CONTAINS ARTICLES OF HIGH INTEREST BY WELL-KNOWN AUTHORTHIES ON ISLAM, ITS HISTORY, ETHICS, LITERATURE, ARTS AND SOCIAL DEVELOPMENTS.

Content for July.

Vol: II—No 4

I. Islamic Jurisprudence and the Necessity for Reforms. By The late Rt Hon'ble Syed Ameer Ali, P. C., C. I. E.
II. Khushal Khan Khattack—The Afghan Warrior-Poet. By Sir Muhammad Iqbal.
III. The Earliest Biographies of the Prophet and their Authors (contd) By Professor Josef Horovitz.
IV. The Hidden Pearls concerning the Notables of the eighth Islamic Century. By F. Krenkow
V. New Light on Moghul India from Assamese Sources. By Professor S. K. Bhuyan.
VI. Aids to reading Persian MSS. in view of Editorial work. By Professor C. E. Wilson.
VII. The Renaissance of Islam—(contd). By S. Khuda Bukhsh, M. A., B. C. L., Bar-at-Law.
VIII. The Spiritual value of Islamic Architecture. By Professor E. E. Speight.
IX. The Real Alamgir—(contd). By Syed Hashimi.
X. BOOKS AND AUTHORS.
A Mighty work of Education.
The Early Heroes of Islam.
Teachers of India, etc. etc.

(Excellently produced with a beautiful coloured Picture, which will be given free to Annual Subscribers only.)

Annual Subscription, Indian. ...	Rs. 10/-
Annual Subscription, Foreign. ...	£ 1/1/-
Specimen copy	Rs. 2/12/-

(Including all Supplements & Regd. Postage).

A few copies of Vol: I composing of four numbers are still in stock, and can be obtained at the rate of Rs. 3 per copy, or Rs. 12/- for a complete set.

Aplpy to:—The Manager,
'ISLAMIC CULTURE'
CIVIL SERVICE HOUSE,
HYDRABAD, (Deccan).

A.H. Faruqi
1927.

رجسٹرڈ

نمبر ۱۸۵۲

جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

جلد ۱۱
بابت ماہ دسمبر سنہ ۱۹۲۸ء
نمبر ٦

"مجلہ مکتبہ"

۱۴/ دسمبر

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۱ بابتہ ماہ دسمبر ۱۹۲۸ء نمبر ۶

فہرست مضامین

۱۔ ضیاء الدین برنی	سید حسن برنی صاحب	۲
۲۔ غزل	مولانا شرف الدین صاحب	۴۸
۳۔ شمالی اور دکھنی اُردو کی علیحدگی	محی الدین قادری صاحب	۴۹
۴۔ حالات حج	مولانا محمد اسلم صاحب	۵۵
۵۔ کوہ مصوری (نظم)	مولانا سہیل صاحب	۷۰
۶۔ تنقید و تبصرہ		۷۳
۷۔ شذرات		

ضیاءُ الدین برنی

مصنف تاریخ فیروز شاہی

سالہا سال سے میں ہندوستان کے سب سے پہلے ہندوستانی مورخ اور اپنے ہم وطن بزرگ ضیاءالدین برنی مصنف تاریخ فیروز شاہی کے حالات زندگی اور اُسکی کتاب پر تبصرہ لکھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ سب سے پہلے میں نے اُس کی کتاب کا مطالعہ بہ زمانہ طالب علمی ۱۹۱۴ء ۱۹۱۵ء میں کیا تھا، جبکہ میں نے انگریزی زبان میں علیگڈھ کالج کی "انجمن تاریخی، Historical Society کے لئے ایک انعامی مضمون "مغلوں سے پہلے مسلمان سلاطین دہلی کے نظام حکومت" کے متعلق لکھا تھا۔ مطالعہ کے دوران میں کچھ معلومات اس مورخ کے متعلق بھی فراہم ہو گئیں۔ اس کے بعد جب میں دفتر مسلم یونیورسٹی و دفتر کلیات امیر خسرو کا مہتمم ہوا تو خسرو کی بعض کتابوں پر تنقید لکھنے اور خسرو کی سوانح عمری تیار کرنیکے خیال سے علاوہ دیگر تصانیف کے تاریخ فیروز شاہی بھی کئی برس زیر مطالعہ اور پیش نظر رہی۔ اس مطالعہ اور تحقیقات کی بدولت میرے پاس خسرو، اُس کے معاصرین اور اُسکے دور کے متعلق ایک معلومات اور تاریخی مواد کا انبار فراہم ہو گیا۔ جو ابھی تک زیادہ تر مسوّدوں کی شکل میں پڑا ہوا ہے۔ بالآخر اُس اسکیم نے اسلامی تاریخ ہند کے اس مخصوص دور کی جامع تاریخ کی شکل اختیار کر لی جسکا سیاسی مرکز علاءالدین خلجی کا عہد اور علمی و ادبی مرکز خسرو کی زندگی ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے میری آرزو بڑھتی جاتی ہے کہ وہ مواد جو کئی برس کی لگاتار محنت سے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تاریخی و ادبی ماخذ سے حاصل کیا گیا ہے مرتب شکل میں آجائے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میری یہ تمنا کب پوری ہو سکے گی۔ دس گیارہ برس سے وکالت کے مشاغل نے علمی [illegible]

کو پست اور دماغ کو فرسودہ و واماندہ کر دیا ہے اور قلم بھی بہت کچھ اپنی جولانیوں کو بھول چکا ہے حال ہی میں میں نے اُس انبار پر نظر ڈالی تو ارادہ ہوا کہ اُس سے استفادہ کر کے کوئی مضمون لکھا جائے۔ غور کرنیکے بعد "ضیاء الدین برنی" کو انتخاب کیا کہ وطنی تعلق سے خسرو کے معاصرین میں مقدم حق اسی مصنف کا ہے۔ ارادہ تو صرف ایک مختصر مضمون لکھنے کا تھا لیکن قلم ہاتھ میں لینے کے بعد یہ گوارا نہ ہوا کہ اپنے معیار کی رو سے مضمون کو تشنہ یا نامکمل چھوڑ دیا جائے۔ ایک ہی مبحث پر بار بار مطالعہ اور خامہ فرسائی کرنا بالعموم دشوار ہوتا ہے۔ میں نے بھی یہی چاہا کہ ضیائے برنی کے متعلق جو کچھ لکھنا ہے (بجز اُن مخصوص مباحث کے جو موجودہ مضمون کے لئے زیادہ مناسب معلوم نہیں ہوئے اور جنکی تصریح موقع پر کر دی گئی ہے) وہ سب ایک مرتبہ حوالہ قلم کر دیا جائے تاکہ یہ مطالعہ ایک حد تک مکمل ہو جائے۔

ہندوستان کی تاریخ وسیع اور جامع نقطۂ نظر سے لکھی جانی باقی ہے۔ اُسی سلسلہ میں ہمارے قدیم مورخین کی قدر و قیمت کا منصفانہ اندازہ از سر نو کرنا ناگزیر ہے علمی اور تاریخی تنقید ترقی کر کے کہیں سے کہیں پہنچی ہے، اگرچہ ہماری نادار زبان اُن میدانوں سے ابھی بہت دور ہے

ضیائے برنی کے لئے میں وطنی تعلق سے خاص محبت رکھتا ہوں۔ اور شکر ہے کہ میں نے اُسکے حالات اور اُسکی کتاب کی تنقید جو عرصہ سے لکھنا چاہتا تھا اسوقت مکمل کر دی ہے۔ اُس تعلق خاطر کے باوجود جو مجھے اس مصنف سے ہے میں نے اُس کی تصنیف کو ایک غیر جانبدار نقاد کی حیثیت سے جانچنے کی کوشش کی ہے میں نے اُس کے نقائص کے ظاہر کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں کیا ہے نہ اُس کے محاسن بتلانے میں کوئی کوتاہی کی ہے۔ جو کچھ لکھا ہے دیانت کو پیش نظر رکھا ہے کہ مورخ کا سب سے پہلا اور سب سے اخیر اور سب سے بڑا فرض راستبازی اور انصاف پسندی ہے۔ پھر بھی جہاں کہیں غلطی کی ہو ناظرین اُسے معاف فرما دیں۔

اس مضمون میں اکثر تاریخ فیروز شاہی کے حوالہ دئے گئے ہیں، اختصار کے خیال سے کتاب کا نام بار بار نہیں لکھا گیا ہے حوالجات بلاقید کتاب صرف بقید صفحات

ملیں وہ اسی کتابیں ہیں۔

تاریخ فیروز شاہی ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے ۱۸۶۲ء میں باہتمام سرسید احمد خاں مرحوم شائع کی تھی۔ اُسکا متن کسی صحیح نسخہ پر مبنی نہیں ہے اور اُس میں بہت زیادہ غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ مختلف نسخوں سے مقابلہ کے بعد ایک مستند متن تمہید، تعلیقات اور فہرستہائے اعلام وغیرہ کے ساتھ شائع کیا جائے

(سید حسن برنی)

ضیاء الدین برنی مصنف تاریخ فیروز شاہی ہندوستان کا پہلا ہندوستانی مورخ ہے۔(۱) ہندوستان میں تاریخ کا فن مسلمانوں کے ساتھ آیا۔ ضیائے برنی سے پہلے دو اور مورخ ہوئے ہیں جنہوں نے ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی تاریخ لکھی ان میں سے ایک کا نام صدر الدین محمد بن حسن نظامی نیشاپوری ہے۔ جو قطب الدین ایبک کے زمانہ میں ہندوستان میں آیا اور ۶۲۳ھ کے قریب زمانہ میں اُس نے اپنی کتاب تاج المآثر تصنیف کی جس میں غوریوں اور اُنکے جانشین سلاطین دہلی کے فتوحات التتمش کے عہد تک درج ہیں۔ اُس کے بعد ابو عمر منہاج الدین عثمان بن سراج الدین الجوزجانی ہوا، جس نے سلطان ناصر الدین محمود بن سلطان شمس الدین التتمش کے عہد میں ایک عام تاریخ لکھی۔ جس میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کا حال بھی ۶۵۰ھ / ۱۲۵۹-۶۰ء تک درج کیا۔ یہ دونوں مورخ جیسا کہ اُنکے ناموں سے بھی ظاہر ہے ہندوستان میں پیدا نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ باہر سے آئے تھے۔

حسن نظامی اور منہاج سے بھی پہلے غزنویوں کے دور میں ہندوستان کے متعلق جن مورخوں نے

---

(۱) برنی سے پہلے بعض مصنفین اور شعرا (مثلاً امیر خسرو) نے جو ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے تھے بعض ایسی کتابیں لکھی تھیں جن سے تاریخی معلومات دستیاب ہوتی ہیں، لیکن ان مصنفین اور شعرا کا نقطۂ نظر ادب اور انشا پردازی ہے نہ کہ فی الواقع تاریخ۔ اس لحاظ سے بعض اوقات یہ کتابیں تاریخی تحقیقات کے لئے ناگزیر اور نہایت بیش قیمت ثابت ہوتی ہیں لیکن انہیں باضابطہ کتب تواریخ کہنا جائز نہیں۔ امیر خسرو کی تصانیف نظم و نثر بالخصوص قیمتی تاریخی معلومات سے مملو ہیں لیکن اُنکا انداز بیان بھی شاعرانہ اور ادیبانہ ہے۔

کچھ لکھا تھا، وہ بھی ہندوستان کے نہ تھے۔ ابو ریحان البیرونی(۱) (متوفی ۴۴۰ھ ۱۰۴۸ء) صاحب کتاب الہند اور ابوالفضل بیہقی (متوفی ۴۷۰ھ ۔ ۱۰۷۷ء) صاحب تاریخ بیہقی (یا مجلدات بیہقی) اور ابونصر عتبی (متوفی بعد ۴۲۰ھ ۳۰-۱۰۲۹ء) صاحب تاریخ یمینی وسط ایشیا کے رہنے والے تھے۔ اور گو ان مورخین کا تعلق ہندوستان کی تاریخ سے بھی ہے لیکن ظاہر ہے کہ وہ کسی طرح ہندوستانی مورخ کہلائے جانے کے مستحق نہیں ہیں۔

ضیائے برنی، جیسا کہ اُس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے برن میں پیدا ہوا تھا جو ہمارے زمانہ میں بلند شہر کہلاتا ہے اور دوآب میں میرٹھ اور علیگڑھ کے مابین واقع ہے۔ آثار قدیمہ سے جو زمین کے نیچے سے برآمد ہوتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقام اُس زمانہ سے جبکہ بودھوں کو ہندوستان میں اقتدار اور عروج حاصل تھا آباد ہے۔ البیرونی نے کتاب الہند میں برن کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ حالانکہ قرب وجوار کے بعض مقامات کا ذکر موجود ہے۔ عتبی نے ۴۰۹ھ ۱۰۱۸-۱۹ء کے واقعات میں محمود غزنوی کی ہاتھوں ایک قلعہ کی فتح کا تذکرہ کیا ہے جس کا تلفظ مشتبہ ہے، لیکن بعض بعض محققین (مثلاً سر ہنری ایلیٹ(۲) Sir H. Elliot) نے برن پڑھا ہے اور محل وقوع کے لحاظ سے برن سے مطابق ہوتا ہے۔ عتبی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں یہ مقام ایک ہندو ریاست کی راجدھانی کی حیثیت رکھتا تھا۔ بعد کے زمانے میں محمد غوری کی فتوحات کے وقت برن کا قلعہ دوآب کے مضبوط قلعوں میں شمار ہوتا تھا۔ اور راجہ بھیم سین ڈور کا دارالحکومت تھا۔ یہ قلعہ خود محمد غوری کے ہاتھوں فتح ہوا۔ ہمارے پاس اصلی فرمان بطغرائے "ابوالمظفر سلطان محمد بن سام ناصر امیر المومنین" محفوظ ہے جس میں اس قلعہ کی فتح اور انتظامات مابعد کے حالات درج ہیں۔ انشاء اللہ کسی وقت اس بے نظیر شاہی فرمان کا عکس اور اُس پر تبصرہ ناظرین کی خدمت میں پیش کریں گے۔ طبقات ناصری

---

(۱) البیرونی کے حالات اور اُس کی تصانیف کی مفصل تنقید کے لئے دیکھو ہماری کتاب البیرونی مطبوعہ انجمن ترقی اردو طبع دوم ۱۹۲۶ء

(۲) دیکھو تاریخ ہند مرتبہ ایلیٹ وڈوسن جلد دوم صفحہ ۴۲

میں بھی برن کا ذکر کئی جگہ آیا ہے۔ سلطان شمس الدین التمش بھی تخت نشینی سے پہلے برن کا عامل رہا تھا، چنانچہ اُس کے زمانہ کے کچھ ٹوٹے پھوٹے کتبے جن کا خط قطب مینار اور مسجد قوۃ الاسلام کے کتبات کے خط سے ملتا ہے ابتک بلند شہر کی عیدگاہ میں نصب ہیں۔

برن کی فتح کے بعد حسب معمول چند شریف خاندان جن سے اُس زمانہ میں زیادہ تر شیوخ وسادات سے مراد ہوتی تھی اس مقام پر آباد ہوئے جنہیں مختلف مناصب اور عہدے دئے گئے۔ ان میں بعض خاندان اور اُنکے نسب نامے ہمارے زمانہ تک محفوظ ہیں۔

ضیائے برنی نے اپنی تاریخ میں کہیں کہیں ضمناً اپنا اور اپنے خاندان کا ذکر کیا ہے۔ گو ان بیانات سے اُس کے اور اُس کے خاندان کے حالات پر روشنی پڑتی ہے، لیکن اکثر وہ مزید تصریحات کے محتاج ہیں، اُس کے معاصرین میں یا یہ کہنا چاہئے کہ اُن مصنفین میں جو اُسے ذاتی طور پر جانتے تھے سید محمد مبارک العلوی الکرمانی المعروف یا میر خورد صاحب سیر الاولیا ہے جس نے اپنی کتاب میں خواجگان چشت بالخصوص شیخ نظام الدینؒ اور شیخ مذکور کے مریدین ومعتقدین کے حالات لکھے ہیں۔ اُس نے ضیائے برنی کا بھی تذکرہ بحیثیت شیخ کے یاران اعلیٰ کے درج کتاب کیا ہے جس سے بعض مفید معلومات دستیاب ہوتی ہیں۔ بعد کے مصنفین (مثلاً شیخ عبدالحق صاحب اخبار الاخیار) نے اسی تذکرہ سے ضیائے برنی کے حالات لئے ہیں۔ لیکن امیر خورد بھی اُس کے خاندان کے متعلق بجز اس کے کہ ضیائے برنی کا باپ ایک معزز خاندان (دودمان بزرگ) سے تھا اور کچھ نہیں بتاتا (دیکھو سیر الاولیا مطبوعہ مطبع محب ہند دہلی سنہ ۱۳۰۲ھ صفحہ ۳۱۲) ایسی حالت میں باوجود انتہائی کوششوں کے ہم اس بات کو ثابت نہیں کرسکتے کہ ضیائے برنی کا اُن شریف خاندانوں میں سے جو محمد غوری کی فتح کے بعد برن میں آباد ہوئے کس خاندان سے تعلق تھا اور اُس کے آبا واجداد برن میں کہاں سے آئے اور کس سنہ میں آباد ہوئے۔

ایک بات ضیائے برنی کے بیانات سے ثابت ہے۔ اُسکا جدی سلسلہ سادات سے تعلق نہیں رکھتا تھا لیکن اُس کی ماں اور دادی سیدانیاں تھیں۔ یہ بھی ثابت ہے کہ اُسکا خاندان نہایت معزز خاندان تھا اور اگرچہ اس کی تصریح نہیں پائی جاتی، لیکن اس خیال سے کہ ماں اور دادی سیدانیاں تھیں ہمارا یقین ہے کہ وہ نسباً

شیخ تھا۔

ضیائے برنی نے اپنے دادا کا نام نہیں لکھا ہے لیکن یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ وزرائے شاہی میں شمار ہوتا تھا۔ ایک موقع پر سلطان علاءالدین خلجی نے ضیائے برنی کے چچا علاءالملک کو اپنے امرا کے سامنے "وزیرزادہ" بیان کیا ہے (صفحہ ۲۵۷) اور خود ضیائے برنی اپنے باپ کے متعلق لکھتا ہے:۔

"پدر ایں ضعیف شریف بود" (صفحہ ۳۵۰)

ضیائے برنی کے باپ کا نام موید الملک تھا، جو فی الواقع اصلی نام نہیں بلکہ شاہی خطاب معلوم ہوتا ہے اسی طرح موید الملک کا ایک بھائی علاءالملک تھا، جس نے علاءالدین خلجی کے زمانہ میں بڑا عروج حاصل کیا۔ موید الملک اور علاءالملک کا نانا سپہ سالار حسام الملک تھا، جو بلبن کے عہد میں ابتداءً "وکیل دربار یک سلطانی" کے عہدہ پر فائز تھا (صفحہ ۴۱) اور بعد میں فتح بنگال کے وقت سلطان بلبن نے بنگال کے دارالسلطنت لکھنوتی کی شحنگی اس کے سپرد کر دی تھی۔ خود بلبن لشکرکشی کے لئے آگے بڑھ گیا اور حسام الملک کو ہدایت کر گیا کہ دہلی کے حالات اور ملوک و امرائے دہلی کی عرضداشتیں وصول کر کے بادشاہ کے پاس بھیجتا رہے (صفحہ ۸۷)

ضیائے برنی کی ماں سید جلال الدین کیتھلی کی بیٹی تھی۔ اُس زمانہ میں کیتھل (واقع ضلع کرنال پنجاب) کے سادات بڑے مستند سمجھے جاتے تھے۔ ضیائے برنی لکھتا ہے:۔

> "و بزرگی سادات کیتھل و صحت نسب ایشاں از مشاہیر است۔ و پدر موئف بنیۂ دختریں سید جلال الدین کیتھلی است، و سید جلال الدین از عظام و کرام سادات کیتھل بودہ است۔ و پدر ایں ضعیف شریف بود، و جدۂ ایں ضعیف سیدہ صاحبۂ کشف و کرامت بودہ است، و چندیں عفاف را کرامت در مشاہدہ شدہ" (صفحہ ۳۵۰)

ضیائے برنی کا باپ موید الملک ابتداءً جلال الدین خلجی کے عہد میں اُس کے منجھلے بیٹے ارکلی خاں کا نائب تھا، اور ضیائے برنی کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ضیائے برنی کی طفولیت کا زمانہ سن شعور سے دہلی میں گذرا۔ اُس کا باپ کیلوکھری میں، جو شہر نو بھی کہلاتا تھا اور اُس نواح میں واقع تھا، جہاں آج کل ہمایوں کا مقبرہ ہے) ایک عالیشان مکان میں رہتا تھا۔ معزالدین کیقباد نے اپنے زمانہ میں ایک خوشنما محل

تعمیر کیا تھا ۔ جو کیلوکھری میں واقع تھا اور جلال الدین خلجی نے کیلوکھری کو اپنا پایۂ تخت قرار دے رکھا تھا جس کی وجہ سے وہ روز افزوں آبادی اور رونق پر تھا ۔ درباری تعلق کے باعث موید الملک نے بھی اپنا مکان کیلوکھری میں بنا رکھا تھا ۔ ضیائے برنی لکھتا ہے :۔

" ومنکہ مولف ام در عہد جلالی پدرم نائب ارکلی خاں بود خانہ در کلوکھری پس بلند رفیع برآوردہ
من از انجا با استادان و رفیقاں بزیارت سیدی مولہ می آمدم " (صفحہ ۲۰۹)

عہد جلالی میں ضیائے برنی کا چچا علاء الملک ، علاء الدین خلجی کے مصاحبین و معتمدین خاص میں سے تھا ۔ چنانچہ جب علاء الدین دکن کی سب سے پہلی مہم فتح دیوگیر کے لئے اپنے صدر مقام کڑہ سے روانہ ہوا ، تو کڑہ اور اودھ کا تمام انتظام علاء الملک کے ہاتھ میں دے گیا ۔

" در غیبت خود نیابت کڑہ داودہ بعم مولف ملک علاء الملک کہ از مختصان او بود تفویض کرد
(صفحہ ۲۲۲)

جلال الدین خلجی کے قتل میں علاء الدین کے ساتھ علاوہ اُس کے چند دیگر مصاحبین خاص کے علاء الملک بھی شریک تھا ۔ تخت نشینی کے بعد علاء الدین نے علاء الملک اور موید الملک کو اعلیٰ مناصب دئے ۔ موید الملک برن کا عامل مقرر ہوا (صفحہ ۲۴۸) اور علاء الملک کو کڑہ سے بلا کر دہلی کا کوتوال مقرر کیا گیا (صفحہ ۲۴۹ - ۲۵۰) ۔ علاء الملک نہایت موٹا تازہ آدمی تھا ۔ فربہی کی وجہ سے علاء الدین نے اُسے وزارت نہیں دی لیکن اپنے تمام وزراء اور مصاحبین میں اُسکی بڑی عزت کرتا اور اس کے مشوروں کو خاص وقعت دیتا تھا ۔ بعض اوقات اُس کے مشورے پر اپنے بڑے سے بڑے ارادہ کو تبدیل کر دیتا تھا ۔ علاء الملک بھی ہمیشہ صاف گوئی اور جرأت سے کام لیتا تھا ۔ ضیائے برنی نے لکھا ہے کہ اپنے ابتدائے عہد سلطنت میں علاء الدین بعض عجیب و غریب خیالات اپنے ذہن میں قائم کئے ہوئے تھا ، جن کا وہ اپنے امراء مصاحبین کے روبرو اظہار کیا کرتا تھا لیکن اُس کے خوف سے کوئی اس کے خیالات کی تردید یا اصلاح کی جرأت نہیں کرتا تھا ۔ وہ نبوت کا دعوے کرنے اور سکندر کی طرح عالمگیر فتوحات حاصل کرنے کا خیال رکھتا تھا ۔ علاء الملک نے نہایت دلیری کے ساتھ متنبہ کر کے اُسے ان ناقابل عمل اور فاسد خیالات سے باز رکھا ۔ اور اُسکی توجہ ہندوستان کے ملکی اور فوجی انتظامات و اصلاحات کیطرف

مائل کی (صفحہ ۲۶۲ - ۲۷۲)

علاء الدین اکثر افسوس کیا کرتا تھا کہ فرہی کی وجہ سے علاء الملک کو وزارت نہیں ملی۔ ایک موقع پر جبکہ مغلوں نے ہندوستان پر لشکر کشی کرکے دہلی کو آگھیرا تھا اور بڑا ہنگامہ برپا تھا اور ہندوستان کی اسلامی سلطنت معرض خطر میں تھی، علاء الملک نے علاء الدین کو بذات خود فوج کی سپہ سالاری کرنے سے منع کیا۔ علاء الدین جوکہ اول درجہ کا سپاہی اور بہادری اور سخت دلی میں دنیا کے معدودے چند انسانوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے، علاء الملک کی اس نصیحت پر مائل نہیں ہوا۔ باوجود اس کے اس نے علاء الملک کی خیرخواہی کا احسان مندی کے ساتھ اعتراف کرتے ہوئے اپنے امرا کو مخاطب کرکے حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علاء الملک کی کس قدر عزت کرتا تھا:۔

"شما می دانید کہ علاء الملک وزیر و وزیرزادہ است و ما را بندۂ مخلص و ہوا خواہ است و از ایام ملکی الی یومنا ہذا پیش ما رائے زنی کردہ است و ما بسبب فربہی او را کوتوالی دادہ ایم و الا حق او وزارت است" (صفحہ ۲۵۹)

اخیر میں علاء الملک کو مخاطب کرکے کہا:۔

"تو مردے نویسندہ و نویسندہ زادہ۔ ہر آئینہ در دل تو از ینہا گذرد کہ پیش من گفتی..... فاما ایں حالتے پیش آمدہ است کہ عقل را در گوشہ می باید نہاد، و جز خونریزی و خون ریختن و از سر جان خود برخاستن و تیغہا برہنہ کردن و با خصماں در آویختن کار ے و اندیشۂ دیگر نمی باید کرد" (صفحہ ۲۵۹)

اس محاربۂ عظیم کے لئے روانہ ہوتے وقت علاء الدین نے دارالملک دہلی اور اپنے عیال و اطفال کو علاء الملک کے سپرد کیا:۔

"در دوران ایام عم مولف ملک علاء الملک کہ از مختصان و رائے زنان سلطان علاء الدین بود و کوتوالی دارالملک دہلی داشت سلطان شہر و حرم و خزاین را بدو سپردہ بود و بر قصد حرب بزرگ از شہر بیروں آمد.... (صفحہ ۲۵۷)

یہ بات بالتحقیق معلوم نہیں ہوئی کہ موید الملک اور علاء الملک کا انتقال کس سنہ میں ہوا لیکن عہد علائی کے مابعد کے واقعات میں ان دونوں کا ذکر نہیں پایا جاتا۔ البتہ یہ ثابت ہے کہ علاء الملک کا عہد علائی کے ابتدائی تین چار برس کے اندر ہی انتقال ہو گیا تھا۔ چنانچہ ضیائے برنی لکھتا ہے:-

> "والغ خان و نصرت خان و ظفر خان و الپ خان و ملک علاء الملک عم مولف و ملک فخر الدین جونا دادبک و ملک اصغری سردواتدار و ملک تاج الدین کافوری کہ عمدۂ مملکت علائی بودند ہر یکے در پرداخت امور عظام ملکی نظیر خود نداشتند و از روئے ظاہر بینش آدمی زاد ایشاں در قتل و فریب سلطان جلال الدین باعث و یار بودند لاجرم از ملک علائی برخورداری نیافتند و بر سہ گان و چہارگان سال خرامیدند۔ فاما ایشاں در کارگذاری و کاردانی از آنہا بودند کہ بیک نگاہ زیر ایشاں ملکے و اقلیمے بدست آید و بیک رائے و رویت ایشاں فتنۂ حادث گشتہ مندفع گردد" (صفحہ ۳۳۶ - ۳۳۷)

ضیاء الدین برنی نے اپنی تاریخ ولادت کسی جگہ بیان نہیں کی، نہ میر خورد یا کسی اور تذکرہ نویس نے لکھی ہے۔ البتہ ضیائے برنی نے فیروز شاہی کی تصنیف کے وقت اپنی عمر ۷۴ سال بتائی ہے (صفحہ ۳، ۵) یہ کتاب ۷۵۸ھ میں لکھی گئی تھی۔ اس طرح ضیائے برنی کا سال ولادت ۶۸۴ھ بعہد سلطان غیاث الدین میں ہوتا ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ اُس کا مقام ولادت برن تھا، لیکن وہ اوائل عمر ہی سے اپنے باپ کے ساتھ جو ملازمت شاہی کا تعلق رکھتا تھا دہلی آگیا تھا۔

کیقباد کے عہد میں وہ خورد سال تھا، جلال الدین خلجی کے عہد میں وہ سن شعور کو پہنچا اور اُسی عہد میں اُس کی تعلیم شروع ہوئی۔ اُس نے اپنی تعلیم کے تفصیلی حالات تو بیان نہیں کئے، نہ یہ بتایا ہے کہ اُس نے کون کون سے علم میں کن کن اساتذہ سے درس لیا، البتہ اپنے اساتذہ کے متعلق اُس نے لکھا ہے کہ وہ علامہ روزگار تھے۔ (صفحہ ۱۲۷)

ضیائے برنی کا یہ لکھنا داخل مبالغہ نہیں معلوم ہوتا مغلوں کی یورش اور تسلط کی وجہ سی بلبن

ہی کے عہد سے وسط ایشیا کے بڑے بڑے فضلا ہندوستان میں آنے لگے تھے اور اکثر دہلی میں مقیم ہونے لگے تھے۔

عہد جلالی میں ضیائے برنی نے قرآن ختم کیا اور خط سیکھا۔

" من کہ مؤلف تاریخ فیروزشاہی ام در عہد جلالی قرآن تمام کردہ بودم و از مفردات گذشتہ و خط آموختہ " (صفحہ ۲۰۵)

بقیہ تعلیم علاء الدین کے عہد میں مکمل ہوئی۔ ضیائے برنی نے عہد علائی کے حالات میں ۴۶-۴۰ اُستاد گنائے ہیں، جن میں سے بعض سے اُس نے تلمذ کیا تھا، بعض کی خدمت میں پہنچا تھا۔ اور بیشتر کو مسند افادت یا مجالس میں دیکھا تھا۔ ہر چند کہ ان اساتذہ کے حالات اُس نے نہیں لکھے لیکن اس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام اپنے زمانہ کے نہایت بلند پایہ فضلا تھے:-

" و در تمامی عصر علائی در دارالملک دہلی علمائے بودند کہ آنچناں استاداں کہ ہر یکے علامۂ وقت بود در بخارا و در سمرقند و بغداد و مصر و خوارزم و دمشق و تبریز و سفاہان و رے و روم و در ربع مسکون نباشند و در ہر علمے کہ فرض کنند از منقولات و معقولات و تفسیر و فقہ و اصول فقہ، و معقولات، و اصول دین و نحو و لغت و معانی و بدیع و بیان و کلام و منطق موے می شگافتند و ہر سالے چندیں طالبان علم ازاں استادان سر آمدہ بدرجۂ افادت می رسیدند و مستحق جواب دادن فتوے می شدند و بعضے ازاں استادان در فنون علم و کمالات علوم بدرجۂ غزالی و رازی رسیدہ بودند " (صفحہ ۳۵۲-۳۵۳)

" من در پیش بعضے تلمذ کردہ ام و بخدمت بعضے رسیدہ و بیشترے را در مسند افادت و در مجالس و محافل دیدہ " (صفحہ ۳۵۴)

افسوس ہے کہ ضیائے برنی نے علمی اور ادبی تاریخ کو محفوظ رکھنے کی طرف پوری توجہ نہیں کی اور ہم اُس دور کے اکثر وابستگان علم کے متعلق انکے ناموں سے زیادہ کچھ نہیں جانتے۔ ہم سب نام نقل کر دیتے ہیں گو بدقسمتی سے متن کی خرابی کی وجہ سے بعض نام صحیح نہیں معلوم ہوتے۔ نسبتوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کافی تعداد میں ہندوستان ہی کے رہنے والے تھے اور فتح دہلی سے ایک صدی کے

اندر ہندوستان نے اسلامی تعلیم وتعلم میں اچھی ترقی کرلی تھی۔ ان میں سے مولٰنا افتخار الدین برنی ضیائے برنی کے ہموطن تھے:۔

(۱) قاضی فخرالدین ناقلہ (۲) قاضی شرف الدین سرباہی (؟) (۳) مولانا نصیرالدین غنی (۴) مولانا
تاج الدین مقدم (۵) مولٰنا ظہیرالدین لنگ (۶) قاضی مغیث الدین بیانہ (۷) مولٰنا رکن الدین سنامی
(۸) مولٰنا تاج الدین کلاہی (۹) مولٰنا ظہیرالدین بھکری (۱۰) قاضی محی الدین کاشانی (۱۱) مولٰنا کمال الدین
کولی (۱۲) مولٰنا وجیہ الدین پائلی (۱۳) مولٰنا منہاج الدین تابنی (؟) (۱۴) مولٰنا نظام الدین کلاہی (۱۵)
مولٰنا نصیرالدین کٹرہ (۱۶) مولٰنا نصیرالدین صابونی (؟) (۱۷) مولٰنا علاء الدین تاجر (۱۸) مولانا کریم الدین
جوہری (۱۹) مولٰنا حجت ملتانی قدیم (۲۰) مولٰنا حمیدالدین مخلص (۲۱) مولٰنا برہان الدین بھکری (۲۲)
مولٰنا افتخار الدین برنی (۲۳) مولٰنا حسام الدین سرخ (۲۴؟) مولٰنا وحیدالدین ملھور (۲۵) مولٰنا علاء الدین
کرک (؟) (۲۶) مولٰنا حسام الدین ابن شادی (۲۷) مولٰنا حمیدالدین بنیانی (۲۸) مولٰنا شہاب الدین
ملتانی (۲۹) مولٰنا فخرالدین ہانسوی (۳۰) مولٰنا فخرالدین سقاقل (؟) (۳۱) مولٰنا صلاح الدین سترکی (؟)
(۳۲) قاضی زین الدین ناقلہ (۳۳) مولٰنا وجیہ الدین رازی (۳۴) مولٰنا علاء الدین صدر الشریعہ (۳۵)
مولٰنا میران ماریکلہ (۳۶) مولٰنا نجیب الدین ساوی (۳۷) مولٰنا شمس الدین ثم (؟) (۳۸) مولٰنا
صدرالدین گندھک (؟) (۳۹) مولٰنا علاء الدین نوتیوری (۴۰) مولٰنا شمس الدین یحیی (۴۱) قاضی شمس الدین
گازرونی (۴۲) مولٰنا صدرالدین نادی (؟) (۴۳) مولٰنا معین الدین لونی (۴۴) مولٰنا افتخار الدین رازی
(۴۵) مولٰنا معزالدین اندھپتی (؟) (۴۶) مولٰنا نجم الدین انتشار (۴۷) مولٰنا علم الدین نبیسہ شیخ بہاء الدین ذکریا۔

اس میں کوئی کلام نہیں ہے کہ ہندوستان کے سلاطین تیموریہ سے پہلے عہد علائی سے بڑھکر کوئی زمانہ علمی وسیاسی حیثیت سے ممتاز نہیں رہا۔ خدا کی شان ہے ان دونوں دوروں کے دو سب سے بڑے فرمانروا علاء الدین خلجی اور جلال الدین اکبر قطعاً ناخواندہ تھے۔ ان دونوں بادشاہوں کے مزاجوں اور طبیعتوں میں بعد المشرقین ہے، لیکن دونوں جاہل بادشاہوں کے زمانہ میں علمی وادبی ترقیاں غیرمعمولی حیثیت رکھتی ہیں۔

بلاشبہ ضیاء الدین برنی کو تعلیم کے لئے بہت اچھا زمانہ نصیب ہوا، اُس کے خاندان میں پہلے ہی سے لکھنے پڑھنے کا رواج تھا اور اُسکا باپ اور اُسکا چچا دہلی کے سربرآوردہ امراء میں شمار ہوتے تھے۔ اس وجہ سے اُسے ہر قسم کی سہولتیں میسر تھیں۔

اُسکی تعلیم زیادہ تر مذہبی ہوئی اور اُس کے اوپر بچپن ہی سے تصوف کے خیالات کا گہرا اثر پڑا وہ بچپن میں بھی فقیروں سے ملنے کا شائق رہتا تھا۔ سب سے زیادہ اُس پر سلطان المشائخ شیخ نظام الدینؒ کا اثر تھا، جن سے اپنے باپ کے توسط سے ابتدائی عمر ہی سے ارادت حاصل ہوگئی تھی۔ یہانتک کہ وہ بالآخر غیاث پور میں جہاں شیخ موصوف رہتے تھے۔ سکونت پذیر ہوگیا اور شیخ موصوف کے مقربین خاص میں شمار ہونے لگا۔ میر خورد لکھتا ہے:-

> ”از ابتدائے بواسطۂ شفقت پدر بزرگوار کہ از دودمان بزرگے بود، بسعادتِ ارادت سلطان المشائخ مشرف گشت و سر اخلاص بر آستانہ آسمان سائے سلطان المشائخ نہادہ در غیاث پور ساکن شد و بخدمت سلطان المشائخ محلے و قربتے تمام یافت، چنانکہ در حسرت نامۂ خود کنایت کردہ است“ (سیر الاولیا صفحہ ۳۱۲ - ۳۱۳)

اُس نے اپنے عہد کے مشائخ کا خصوصیت اور عقیدت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اخیر عہد جلالی میں ایک فقیر سیدی مولہ تھا جس نے بڑا رسوخ اور اقتدار حاصل کیا تھا۔ عوام الناس کے علاوہ امراء اور اکابر کا اُس کے یہاں مجمع رہتا تھا۔ بادشاہ کو کسی نے اُس کی طرف سے مشتبہ کر دیا کہ اُسکے یہاں بادشاہ کے خلاف باغیانہ سازشیں ہوتی ہیں۔ اسی شبہ میں اُسے مروا ڈالا۔ ضیائے برنی بھی اس فقیر کو دیکھنے جایا کرتا تھا اور اُس نے اس فقیر کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں (صفحہ ۲۰۸ - ۲۱۲)

> ”منکہ مولف ام در عہد جلالی پدرم نائب ارکلی خاں بود، و خانہ در کیلوکھری بس بلند و رفیع برآوردہ۔ من از آنجا با اوستاداں و رفیقاں بزیارت سیدی مولہ می آمدم، و او را زیارت کردہ ام و ہم لقمہ شدہ ام“ (صفحہ ۲۰۹)

اس فقیر کے قتل کے بعد بعض غیر معمولی واقعات پیش آئے اور کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ جلال الدین

اور اُسکا خاندان علاء الدین کے ہاتھوں نیست و نابود ہوگئے ان تمام واقعات کو ضیاء الدین برنی کی ذہنیت سیدی مولہ کے خون ناحق کا نتیجہ قرار دیتی ہے :-

"ومنکہ مولف ام یاد دارم کہ روز قتل سیدی مولہ بادے سیاہ برخاست، کہ عالم تاریک شد و بعد قتل سیدی مولہ ملک جلالی در فتور گرفت، کہ بزرگان گفتہ اند درویش کشتن شوم باشد و ہیچ بادشاہ رانیکو نیامدہ است۔ و ہم درآں نزدیکے کہ مولہ کشتہ شد امساک باراں شد و در دہلی قحط افتاد و غلہ بیک جیتل سیرے رسید، و در زمین سوالک قطرہ باراں نچکید ہندواں آں زمیں با زن و بچہ در دہلی می آمدند، و بستگان دسی گان یکجا می شدند و در گرسنگی خود را در آب جون می انداختند و غرق می شدند۔ از سلطان و امرا فقرا و مساکین صدقات بر سبیل روزمرہ می یافتند" (صفحہ ۲۱۲)

جہاں ضیائے برنی کو علوم دینی اور تصوف کی طرف میلان خاص ہے وہیں علوم عقلی (فلسفہ وغیرہ) سے اُسے ایک گونہ نفرت ہے جسکا اظہار اس نے جابجا کیا ہے (صفحہ ۴۲ و ۴۶۵)

باوجود مذہبی اور صوفیانہ اثرات کے جو شروع سے اُس پر پڑے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ وہ جوانی کے زمانہ میں زندگی کی آزادیوں سے ناآشنا رہا، خود اُس کے بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ وہ دار الملک کی رنگین صحبتوں اور مجالس عیش و عشرت اور رقص و سرود میں عنفوان شباب ہی سے حصہ لیتا تھا۔ اور بڑھاپے میں اُن کی یاد اُسے بیچین کردیتی تھی۔ اُس نے عہد کیقباد، عہد جلالی اور عہد علائی کی عیش و عشرت مجالس رقص و سرود، ساقیاں ماہرو اور مطربان خوشنوا کا تذکرہ بڑی دلچسپی کے ساتھ لکھا ہے(۱)۔ ایک موقع پر وہ لکھتا ہے کہ خود اس کے یہاں بہت سے ارباب نشاط نوکر تھے، اور جوانی خوب عیش و عشرت میں گذرتی تھی :-

"در چنیں ہنگامیکہ از پیری و ضعیفی یک دنداں در دہم نماندہ است، و پریشاں خاطر و دشمن کام گشتہ ام و در لگدکوب دشمنان و حاسداں پست شدہ، جوانیہا از سر یاد می آید،

---

(۱) دیکھو صفحہ ۱۵۶ و ۱۶۵ و ۱۶۹ و ۲۰۱ و ۳۶۵

ومجلسہا و عیشہائے گذشتہ کہ درمیانی عالی ہمتاں و بزرگ نشاں گذرانیدہ ام و در مجلس من خجستہ بیاناں و خوب طبعاں و ظریفان بے بدل و خوبرویان طاق و گلعذاراں سیمیں ساق و ساقیان سرو قد و امردان شکر لب و مطربان ستشنی و غزلخوانان ممتاز بسیار بودندے در دلم می خلد، و امروز چہ از قحط طوائف مذکور و چہ از بے سیمی و بے زری در کنج محنت و گوشہ مذلت خوار و زار و بیمقدار و بے خریدار ماندہ ام چہ کنم" (صفحہ ۱۶۵)

جلال الدین کی مجلسوں ساقیوں اور مطربوں کا تذکرہ لکھنے کے بعد اخیر میں لکھتا ہے :-

" و من پیر گمراہ کہ در تیہ ناکامی متحیر گشتہ ام و نفسے و دمے ماندہ، در زمانے کہ وصف مجلس مذکورے نوشتم خواستم کہ بیاد آں جواناں جان نواز و آں مہ پیکراں ناز نازکہ بعضے از ایشاں را بناز و کرشمہ ایشاں را دیدہ بودم و سرود ایشاں شنیدہ و با گفتن ایشاں مشاہدہ کردہ زنار بربندم و ٹیکہ برہمنان در پیشانی لعنت خود کشم و روئے خود را سیاہ کنم و در تعزیت و مصیبت آں شاہاں جہان حسن و آں آفتابان آسمان خوبی در کوچہ و بازار افتم و فضیحت و رسوا شوم و بعد شصت سال از فقدان ایشاں نوحہ کناں و جامہ دراں و سر بر پیش بروم و در زیر پائے گور ایشاں جاں دہم" (صفحہ ۲۰۰)

ضیائے برنی کے حالات زندگی ہمیں بہت کم معلوم ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کا باپ کب تک برن میں عامل رہا اور اس زمانہ میں ضیائے برنی کہاں رہا۔ عہد جلالی کے اختتام پر اس کی عمر گیارہ برس کی تھی۔ عہد علائی میں اس کے عنفوان شباب اور جوانی کے ایام گذرے اور اسی زمانہ میں اس نے تعلیم پائی۔ ہم نہیں بتلا سکتے کہ محمد تغلق کے عہد تک اس کا کیا شغل رہا۔ صرف اس قدر معلوم ہے کہ وہ دار السلطنت کی بہترین صحبتوں میں حصہ لیتا تھا اور اس عہد کے سرآوردہ اشخاص سے تعلقات رکھتا تھا۔ اس نے خصوصیت کے ساتھ امیر خسرو اور حسن علائے سنجری کے ساتھ اپنی دوستی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ امیر خسرو اور حسن کے باہمی ملاقات اور دوستی کا باعث ضیائے برنی ہوا:-

" و سالہا مرا با امیر خسرو و امیر حسن مذکور تودد و یگانگی بودہ است، و نہ ایشاں بے صحبت من

بتوانستندے و نہ من توانستمے کہ مجالست ایشاں را گذرانم، و از محبت من میان ایشاں ہر دو اُستاد قرابتے شد، و در خانہائے یکدگر آمد و شد کردن گرفتند" (صفحہ ۳۶۰)

علاء الدین کا عہد تاریخ کے اُن زمانوں میں سے ہے جو اپنے حالات کے لحاظ سے "عظیم الشان دور" کہلاتے ہیں اور جن کے اندر نامعلوم طریقوں سے بڑے بڑے واقعات رونما ہوتے ہیں اور بڑی بڑی شخصیتیں زندگی کے مختلف شعبوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ ان شخصیتوں کے اجتماع میں کسی اہتمام و قصد کو دخل نہ تھا نہ انکی اپنے زمانہ میں پوری قدر ہوئی :-

"چندیں استادان و ماہران ہر علمے و ہنرے در عصر علائی جمع شدہ بودند و دار الملک او از چناں بے نظیران عدیم المثال آراستہ و پیراستہ گشتہ و او را در اجتماع ایشاں ہیچ اہتمامے و تصدے نبودہ است، و حق استحقاق بے نظیری و بے بدلی ہیچ اُستادے و ماہرے نگذارد است" (صفحہ ۳۶۵)

خسرو کا ذکر ضیائے برنی نے جوش اور محبت کے ساتھ کیا ہے لیکن جو کچھ اس عجیب و غریب شخص کے متعلق لکھا ہے مبالغہ نہیں ہے:-

"امیر خسرو کہ خسرو شاعران سلف و خلف بودہ است، و در اختراع معانی و کثرت تصنیفات و کشف رموز غریب نظیرِ خود نداشت، و اگر استادان نظم و نثر در یک دو فن بے ہمتا بودند امیر خسرو در جمیع فنون ممتاز و مستثنیٰ بود۔ ہمچناں ذو فنونے کہ در جمیع منہائے شاعری بسر آمدہ و استاد باشد در سلف نبود و در خلف تا قیامت پیدا آید یا نیاید۔ و امیر خسرو در نظم و نثر یکی کتاب خانہ تصنیف کردہ است و داد سخنوری دادہ۔ و خواجہ سنائی مگر در حق امیر خسرو گفتہ است۔ بیت

بخدا ار بزیر چرخ کبود ہمچو او ہست و بود و خواہد بود

و مع ذلک الفضل والکمال والفنون والبلاغ۔ صوفی مستقیم الحال بود و بیشترے عمر او در صیام و قیام و تعبد و قرآن خوانی گذشتہ است، و بطاعات معتدبہ و لازمہ یگانہ شدہ بو

ودائم روزه داشتے ، واز مریدان خاصۂ شیخ بود ، وآنچناں مریدے معتقد من دیگرے را ندیده ام ، واز عشق ومحبت نصیبے تمام داشت وصاحب سماع وصاحب وجد وصاحب حال بوده ودر علم موسیقی گفتن وساختن کمالے داشت ، وہرچہ نسبت بطبع لطیف وموزوں کنند باری تعالیٰ اورا دراں ہنر سرآمده گردانیده بود ، ووجودے عدیم المثال آفریده ودر قرون مناظره از نوادر اعصار پیدا آورده " (صفحہ ۳۵۹)

اس کے بعد حسن کا تذکرہ اس طرح لکھتا ہے :-

"اورا تالیفات نظم بسیار است وبسلاستی ترکیب وروانی سخن آیت بوده است ، واز بسکہ غزلہائے وجدانی ورعایت روانی بسیار گفتہ است اورا سعدی ہندوستان خطاب شده بود ، وامیر حسن مذکور باوصاف واخلاق مرضیہ متصف بوده است وبعزت خداوندان مکارم اخلاق کہ در لطائف وظرائف ومجلسہا واستحضار اخبار سلاطین واکابر وعلمائے بزرگ دہلی واستقامت عقل وزی ذزیست صوفیہ ولزوم قناعت ، واعتقاد پاکیزه وخوش گذرانیدن بے اسباب دنیا تجرد وتفرد از علایق دنیا ہمچوں او کسے را کمتر دیده ام ..... واز نہایت اعتقادے کہ امیر حسن بخدمت شیخ داشت آنچہ در مدت ارادت خود در مجالس شیخ از الفاظ شیخ شنیده است عین ملفوظ شیخ در چند جلد جمع کرده است وآنرا فوائد الفواد نام نہاده ، و دریں ایام فوائد الفواد دستور صادقاں ارادت شده است وامیر حسن را نیز چند دیوان است وصحائف بہ نثر ومثنویات بسیار است وچناں شیریں مجلس وظریف وخوش باش ومزاجداں مودب ومہذب بود کہ ما راحتے وانسے کہ از مجالست او می شد از مجالست غیر او نیافتم" (صفحہ ۳۵۹-۳۶۰)

آدمی اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے ، ضیائے برنی اپنے زمانہ کے بہترین اشخاص سے دوستی رکھتا تھا اور اس کی ذہنی تربیت پر انکا بڑا اثر پڑا۔

محمد تغلق (۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء - ۷۵۲ھ/۱۳۵۱ء) دنیا کے عجیب ترین بادشاہوں میں ہوا ہے ، جس کے اوصاف متضاده اس کے معاصرین ونیز مورخین مابعد کی حیرت کا باعث ہیں۔ ضیائے برنی اپنی لطافت طبع اور

مہارت فن ندیمی کی بدولت اس بادشاہ کے مقربین خاص میں داخل ہوا اور سترہ اٹھارہ برس اُس کی صحبت وتقرب میں گذارے۔ میر خورد لکھتا ہے :۔

> "بواسطۂ لطافت طبع کہ در زمان خویش در فن ندیمی زیر کبودی آسمان مثل نداشت، بخدمت سلطان محمد . . . ممکن ومبجل گشت واز دولت او ازیں دنیائے غدار ومکار بیوفا حظے وافر ونصیبے کامل گرفت" (صفحہ ۳۱۲ سیر الاولیا)

ضیائے برنی نے کئی موقعوں پر محمد تغلق کے عہد میں اپنا ذکر کیا ہے، اس کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد تغلق اس پر بہت زیادہ مہربان تھا اور اُس پر نہایت اعتماد کرتا اور سلطنت کے پیچیدہ معاملات میں مشورہ لیتا تھا:۔

> "من در دنیا پروردہ وبرآوردۂ سلطان محمدام، وآنچہ از اکرام وانعام او یافتہ بودم نہ پیش ازاں دیدہ بودم نہ بعد از و بخواب می بینم" (صفحہ ۴۹۷)

ایک دوسرے موقع پر لکھتا ہے :۔

> "ومن کہ مولف تاریخ فیروزشاہیم ہفدہ سال وسہ ماہ ملازم درگاہ سلطان محمد بودم وانعامات وافرہ وصدقات متواترہ وزرہا یافتہ از مشاہدۂ اوصاف متضادۂ آں بادشاہ کہ از عجائب عالم آفرینش در وجود آمدہ بود متحیر می مانم" (صفحہ ۵۰۴)

ایک دفعہ سلطان نے جبکہ اُس کے اخیر عہد میں چاروں طرف سے شورشیں اور بغاوتیں بپا تھیں جن کی وجہ سے نہایت متردد رہتا تھا اور اُس کی سمجھ میں کوئی تدبیر نہیں آتی تھی۔ ضیائے برنی کو رات کے پچھلے پہر بلا کر مشورہ کیا اور تدبیر دریافت کی۔

> "دوراں چہار پنج روز ماہ رمضان کہ سلطان محمد در قصبہ سلطان پور د تفہ کردہ بود در آخر شب داعی ضعیف ضیائے برنی را طلب شد وبندہ را سلطان فرمود کہ فلاں می بینی کہ چہ فتنہا می زاید . . . بعد ازاں سلطان بندہ را فرمود کہ تواریخ بسیار خواندۂ جائے خواندہ کہ بادشاہاں در چند جرم سیاست کردہ اند" (صفحہ ۵۰۹)

بادشاہ کے دریافت کرنے پر ضیائے برنی نے تاریخ خسروی کے حوالہ سے جمشید کا قول بیان کیا کہ سات موقعوں پر بادشاہوں کے لئے سیاست جایز ہے۔ اس فلسفۂ تعزیرات کو جمشید کیطرف منسوب کیا گیا ہے لیکن ہمیں کوئی شبہ نہیں کہ وہ خود ضیائے برنی کے زمانہ کے فلسفۂ سیاست و تعزیرات کو ظاہر کرتا ہے:-

یکے آنکہ اگر یکے از دین حق بگذرد و براں مصر ماند . . . .

دوم آنکہ ہرکہ یکے را عمداً از مطیعان بکشد . . . .

سوم آنکہ ہرکہ را زنے باشد و او بازن دیگرے سفاح کند . . . .

چہارم آنکہ ہرکہ با بادشاہ غدر اندیشیدہ و غدر او تحقیق شود . . . .

پنجم آنکہ ہرکہ سر غنہ بغی شود و بغی را مباشرت نماید

ششم آنکہ ہرکہ از رعیت بادشاہ یار دشمن و مخالف و ہمسر بادشاہ شود و او را برسانیدن خبر و اسلحہ و جزاں مدد و معونت کند و مدد و معونت او محقق گردد

ہفتم آنکہ ہرکہ بیفرمانی بادشاہ کند، بیفرمانی کہ ثمرات بیفرمانی زیان ملک بادشاہ باشد نہ در بیفرمانیہائے دیگر . . . . .

> "ودریں سیاست زیاں ملک شرط است، زیراچہ بندگان خدائے خدا را بیفرمانی می کنند بادشاہ را کہ نایب اوست بیفرمانی کنند چہ شود، اما در بیفرمانی کہ دراں بیفرمانی زیاں ملک و دولت بادشاہ با بار آرد، اگر بادشاہ در چنیں بیفرمانی سیاست نکند ملک را بباد دہد"

اس انتخاب کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نظری حیثیت اُس دور کے اہل نظر جانتے تھے کہ "مفاد عامہ" یا "مصالح خلق اللہ"، ہی پر بادشاہ کی تعزیری اختیارات بنی تھے اور اُن سے متجاوز ہونیکا بادشاہ کو اختیار نہ تھا اصولاً اطاعت خدا کے لئے واجب سمجھی جاتی تھی۔ بادشاہ خدا کا نایب مانا جاتا تھا حقیقی اطاعت سوائے خدا کے بندہ کے لئے جایز نہیں مانی جاتی تھی لیکن بادشاہ کو رعایا سے اطاعت کا حق اس وقت تک حاصل تھا جبتک کہ وہ مصالح ملکی کو پیش نظر رکھے۔ افسوس ہے کہ اس قسم کے نظریوں پر اُس زمانہ میں عمل نہیں ہوتا تھا اور مطلق العنان

بادشاہ نہایت غیر ذمہ دارانہ طور پر سلطنت کرتے تھے کوئی چون و چرا کرنیکا حقدار نہ سمجھا جاتا تھا اور اگر چون و چرا کرتا تھا تو گردن زدنی قرار پاتا تھا۔ خود محمد تغلق کی مثال ہمارے سامنے ہے وہ خونریزی اور جباری کا دیو مجسم تھا۔ ضیائے برنی نے اُسے جمشید کے الفاظ میں جتانا چاہا کہ بعض نافرمانی پر خلق اللہ کو قتل کر ڈالنا حق بجانب نہیں ہے، مگر اس پر اس نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور اُس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "یہ پہلے زمانے کی باتیں ہیں اب لوگ نہایت شریر اور فتنہ پرداز و مکار رہیں میں اس وقت تک خونریزی سے دست بردار نہ ہوں گا جب تک کہ یا میں نہ رہوں یا لوگ ٹھیک نہ ہو جائیں۔

> "سلطان فرمود سیاستے کہ جمشید فرمودہ است آں در اول ازمنہ بودہ است و دریں عہد مردم شریر و بیفرماناں بسیار پیدا آمدہ ...... باندک بیفرمانی کہ از خلق صادر می شود ہم ایشاں را می کشم و ہم چنیں سیاست می کنم تا آں وم یا من تلف شدم و یا خلق راست ایستند و ترک بغی و بیفرمانی کنند" (صفحہ ۵۱۱)

ضیائے برنی نے اُسے یہ بھی سمجھایا کہ بادشاہ وزیروں کا انتخاب بھی اس غرض سے کرتے ہیں کہ وہ قوانین وضع کر کے بادشاہوں کو خونریزی سے محفوظ رکھیں، لیکن اسکا جواب سلطان محمد نے یہ دیدیا کہ مجھے ایسا وزیر نہیں ملتا جو ضوابط وضع کر سکے:۔

> "جمشید مذکور گفتہ است کہ پادشاہاں کہ وزیراں را گزیدہ اند ... سبب آں است کہ وزیراں در ملک پادشاہاں ضابطہا پیدا آوردہ اند و مستقیم گردانیدہ کہ از اعمال آں ضوابط دست پادشاہاں در خون ہیچ آفریدہ آلودہ گشتہ است سلطان فرمود .... من آں چناں وزیرے ندارم کہ در ملک من ضوابطے پیدا آرد کہ مرا دست بخون کش نباید آلود" (صفحہ ۵۱۱)

سچ ہے خوئے بد را بہانہ بسیار۔ ایک دوسرے موقع پر جبکہ ضیائے برنی امرائے سلطنت کیطرف سے فتح دیوگر کی مبارکباد دے کر سلطان محمد تغلق کے پاس گیا ہوا تھا اور بادشاہ کے ہم رکاب بھروچ کیطرف جا رہا تھا، بادشاہ نے سلطنت کی شوریدہ حالت بیان کر کے اس کا علاج دریافت کیا لیکن بیچارہ مورخ خوف کیوجہ سے بادشاہ کو نہ بتا سکا کہ یہ سب کچھ اُس کی سفاکیوں اور بیجا خونریزیوں کی وجہ سے تھا:۔

"در ان ایام که سلطان محمد از گهٹی ساکوں فرود آمد و یک دو منزل سمت بهروچ قطع کرد از شہر (دہلی) بخدمت سلطان پیوستم و عرضداشت و خدمتی مبارکباد فتح دیوگیر که خداوند عالم پادشاه عصر و زماں و ملک کبیر و احمد ایاز (وزیر) که از شہر بدست من فرستاده بودند بخدمت سلطان رسانیدم و سلطان مرا بسیار نوازش فرمود۔

روزے من در رکاب سلطان می رفتم و سلطان با من حکایت کناں می رفت که حکایت بغاة در میان افتاد و سلطان مرا گفت که می بینی امیراں صده حرامخور چگونہ فتنہا می انگیزند و اگر من یک جانے فراہم می آرم و شر ایشاں دفع می کنم از طرفے دیگر بلا می انگیزند که اگر من در اول بفرمودے که بیکبارگی امیران صده دیوگیر و گجرات و بھروچ را از میاں بردارند چندیں در ماندگیہا از ایشاں مرا پیش نیامدے و ہمیں طغی حرامخور را که غلام من است اگر من سیاست فرمودے یا او را بیادگار بر بادشاه علی بفرستادے ایں فتنہ و بغی از و در وجود نیامدے و من نتوانستم که در بندگی سلطان عرضداشت کنم که ایں ہمہ بلاہا و فتنہ ہا که از ہر چہار طرف میزاید و تنفر عام روی نموده است از نتیجہ کثرت سیاست سلطانی است که اگر سیاست را چندگاه توقف دارند باشد که فراہمی پیدا آید و از سینہ خواص و عوام نفر کم شود۔ از تغیر مزاج سلطان بترسیدم و شمن مذکور عرضداشت کردن نتوانستم و با خود گفتم یا چہ حکمت است که ہماں چیزے که واسطۂ خرابی و ابتری ملک گشتہ است در سینۂ سلطان محمد از برائے فراہمی و التیامی ملک و دولت جلوه می کند" (صفحہ ۵۱۶-۵۱۷)

اخیر زمانہ میں جب کہ دکن میں حسن کانگو نے دیوگیر کو اپنے قبضہ میں کر کے دکن کی خود مختار بہمنی سلطنت کی بنیادیں ڈال دی تھیں سلطان محمد نہایت پریشان و حیران رہتا تھا، اُس نے پھر ایک مرتبہ ضیائے برنی کو بلا کر مشورہ طلب کیا۔ مورخ نے جو اصلی سبب جانتا تھا کنایۃً یہ مشورہ دیا کہ بادشاہ سلطنت سے دست بردار ہو کر گوشہ نشین ہو جائے اور کسی دوسرے کو سلطنت سپرد کر دے، لیکن سلطان محمد نے جواب دیا کہ وہ خود بھی اس قسم کا ارادہ رکھتا تھا لیکن قبل اس کے کہ وہ ایسا کرے وہ چاہتا ہے کہ تلوار سے لوگوں کو سیدھا کر لے!۔

> "دوراں ایام کہ سلطان محمد از فتنہ دیوگیر منقسم خاطر می بود روزے منکہ مولف تاریخ فیروزشاہیم در پیش تخت طلب شدم و سلطان ایں ضعیف را می گفت کہ ملک ما مریض گشت و بہر تداوی مرض نمی رود . . . . . و مرا فرمود کہ بادشاہان مقدم دریں امراض ملکی چہ فرمودہ اند۔ بندہ عرضہ داشت کرد کہ در کتب تواریخ علاجے کہ بادشاہان متقدم امراض ملکی را کردہ اند بانواع نوشتہ اند، بعضے سلاطین چوں دیدہ اند کہ اعتماد رعایائے از ایشاں خاستہ است و تنفر عام بار آوردہ دریں صورت دست از جہانبانے برداشتہ اند و بہ پسرے از پسران شایستہ ہم در حیات خود بادشاہی تفویض فرمودہ . . . . . و از جملہ امراض ملکی یک مرض بزرگ و مہلک تنفر خواص و عوام مملکت و نا اعتمادی عامہ رعایاست۔ سلطان جواب فرمود کہ من می خواستم کہ اگر کارہائے ممالک من چنانچہ خواست دل من است فراہم آید ممالک دہلی را بدیں سہ کس یعنی بادشاہ عہد و زمان فیروزشاہ السلطان و ملک کبیر و احمد ایاز بسپاردم و من در خانہ کعبہ روم۔ فاما دریں ایام من از خلق آزردہ شدم و خلق از من آزار گرفت . . . . علاج من در باب باغیاں و بیفرماناں و مخالفاں و بدخواہاں تیغ است . . . . (صفحہ ۵۲۱-۵۲۲)

اس ظالم مگر فیاض بادشاہ کے ساتھ نبھاؤ کرنا کچھ آسان کام نہیں تھا۔ ضیائے برنی نے جو اُسے بخوبی جانتا تھا اُس کی سیرت کی مکمل تصویر کھینچی ہے، اور اس کے بیانات کی تصدیق ابن بطوطہ کے بیانات سے پورے طور پر ہوتی ہے۔ وہ دنیا کے عجیب ترین اشخاص میں سے ہوا ہے، وہ نہایت عالی ہمت، سیر چشم، پابند مراسم مذہبی، مجتنب از ہمہ قسم مستی و فجور، فنون شہسواری و مردانگی میں طاق۔ اختراعات بدیعہ فراست و درآیت، تقریر و تحریر، خوبی خط اور حافظہ میں ممتاز تھا، وہ علوم عقلی کا خاص طور پر دلدادہ تھا اور ضیائے برنی کی رائے میں معقولات کی شگفتگی اُس کی شقاوت و سفاکی کا باعث ہوئی۔ ضیائے برنی لکھتا ہے:-

> "باچندیں فضائل و بزرگی و سروری و علو ہمت و فراست و درایت و شجاعت و سخاوت و ہنرمندی و خردمندی . . . . در عنفوان شباب و ہنگام فہم و ادراک آں . . . . را با سعد منطقی بدمذہب و عبید شاعر بد اعتقاد و نجم انتشار فلسفی صحبت و مجالست افتاد۔ آمد و شد مولنا علم الدین کہ اعلم

> فلاسفہ بود در خلوت او بسیار شد۔ و آں ناجوانمرداں . . . . در مباحثہ و مکالمہ و نشست و خاست علم معقولات را . . . . در خاطر سلطان محمد چناں بنشاندند کہ منقولات کتب سماوی و احادیث انبیا را . . . . چنانچہ باید و شاید جائے نماند۔ و ہر چہ بر خلاف معقول بود نشنیدے و یقین در خاطر مبارک او نہ نشستے . . . . . از جہت آں کہ معقولات فلاسفہ کہ مایۂ قساوت و سنگدلی است تمامی دل او را فرا گرفتہ بود و منقولات کتب سماوی و احادیث انبیا را کہ معدن رقت و مسکینیت و مخوف عقاب گوناگوں عقوبت است و خاطرش مدخلے نماندہ بود۔ سیاست مسلماناں و قتل موحداں خوئی و طبیعت او گشتہ، و چندیں علما، و مشائخ و سادات، و صوفیاں و قلندراں و نویسندگاں و لشکریاں را سیاست فرمودہ و آنکہ روزے و ہفتہ نمی گذشت کہ خوں چندیں مسلماناں نمی ریختند و جوئے خوں پیش و اخول در سرائی راندند از اثر قساوت علم معقولات و نقدان اعتقاد علم معقولات بود . . . . " (صفحہ ۴۶۵ - ۴۶۶)

اس نے یہ بھی بتلایا ہے کہ محمد تغلق کے ذہن میں جو باتیں آتی تھیں وہ اس عہد کے لوگوں کی عقل سے باہر ہوتی تھیں اور وہ ان پر عمل پیرا ہونے کی طاقت و لیاقت نہیں رکھتے تھے۔ بادشاہ اس بات کو نہیں سمجھ سکتا تھا کہ جب اس کے احکام کی تعمیل نہیں ہوتی تھی تو وہ بے دریغ خوں بہا ڈالتا تھا۔

> "آنچہ در تصور او گذشتے خلق را بداں فرماں دادے۔ و چوں . . . . و قوع متصورات سلطان اندازہ ماموراں نبودے کہ در حیز اظہار آرند و بعمل آں را موجود گردانند بر عداوت و بیفرمانی و مخالفت و بدخواہی ماموراں حمل می شد . . . . و خلق بسیاست می پیوست" (صفحہ ۴۶۶)

ضیائے برنی نے اعتراف کیا ہے کہ وہ خود اور اس کے اور ساتھی جن کو شاہی قرب حاصل تھا خوف جان اور حرص و طمع کی وجہ سے بادشاہ کو تنبیہ نہیں کرتے تھے نہ صاف طور پر اظہار حق کرتے تھے۔

> "و ما چنداں کافر نعمت کہ سیہ سپیدی خواندہ بودیم و از علمے کہ از آں شرف دارد چیزے داشتم، از طمع و حرص و دنیا نفاتہا ورزیدہ و مقرب سلطان شدہ در قضیہ سیاست کہ نامشروع بودے حق پیش سلطان نمی گفتیم، و از خوف جانی کہ رفتنی است و دولتے کہ زائل شدنی است می ترسیدیم

۔۔۔۔۔ " (صفحہ ۴۶۶)

اس حالت میں کہ اس عجیب و غریب بادشاہ سے دنیا عاجز آ گئی تھی اور وہ دنیا سے عاجز آ گیا تھا، سلطان محمد نے دریائے سندھ کے کنارے ٹھٹھہ سے چودہ میل پر لشکر کے اندر دس گیارہ دن بیمار رہنے کے بعد بتاریخ ۲۱ر محرم ۷۵۲ھ ۱۳۵۱ء انتقال کیا۔ اپنے محسن کی وفات پر ضیائے برنی نے جو ماتم کیا ہے اس کے چند فقرات لکھتا ہوں :۔

"آں جہاں پناہ جہانگیر از تختگاہِ پادشاہی در میان تختۂ چوب خفت و از مسند اولوالامری اسیر خاک شد۔ بیت

سر اسپ ارسلاں دیدی ز رفعت رفتہ بر گردوں   بمردا بخاک اندر تن اسپ ارسلاں بینی
امیرانے کہ بر قصرش ہزاراں پاسباں بودے   کنوں بر قبہ گورش کلاغاں پاسباں بینی۔۔۔

اے داد از دست چرخ بیوفا، و فریاد از روزگار پر جفا کہ شاہانِ جہاں پناہ و جہانبانانِ انجم سپاہ را بر خاک مذلت میان چہار گز گور روا می داد، و سلطان شرق و غرب را بزیر زحمت خواری می پسندد۔۔۔۔

صبح محشر دمید ما در خواب   بانگ زن خفتگان عالم را
استخیز است خیز باز شگاف   سقف ایوانِ طاق طارم را
شہ محمد نجف در دلِ خاک   نیلگوں کن لباس ماتم را۔" (صفحہ ۵۲۵ ۵۲۶)

ضیائے برنی کا سلطان محمد تغلق کی وفات پر نوحہ خوانی کرنا بیجا نہیں۔ اس وقت سے پھر اسے لطف زندگی کبھی حاصل نہیں ہوا بلکہ اس کی زندگی کے آخیر ایام نہایت مصیبت، ناداری حسرت اور مایوسی میں گذرے۔

محمد تغلق کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ اس کے وزیر احمد ایاز نے ایک چھ سات برس کے لڑکے کو سلطان محمد کا بیٹا بنا کر دہلی میں تخت نشین کر دیا۔ لیکن لشکر شاہی سلطان فیروز کو بادشاہ بنا چکا تھا، بعد میں جب مقابلہ کی نوبت آئی تو وزیر کو شکست ہوئی اور سلطان فیروز نے احمد ایاز کو قتل کرا دیا۔ ضیائے برنی کے تعلقات سلطان

محمد کی زندگی میں سلطان فیروز اور احمد ایاز دونوں سے اچھے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ محمد تغلق کے انتقال کے وقت وہ دہلی میں تھا۔ اس کے دشمنوں نے نہ معلوم کیا الزامات لگائے اور اُن کی کیا اصلیت تھی کہ سلطان فیروز کو اُس کی طرف سے سخت برہم کر دیا اور ایسا برافروختہ کیا کہ بادشاہ کا دل اس کی طرف سے کبھی صاف نہیں ہوا ضیائے برنی نے اپنے آپ کو بیگناہ ثابت کرنیکی کوشش کی اور اخیر تک بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنیکی تمنا کرتا رہا اور تاریخ فیروز شاہی کو بھی بادشاہ کے نام سے معنون کر کے وجہ تقرب بنانا چاہا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کے دل کا میل کسی طرح نہ نکلا۔ تاریخ فیروز شاہی کے تصنیف کے وقت فیروز شاہ کو تخت نشین ہوئے چھ برس گذر چکے تھے لیکن ضیائے برنی اُس وقت تک معتوبین ہی میں تھا اور اخیر تک نہایت نکبت و ناداری کی حالت میں بسر کرتا رہا جس کا اُس نے اپنی کتاب میں کئی موقع پر نہایت درد آمیز لہجہ میں ذکر کیا ہے:-

> "منکہ ضیائے برنی مولف تاریخ فیروز شاہی بعد نقل سلطان مغفور در مہالک گوناگون افتادم و بدخواہان جانی و دشمنان و حاسدان زبردست و قوی حال در خون من سعی کردند و از زخم چوگان عداوت گوئی دیوانہ ام ساختند و ہزار نوع سخنان زہر آلود از من در بندگی خداوند عالم رسانیدند کہ اگر بعد فضل اللہ تعالے علم و حیا و شفقت و مہربانی و حق شناسی و وفا داری سلطان العہد والزمان فیروز شاہ السلطان فریادم نرسیدے و سخنان زہر آمیختہ دشمنان غالب و متولی گشتہ در حق ایں ضعیف شنیدے و بودے کہ من در کنار مادر خاک خفتے و اگر مکارم اخلاق ایں بادشاہ بے چارہ نواز دستم نگرفتے تا امروز من کجا زندہ ماندے۔ ۔ ۔ (صفحہ ۵۵۶- ۵۵۷)

ایک اور موقع پر عہد جلالی کے بعض سر برآوردہ امرائے سلطنت کی سخاوت کا ذکر کرتے ہوئے اپنی درماندہ حالت اس طرح بیان کی ہے:-

> "اگرچہ من دریں ایام سخت درماندہ و عاجز شدہ ام و خواہندگان (سائیلان) از در من محروم باز می گردند از انکہ زادہ کریم و خلف کرام مردان را ازیں روز ہا بہتر می دانم۔ و نہ چیزے دارم و نہ از کس وام می یابم، و شب و روز در حسرت آنکہ ایثارے کنم و درم و دینارے دہم میکاہم و می میرم" (صفحہ ۲۰۴- ۲۰۵)

ایک جگہ اپنی کتاب پر فخر کرتے ہوئے اظہار حسرت کیا ہے کہ بادشاہ کو تاریخ سے شوق ہے لیکن چونکہ ناراض ہے کس طرح فیروز شاہی اسکی نظر سے گذرانی جائے :-

" چہ کنم کہ دشمنانم از حضرت واز قرب او مرا دور انداختہ اند، میسرم نمی شود کہ این تاریخ را در نظر ہمایوں او بگذرانم . . . . بغایت شکستہ ام و درین شکستگی در حضرت بے نیازی مناجات می کنم و می گویم، الٰہی بحرمت شکستگی خاطرِ من و بحرمت بیچارگی و مسکنتِ حال من لطیفہ ساز کہ این تاریخ من در نظر خدا وند عالم بادشاہ بنی آدم فیروز شاہ السلطان خلد اللہ ملکہ وسلطانہ بگذرد . . . . . . " (صفحہ ۱۲۵)

اخیر میں ملک الامرا ملاں سلطانی نے جو فیروز شاہ کے بندگان خاص میں سے تھا، بادشاہ سے ضیائے برنی کی کچھ سفارش کی تھی، لیکن غالباً اُسکا بھی کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا :-

" و ملک شکاربک ملاں سلطانی . . . . . . در باب من . . . بسیار مدد فرمود، وچند سخنے کہ از ہموا دے آید در پیش تخت عرضہ داشت کرد "

ضیائے برنی دنیا کے ان لوگوں میں تھا، جو سخاوت اور عطا و بخشش کے خاص طور پر دلدادہ ہوتے ہیں اور اپنی سیر چشمی اور فیاضی کی وجہ سے بڑی سے بڑی دولت بھی سنگوا کر نہیں رکھ سکتے۔ سلطان محمد تغلق نے اُسے بہت کچھ انعام واکرام دئے تھے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے کچھ بچا کر نہیں رکھا۔ میر خورد کے بیان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ضیائے برنی کے اخیر ایام نہایت عسرت اور ناداری کی حالت میں گذرے اور وہ دنیا سے مسکین وار رخصت ہوا۔ بادشاہ نے اخیر زمانہ میں بسر اوقات کے لئے تھوڑا سا وظیفہ مقرر کر دیا تھا (صفحہ ۲۱۲ سیرالاولیا) لیکن انتقال کے وقت اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ مرنے سے پہلے اس نے اپنے جسم کے کپڑے بھی خیرات کر دئے تھے۔ اُس کے جنازے کو اوپر نیچے بوریہ میں لپیٹ کر اُس کے محبوب ترین دوستوں کے قرب میں دفن کر دیا گیا۔ اُسکا باپ بھی خطیرہ سلطان المشائخ کے جوار میں دفن تھا۔ وہیں اپنے پدر بزرگوار کے پائیں میں اُسے بھی سپرد خاک کر دیا گیا۔ میر خورد لکھتا ہے :-

" آخر الامر چند روز زحمت شد و از دنیا بدار عقبیٰ مردانہ و عاشقانہ خرامید وقت نقل دانگ د

> درم برخود نداشت بلکہ جامہ ہائے تن نیز بداد و در جنازۂ فرو بالائے او یک تو دیک بوریا بود۔
> محسب ہر آئینہ اثر صحبت سلطان المشائخ بر صحبت بادشاہاں غالب آمد و عاقبت او بخیر شد
> و از جہان مسکین وار چنانچہ می بایست بیروں رفت و در جوار حظیرۂ سلطان المشائخ در پائیں
> والد بزرگوار خویش مدفن یافت رحمۃ اللہ علیہ" (سیر الاولیا صفحہ ۳۱۲)

اُس کی قبر کا پتہ اب بھی اُس کے دوست خسرو کے مزار سے جنوب کیطرف دیا جاتا ہے لیکن کوئی لوح یا کتبہ نہیں ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ جو موقع اُس کے مدفن کا بتایا جاتا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں۔ اگرچہ اس میں شبہ کرنیکی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ہم نے بارہا اُس موقع پر کھڑے ہو کر ہندوستان کے سب سے پہلے ہندوستانی مورخ اور اپنے ہم وطن بزرگ کی فاتحہ پڑھی ہے۔ خدا اُسے غریق رحمت کرے۔

اُس کی زندگی عبرت آموز ہے وہ ایک اونچے اور متمول گھرانے میں پیدا ہوا۔ امیرانہ شان و شوکت میں پرورش پائی ایک طویل عیش و راحت کی زندگی گذارنے کے بعد جس میں اس نے ہندوستان کے بعض اہم واقعات، غیر معمولی حوادث اور متعدد انقلابات اور عظیم شخصیتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ بالآخر فقیرانہ زندگی کی حالت میں اس دنیا سے رخصت ہوا۔ ہمیں یقین ہے کہ باوجود ان مصائب کے جو اُس نے اخیر زندگی میں بادشاہ وقت کی بے اعتنائی اور عتاب کی وجہ سے برداشت کئے وہ فی الجملہ اس دنیا سے اطمینان کے ساتھ رخصت ہوا۔

ضیائے برنی کا سنہ وفات تحقیق نہیں۔ فیروز شاہی کی تصنیف کے وقت اس کی عمر ۷۴ برس کی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد وہ زیادہ عرصہ تک نہیں جیا۔ میر خورد کے بیان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وفات کے وقت وہ ستر سے کچھ ہی زیادہ عمر رکھتا تھا۔ (سیر الاولیا صفحہ ۳۱۲)

میر خورد کے بیان سے جس نے یقیناً اُسے اخیر زمانہ میں دیکھا تھا، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کا ایک ہر دلعزیز شخص تھا۔ وہ بزرگوں، عالموں، شاعروں، امیروں اور بادشاہوں کا دوست رہ چکا تھا۔ اُس کو ابتدا ہی سے اچھی صحبتیں ملی تھیں۔ وہ زندگی کا ہر قسم کا تجربہ رکھتا تھا۔ وہ طبعاً خوش دل اور ظریف تھا۔ اُس کی باتیں دلچسپ ہوتی تھیں جو لوگوں کو اپنی طرف مائل کر لیتی تھیں۔ وہ مجلس میں بیٹھکر لوگوں کو

لطائف روح افزا اور حکایات ہوش ربا سناتا تھا:۔

> "آں بلطافت طبع بے نظیر و آں نزدیک اہل دلاں عالم دلپذیر یعنی خواجہ ضیاء الملۃ والدین برنی کہ مقبول خاص و عام بود و لطافتے بیحد و ظرافتے بے اندازہ داشت۔ در ہر مجلسے کہ ایں بزرگوار بودے گوش ہوش ہمہ بر لطائف روح افزائے او بودے مجمع اللطائف و جوامع الحکایات بود و از صحبت علماء و مشائخ و شعرا نصیبے کامل داشت و ہمتے بلند" (سیر الاولیا صفحہ ۳۱۲-۳۱۳)

اُس کی تصانیف میں سے ثنائے محمدی۔ صلوٰۃ کبیر۔ عنایت نامہ۔ مآثر سادات۔ حسرت نامہ (سیر الاولیا صفحہ ۳۱۳) اور تاریخ آل برمک مشہور ہیں اور ان سب سے زیادہ مشہور کتاب تاریخ فیروز شاہی ہے جسکی بدولت اُسکا نام زندہ ہے۔

ضیائے برنی کو تاریخ سے خاص دلچسپی تھی۔ اُس نے مختلف علوم و فنون میں بہت سی کتابیں پڑھی تھیں، لیکن وہ سب سے زیادہ تاریخ کو عزیز رکھتا تھا، جس کا اس نے وسیع مطالعہ کیا تھا۔ اس کی تاریخ دانی نے ایسی شہرت حاصل کی تھی کہ بادشاہ بھی اُسے ایک باخبر مورخ کی حیثیت سے دیکھتے تھے وہ تاریخ سے اپنی وابستگی خاطر کو اس طرح بیان کرتا ہے:۔

> "چنیں گوید بندہ گنہگار . . . . . ضیائے برنی کہ عمر بندہ در تصفح کتب گذشتہ است و در ہر علمے سے تصانیف سلف و خلف مطالعہ کردہ ام و بعد از علم تفسیر و حدیث و فقہ و طریقت مشائخ در ہیچ علمے و عملے چنداں منافع شاہدہ نکردہ کہ در علم تاریخ" (صفحہ ۹)

علم تاریخ کے موضوع اس کے فوائد اور شرائط پر ضیائے برنی نے ایک طویل مقدمہ حمد و نعت و منقبت صحابہ کے بعد لکھا ہے۔ تاریخ کا موضوع اس کی نظر میں "انبیاء، خلفاء، سلاطین و بزرگان دین و دولت کے اخبار ہیں:۔

> "و دانستن آثار و اخبار انبیاء، و خلفاء، و سلاطین و بزرگان دین و دولت علم تاریخ است . . . .
> علم تاریخ اخبار و اوصاف بزرگی و ذکر محامد و مناقب و مآثر بزرگان دین و دولت است نہ ذکر رزایل ارزال و اسافل و کم اخلاق و بازاریان" (صفحہ ۹)

آگے چل کر اُس نے تاریخ کے موضوع کو کچھ اور وسعت دیدی ہے اور تاریخ کے دائرہ میں اچھے اور بُرے حالات کا تذکرہ شامل کرلیا ہے :-

> "علم تاریخ نقل خیر و شر و عدل و ظلم و استحقاق و غیر استحقاق و محاسن و مقابح و طاعات و معاصی و فضائل و رزائل سلف است، تا خوانندگان خلف ازاں اعتبار گیرند و منافع و مضار جہانداری و نیکوکاری و بدکرداری جہانبانی دریابند و از درون آں نیکوکاری را اتباع نمایند و از بدکرداری پرہیزند" (صفحہ ۱۲-۱۳)

ضیائے برنی کے خیال میں تاریخ کے مطالعہ و تصنیف کرنے کے مجاز و مستحق اور نیز اُس کے مخاطب بھی فی الواقع معزز اور سر برآوردہ لوگ ہیں، جمہور کو اس فن کے مطالعہ کرنے اور اُس سے منتسب ہونے کا کوئی حق نہیں ہے :-

> "و اشتغال علم تاریخ بہ بزرگان دین و دولت کہ بکمالات سمر بودند و بر بزرگیہا در میان مردم سمر شدہ باشند مختص است، ارازل و اسافل و ناشایستگان و نابایگان و دونان و دون ہمتان و مجہولاں و لئیمان و بے سر و پایاں و داماندگان و کم اصلان و بازاریاں را در علم تاریخ نہ نسبت بود نہ پیشہ و نہ حرفت ایشاں باشد، و طوائف مذکور را دانستن علم تاریخ ہیچ منفعتے نکند و در ہیچ محلے ہیچ کار نیاید" (صفحہ ۹)

ضیائے برنی کی اس ذہنیت سے ہمیں متعجب نہیں ہونا چاہئے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ ہندی نژاد مسلمان تھا اور ایک امیرانہ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اُس کے رگ و پے میں اس قسم کے خیالات بسے ہوئے تھے اور جس آب و ہوا میں اُس نے پرورش پائی وہ اسی قسم کے خیالات کی مقتضی تھی۔ اُس زمانے کے لوگ دو ممتاز طبقوں میں منقسم تھے ایک وہ طبقہ جو دینی یا دنیوی یا نسلی حیثیت سے اقتدار رکھتا تھا اور دوسرا طبقہ عوام الناس کا جو اپنی جہالت، سست طبعی اور پست خیالی کیوجہ سے بجائے حقوق عامہ سے واقف ہونے اور انکی حفاظت کرنیکے صرف مقتدر جماعتوں کی اطاعت اور وفاداری ہی اپنی زندگی کا نصب العین سمجھتا تھا۔ پادشاہ ظل اللہ تھا، اور اگرچہ نظری حیثیت سے خلق اللہ کے راعی ہونے کی حیثیت سے اُسے

یہ درجہ حاصل تھا لیکن فی الواقع تاج و تخت اکثر جبر و تشدد اور مکر و فریب سے حاصل ہوتے اور تلوار روپیہ اور ہر قسم کی بے ایمانیوں سے برقرار رکھے جاتے تھے۔

تاریخ کے موضوع اور مورخ کے افق نظر کو اس طرح محدود کر دینے کیوجہ سے ضیائے برنی نے تاریخ کے دائرہ کو بہت کچھ تنگ کر دیا ہے۔ وہ موضوع تاریخ کے اُس صحیح تصور سے بہت دور ہے جو اس سے کچھ ہی عرصہ بعد ابن خلدون نے قائم کیا اور جس پر عمل پیرا ہونیکی وجہ سے وہ بجا طور پر فلسفہ تاریخ کا امام مانا جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں ابن خلدون سے بہتر کسی نے موضوع تاریخ کو صحیح طور پر متعین نہیں کیا ہے۔ اس نے تاریخ کی جو تعریف کی ہے اُسے ہم نقل کرتے ہیں اور ناظرین سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ ہندی نژاد مورخ کی محدود النظری اور عربی مورخ کی وسیع النظری کا مقابلہ کریں:-

> "حقیقة التاریخ انه خبر عن الاجتماع الانسانی الذی هو عمران العالم، وما یعرض لطبیعة ذلک العمران من الاحوال مثل التوحش والتأنس والعصبیات واصناف التغلبات للبشر بعضهم علی بعض، وما ینشأ عن ذلک من الملک والدول ومراتبها وما ینتحله البشر باعمالهم ومساعیهم من الکسب والمعاش والعلوم والصنائع وسایر ما یحدث فی ذلک العمران بطبیعته من الاحوال"

ابن خلدون کے خیال میں تاریخ کا موضوع اجتماع انسانی و عمران عالم کے حالات ہیں جنکا مطالعہ ارتقائی نقطہ نظر سے کیا جاتا ہے کہ کس طرح اجتماع انسانی نے وحشت کی حالت سے تمدن کیطرف ترقی کی، کس طرح انسان نے جماعتیں بنائیں، کس طرح ان جماعتوں نے باہمی جنگ و جدل کے بعد ایک دوسرے پر غلبہ پایا، کس طرح مختلف انواع و مدارج کی حکومتیں اور سلطنتیں قائم ہوئیں، کس طرح دوران تمدن میں مختلف قسم کے کاروبار وجود میں آئے اور علوم و صنائع پیدا ہوئے۔ الغرض کس طرح نسل انسانی نے تمدن کے مختلف شعبوں میں قدم رکھا اور ترقیاں کیں۔ ابن خلدون کے نقطہ نظر سے سلطنتوں اور حکومتوں کا قائم ہونا بھی منجملہ تمدن بشری کے دیگر واقعات کے ایک نوع کے واقعات ہیں جو انسان کی تمام زندگی کے تمام حالات پر حاوی نہیں ہیں۔ وہ مورخ کی نظر کو اتنا وسیع کرنا چاہتا ہے کہ اجتماع بشری کے تمام

حالات و معاملات اُس کے دائرہ میں آجائیں اور وہ حیات بشری کے کسی ایک جزو یا شعبہ ہی کو تاریخ کا موضوع قرار دینا نہیں چاہتا۔ اُس کے خیال میں محض جنگ و جدل، حوادث، و انقلاباتِ سلاطین و زوال تاج و تخت، اخبار ملوک و زرا، و اُمرا، زلزلوں، طاعون، قحطوں اور عام مصائب و بلایا اور اہل ظلم و جور کے مکاید اور اہل طمع کے جرائم استبداد ہی کا نام تاریخ نہیں ہے۔"

انّ من التاریخ "تعلیل الکائنات و مبادیہا دقیق و علم بکیفیات الوقائع و اسبابہا عمیق"

ضیائے برنی اور عام مورخین کے اور ابن خلدون کے نقطۂ نظر میں جو اہم فرق ہے وہ یہ ہے کہ اول الذکر بجائے اجتماع انسانی کے افراد انسانی کو تاریخ کا موضوع قرار دیتے ہیں۔ اس وجہ سے وہ بجائے اجتماع انسانی کی تاریخ کے افراد کے حالات پر اکتفا کرتے ہیں۔ وہ اسی وجہ سے چیزوں کی تہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ وہ سطح سے آگے نہیں بڑھتے۔ وہ اسباب علل کے پرپیچ سلسلوں کو صحیح طرح نہیں سمجھ سکے وہ تاریخی واقعات کی صحیح تعبیر نہیں کر سکے۔ وہ اُن مخفی لیکن قوی قوتوں سے بے خبر رہتے ہیں جو پس پردہ کام کرتی اور تبدیلیاں اور انقلاب پیدا کرتی رہتی ہیں۔ اور جن کے سامنے افراد انسانی اکثر بجائے ذی اختیار عامل ہونے کے محض بساط کے مہرے ہوتے ہیں جن کی حرکتیں فی الواقع بجائے اختیاری ہونے کے اضطراری اور ناگزیر ہوتی ہیں۔

ضیائے برنی پر کیا منحصر ہے تاریخ کا یہ بلند اور صحیح موضوع جو ابن خلدون (متوفی ۸۰۸ھ ۱۴۰۵ء ۱۴۰۶ء) نے قرار دیا ہے، نہ اُس سے پہلے کسی کی نظر میں تھا، نہ کسی نے اس نقطۂ نظر سے تاریخ سے بحث کی تھی۔ اُس کے بعد بھی دنیا کے بہت ہی کم مورخ ہیں جو تاریخ کا ایسا وسیع اور صحیح موضوع سمجھے اور اُس پر عمل پیرا ہوئے ہوں۔ ورنہ عام خیال وہی "بڑے لوگوں" کے حالات اور جنگ و جدل کے واقعات اور خاص قسم کے حوادث ہیں، جن سے آگے مورخین قدم نہیں بڑھاتے۔

ہر چند کہ ضیائے برنی کا دائرۂ تاریخ کے صحیح تصور سے بہت بعید اور محدود ہے لیکن اُس دور اور عہد مابعد کے اکثر مورخوں کے مقابلہ میں نظری و عملی دونوں حیثیتوں سے وہ زیادہ وسیع النظر ثابت ہوتا ہے۔

وہ عام حالات کیطرف بہت زیادہ متوجہ ہوا ہے۔ بلاشبہ اُس نے اُنکا تذکرہ ابن خلدون کے نقطۂ نظر سے نہیں کیا ہی۔ لیکن اُسکی تاریخ سے اُس قسم کی تاریخ مرتب کرنے میں جو عمران عالم اور اجتماع بشری سے بحث کرے قیمتی مدد حاصل ہوسکتی ہے۔ اُس نے انتظامات، طبقات، مشاہیر اور وقائع عامہ کے بیان میں صفحات کے صفحات لکھے ہیں اور ان چیزوں کا تذکرہ تاریخ کے موضوع میں داخل سمجھا ہے۔ ضیائے برنی اس لحاظ سے اپنے پیشرو ہندوستانی مورخوں منہاج اور نظامی سے بدرجہا فائق ہے۔ نظامی زیادہ تر الفاظ کا دلدادہ اور انشا پردازی میں محو ہے، جس نے واقعات کے بیان کرنے میں انشا دیانہ کمال دکھانا چاہا ہے۔ اور زیادہ تر ملک گیری کے واقعات تک اپنے آپ کو محدود رکھا ہے۔ منہاج کا بیان سادہ اور بے تصنع لیکن خشک ہے۔ بہ نسبت مورخ کے میں اُسے اور نظامی کو وقائع نگار کی حیثیت دیتا ہوں جنہوں نے زیادہ تر بادشاہوں کے حالات و حوادث کے بیان پر اکتفا کی ہے۔ وسعت نظر کے لحاظ سے بعد کے مورخوں میں صرف عالی ظرف اور روشن خیال ابوالفضل مصنف آئین اکبری کو ضیائے برنی پر بین فوقیت حاصل ہے۔ اصل یہ ہے کہ ابوالفضل بھی ابن خلدون کیطرح ایک غیر معمولی حیثیت کا مصنف ہے اور اُسکی آئین اکبری بھی ابن خلدون کے مقدمہ کی طرح اپنی نوعیت کی ایک ہی چیز ہے، جس کی مثال اُس سے پہلے دکھائی نہیں دیتی۔

حدود تاریخ کے مخصوص و محدود تصور کیوجہ سے ضیائے برنی کے ذہن میں تاریخ کے منافع بھی اُسی نوعیت کے ہیں:۔

(۱) کتب سماوی میں بعض انبیا، و سلاطین کے اخبار و آثار موجود ہیں علم تاریخ کا بھی یہی موضوع ہے اور دونوں کا مقصد اولوالابصار کی عبرت ہی:۔

"و علم تاریخ ہمیں علم است کہ سرمایۂ اعتبار اولوالابصار می گردد۔" (صفحہ ۱۰)

(۲) حدیث اور تاریخ کا نہایت قریبی تعلق ہے اور محدث کے لئے مورخ ہونا ضروری ہی۔

(۳) علم تاریخ سے عقل و شعور حاصل ہوتے اور رائے کو تدبیر و مدد ملتی ہے۔

(۴) بادشاہوں کو اُس کے مطالعہ سے مفید سبق حاصل ہوتے ہیں اور وہ نازک سے نازک

موقعوں پر ثابت قدم رہنا سیکھتے ہیں۔

(۵) انبیاء کے حالات پڑھکر صبر و رضا کی تعلیم ملتی ہے۔

(۶) علم تاریخ کے مطالعہ سے اچھے لوگوں کے حالات پڑھکر اچھے لوگوں کے خصائل دلنشیں ہوتے اور بُرے لوگوں کی خرابیاں دیکھکر بری باتوں سے نفرت ہوتی ہے۔ (۱۱-۱۳)

(۷) مورخ جن لوگوں کے حالات لکھتا ہے انکے ہمیشہ کے لئے نام اور شہرت قائم کر دیتا ہے۔ (صفحہ ۱۶-۱۷)

(۸) تاریخ کے مطالعہ سے یہ اخلاقی سبق بھی حاصل ہوتا ہے کہ "بدی کا نتیجہ بدی اور نیکی کا نتیجہ نیکی ہے"!

تاریخ کے موضوع اور فوائد سے بحث کرنیکے بعد وہ تاریخ نگاری کی شرائط سے بحث کرتا ہے۔ وہ مورخ کا سب سے مقدم فرض راستبازی اور راست نگاری قرار دیتا ہے اور اسی وجہ سے ہر شخص کو وہ تاریخ لکھنے کا اہل نہیں سمجھتا۔ اُس کے خیال میں مورخ کے لئے دیندار ہونا بھی ضروری ہے۔ اس مبحث پر اُس کے آرا ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں:-

"مؤلف تاریخ ہم از اہل اعتبار باید وہم بصدق و عدالت مشہور و مذکور باید، تا در نوشتہ بے سند او اعتقاد مطالعہ کنندگان راسخ گردد۔ و در میان معتبران اعتبار گیرد" (صفحہ ۱۳)

"و نیز مورخ چنانکہ از اکابر و معارف می باید سلامتی دین و مذہب او ہم شرط نوشتن است (صفحہ ۱۴)

"و شرطے کہ از لوازم تاریخ نویسی است آنست کہ بر مورخ از روئے دینداری واجب و لازم است کہ اگر فضائل و خیرات و عدل و احسان بادشاہے و بزرگے نبویسد باید کہ مقابح و رزایل او را مستور ندارد و طریقۂ مداہنت در نوشتن تاریخ معمول نکند و اگر مصلحت بیند بصریح والا برمز و اشارت و کنایت زیرکان و فہیماں را بیاگاہاند۔ و اگر از خوفے دہرے ساوی ہم عصر و ہم عہد نتواند نوشت دراں معذور بود، لیکن از گذشتگاں باید کہ راستا راست

نویسد۔ واگر مورخ را در عہدے وعصرے از پادشاہے ویا از وزیرے وبزرگے کوشتے وکوفتگی رسیدہ باشد، یا نوازشے ونواختے ویا ازیادتی یافتہ، باید کہ در اوان تالیف تاریخ لطف وقہر و نوازش وگذارش کسے از بزرگان منظور او نبود تا از نتایج آں برخلاف راستی فضیلتے ورذیلتے نابودہ ومعاملہ وماجرائے ناگذشتہ در قلم آرد بلکہ منظور مورخ دیناً واعتقاداً صدقاً وتدیناً نوشتن راستی ودرستی باشد۔ وبر مورخ واجب ولازم است کہ از طریق وطریقت کذابان و مداحان ومبالغہ کنندگان وشاعران دروغ زنان وسمر آرایان احتراز کُلی واجب شناسد کہ طوائف مذکور خرمہرہ را یاقوت لعل گویند واز طمع خود سنگریزہ را جوہر گرانمایہ نام نہند۔ و احسن نوشتہا واختراعہائے ایشاں اکذب ایشاں باشد۔ . . . فردائے قیامت مولف کذاب بہ سخت ترین عذاب وعقاب وماند" (صفحہ ۱۵-۱۶)

اس طویل خطبہ کے اخیر میں جس میں کہ موضوع ومنافع وشرائط تاریخ بیان کئے گئے ہیں ضیائے برنی نے اس طرح اپنی کتاب کی خوبیوں کو سراہا اور اپنی سچائی کا یقین دلایا ہے :-

"ومن در نوشتن تاریخ مذکور زحمت بسیار دیدہ ام واز منصفان انصافہا توقع می کنم کہ ایں کتاب بسے معانی را جامع است کہ اگر ایں تالیف را تاریخ خوانند اخبار سلاطین دریابند واگر دریں تالیف احکام وانتظام والتیام جویند ازانہم خالی نیابند، واگر دریں تالیف مواعظ ونصائح جہانبانان وجہانداران طلبند بیشتر وبہتر از تالیفات دیگر مطالعہ فرمایند۔

وازانچہ ہرچہ نوشتہ ام راست ودرست نوشتہ ام ایں تاریخ واجب الاعتبار است وازانکہ درالفاظ موجز معانی بسیار درج کردہ ام واجب الاقتدار است" (صفحہ ۲۳)

پھر ایک اور جگہ لکھا ہے :-

ومنکہ ضیائے برنی مولف تاریخ فیروزشاہیم دریں تالیف ساحریہا کردہ دانم ودانایان علم تاریخ سیم زرع وکیمیا شدہ اند ہم دانند کہ ہزار سال بازمثل تاریخ فیروزشاہی کہ جامع اخبار و احکام جہانبانی است ہیچ مورخ را دست ندادہ است۔ آہ چہ کنم وبیش کہ نالم ودرخدمت

> که عرضه دارم که تا این تاریخ با تواریخ دیگر مقابله و موازنه فرماید و انصاف خون خوردن من بدہد که در ہر سطرے بلکہ در ہر کلمۂ لطائف و غرائب احکام انتظامی در ضمن اخبار و آثار سلاطین درج کردم و منافع و مضار جہانداری جہانداران چہ بصریح و چہ بکنایت و چہ بعبارت و چہ باشارت و چہ کشادہ و چہ برمز آوردہ " (صفحہ ۱۲۳ - ۱۲۴)

اس کے بعد اُس نے نہایت حسرت کے ساتھ اپنے ملک میں تاریخ جاننے والوں اور اُس کی قدر و قیمت پہچاننے والوں اور حق شناسوں کے فقدان پر ماتم کیا ہے اور لکھا ہے کہ اگر جمشید و کیخسرو اور نوشیرواں و پرویز زندہ ہوتے اور اس تاریخ کے مقابلہ میں شہر انعام دیتے تو راضی نہ ہوتا اور ناز کرتا۔ پھر کہتا ہے کہ اگر ایسا نہیں ہوسکتا تو کاش ارسطاطالیس اور بزرجمہر ہی اس کتاب پر نظر ڈال سکتے، تاکہ میرے حق میں انصاف و تحسین کرتے اور اگر یہ بھی تمنائے دیوانہ ہے تو ایسی تاریخ سلطان محمود اور سلطان سنجر کے زمانہ میں تصنیف ہوتی کہ تاریخ اور مورخ کی عزت بلاد و ممالک اسلام میں روشن ہوتی۔ ان سب حسرتوں سے بڑھکر یہ حسرت ہے کہ بادشاہ عہد (سلطان فیروز) علم تاریخ سے شغف رکھتا ہے، لیکن مورخ معتوبین میں ہونیکی وجہ سے اس کتاب کو اس کے سامنے پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اخیر میں لکھتا ہے کہ میری سب حسرتیں جاتی رہیں گی اگر بادشاہ ایک نظر اس کتاب کو دیکھ لیگا۔ (صفحہ ۱۲۴ - ۱۲۵)

حقیقت یہ ہے کہ ضیائے برنی نے اپنے ملک میں فن تاریخ کی ناقدری کی جو کچھ شکایت کی ہے حق بجانب ہے طبقات ناصری کی تصنیف سے پورے سو برس بعد تاریخ فیروزشاہی لکھی گئی اور اس دوران میں کوئی مصنف ایسا نہیں ہوا جو فی الواقع ہندوستان کی تاریخ بحیثیت تاریخ لکھتا۔ ضیائے برنی کے بعد بھی برسوں تک ہندوستان میں کوئی مورخ نہیں ہوا اور فیروزشاہ ضیائے برنی کے انتقال کے بعد اسی حسرت میں رہا کہ اُس کے عہد کی تاریخ لکھی جائے، لیکن کوئی شخص اس کام کا اہل نہیں ملا۔ شمس سراج عفیف نے جو تاریخ لکھی وہ اس بادشاہ اور تیمور کے حملہ کے بعد لکھی جس میں اُس نے بعض دیگر سلاطین ماسبق و مابعد کے حالات کے علاوہ سلطان فیروزشاہ کی تاریخ بھی لکھی ہے اور وہ بھی تاریخ فیروزشاہی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب بدقسمتی سے مکمل دستیاب نہیں ہوتی اور یہ خیال جو عام طور پر متداول ہے غلط ہے کہ

اس مورخ نے صرف فیروز شاہ کا حال لکھا تھا۔ عفیف ایک عجیب مورخ ہے اور اس نے اپنی کتاب میں عام حالات کی طرف بھی توجہ کی ہے۔ شمس سراج عفیف کے بیان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ سلطان فیروز کو تاریخ سے خاص شغف تھا۔ فیروز شاہ ایک تعلیم یافتہ بادشاہ تھا لیکن ہمارے خیال میں علمی حیثیت سے اس کا عہد چنداں ممتاز نہیں، حالانکہ اس کی نیکدلی کی وجہ سے اس کا عہد زیادہ تر امن واماں میں گذرا۔ جب اس کی یہ تمنا کہ اس کے عہد کی تاریخ قلمبند ہو جائے پوری نہیں ہوئی تو بالآخر اس نے اپنی زبان سے کچھ فقرات قلمبند کر کے پتھر میں کندہ کرا دیے اور فیروزآباد کے اندر منارہائے سنگین (اشوک بادشاہ کے لاٹھ) اور کوشک شکار اور کوشک نزول کی عمارتوں گنبدوں کے گرداگرد لگا دیے جن میں اپنے کچھ حالات بیان کیے تھے: ۔

> "واندراں ایام کہ خدمت مولنا ضیاء الدین برنی علیہ الرحمۃ والغفران مورخ تاریخ فیروز شاہی برحمت حق پیوستہ حضرت فیروز شاہی برائے کتابت تواریخ خود بر ہر یک حامل اسرار دل خود گفتہ کہ بغیر مورخ موثق این نگارزریں درین گلزار ہیچ کے بافصل بے بستن تواند۔
>
> چوں حضرت شاہ فیروز از کتابت تواریخ عہد دولت خود نا امید گشتہ ضرورۃ از زبان خویش از کثرت ہوس و عمارت کوشک شکار و در گنبدہائے کوشک نزول و عمارت منارہ سنگین کہ در کوشک شکار و درون فیروزآباد داشتہ اند در سنگ او نقرہ کنانیدہ۔ و مضمون آں بدیں جملہ نویسانید کہ ایں چنیں شکار پیلان باختیم و ہم چنیں پیلان آوردیم و ایں چنیں رعنائیہا نمودیم ایں ہمہ چہ بود تا میاں جہاں و جہانیاں و عالم و عالمیاں ایں ہمہ نقطہ بر چنیں اہل بصائر یادگار ماند، و خلائق جہاں و عاملان دوراں عبرت گیرند۔
>
> (تاریخ فیروز شاہی شمس سراج عفیف مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال صفحہ ۱۷۷)

تاریخ کا فن ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ آیا، اس سے پہلے اس ملک میں تاریخ کے ساتھ اعتنا نہیں کیا گیا۔ ہندوستان کے علما نے بعض دیگر علوم مثلاً الٰہیات و ریاضیات میں حیرت انگیز ترقیاں کیں لیکن تاریخ کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ مسلمان بھی جس وقت وسط ایشیا سے شمالی ہندوستان

میں داخل ہوئے اور دہلی کی سلطنت قائم ہوئی، مسلمانوں کا وسط ایشیا کے ملکوں میں علمی و ذہنی انحطاط شروع ہو چکا تھا اور تاریخ کی قدیم شاندار روایتیں ماند پڑ چکی تھیں۔ اس وقت تک فن تاریخ میں مسلمانوں میں بڑی بڑی شخصیتیں پیدا ہو چکی تھیں (مثلاً طبری اور البیرونی) اور مغربی ممالک اسلام میں جہاں عربی زبان رائج تھی تاریخ کی شاندار روایت عرصہ تک محو نہیں ہوئی بلکہ آٹھویں صدی کے اخیر اور نویں صدی کے آغاز میں ابن خلدون ہوا جو مسلمانوں کے مورخین میں ممتاز ترین ہستی رکھتا ہے۔ مشرقی ممالک میں جہاں فارسی زبان رائج ہو چکی تھی اور کتب تواریخ بھی اسی زبان میں لکھی جانے لگی تھیں تاریخ کا معیار روز بروز پست ہوتا گیا، ہندوستان میں مسلمان آئے تو ایسی حالت میں کہ وہ تاریخ نویسی کے اعلیٰ معیار کو فراموش کئے ہوئے تھے اور اُنکا سابقہ پڑا تو ایسے ملک سے جہاں پہلے ہی سے اس فن کا رواج نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں تاریخیں لکھی گئیں لیکن اعلیٰ معیار سے نیچے۔ مورخ ہوئے لیکن کم اور مدت اور مدت کے بعد۔ محض واقعہ نگاری کی حیثیت سے بھی دیکھو تو ہمارے ہندوستان کے مورخ، منہاج، حسن نظامی، ضیائے برنی اور شمس سراج اپنے پیشرو مورخین ابوالفضل بیہقی اور البیرونی سے کوئی نسبت نہیں رکھتے۔ نہ اُس سے کوئی محض واقعہ نگاری کی حیثیت سے اپنے معاصرین ابن الاثیر اور ابن خلدون ہی کو پہنچتا ہے۔

اپنے زمانہ میں ہندوستان میں تاریخ کی طرف سے بے توجہی اور بے اہتمامی کا ضیائے برنی نے اپنی کتاب میں کئی جگہ ذکر کیا ہے:۔

> "و دریں ایام کہ من تاریخ فیروز شاہی می نویسم ہفتاد سال از نقل سلطان بلبن گذشتہ است . . . بے اہتمامی و بیہوشی علم تاریخ بجائے رسیدہ است کہ از اہل علم و یا از خداوندگان شمشیر و شجاعت کسے در نظر نمی آید کہ او را اخبار و آثار جہانداری سلطان بلبن روشن بود و یا در دانستن و شنیدن اخبار او و یا از آں سلاطین ماضیہ کہ بر تخت گاہ دار الملک دہلی پیش از سلطان بلبن و بعد از و بودند ہوسے باشد، فضلاً از دانستن و شنیدن اخبار و آثار سلاطین ماضیہ اقالیم دیگر . . . .
> در بزرگان دین و دولت عہد و عصر آرزوئے دانستن و شنیدن اخبار بزرگان سلف معاینہ کنم حال من در روزگار من کہ ازیں علم بہرہ دارم و دریں علم رنجے بردہ ام چہ شود . . . (صفحہ ۴۔۴۹)

ضیائے برنی نے اپنی تاریخ کو سلیس، عام فہم عبارت میں لکھا ہے لیکن اُسکا طرز تحریر باوجود سہل ہونیکے تکرار لفظی و معنوی اور خطابت کیطرف مائل ہے۔ باوجود اس کے اسکا طرز تحریر لفظی اور معنوی تصنعات سے بری ہونیکی وجہ سے فارسی مورخوں میں بسا غنیمت ہے کبھی کبھی اُس کا بیان رنگین ہو جاتا ہے اور ادبی شان اور شاعرانہ تخئیل پیدا کرلیتا ہے۔ اسکی زبان کے متعلق اعتراض کیا گیا ہے کہ اس میں ہندوستانی محاورات کا اثر پایا جاتا ہے۔ یہ اعتراض درست ہے۔ وہ ہندوستانی نژاد تھا۔ ہندوستان کی فارسی پر سو برس کے اندر ہندی زبان کا بہت کچھ اثر پڑا تھا۔ وہ مسلمان جو یہاں بود و باش اختیار کر چکے تھے ضرور ایک قسم کی ملی جلی زبان بولنے لگے تھے جو عربی، فارسی، ترکی اور ہندی الفاظ کی آمیزش سے بنی تھی اور جس نے رفتہ رفتہ ترقی کرکے اردو کی شکل اختیار کرلی۔ اس روزمرہ کی زبان کا ہندوستان کی فارسی پر اثر پڑنا چاہئے تھا اور پڑا۔ خسرو کی زبان میں بھی اس کا اثر ملتا ہے گو اس کے متعلق کسی اہل زبان کو مجال دم زدن نہیں ہے۔ ہندوستان کے فارسی شعرا اور نثر نگاروں کی تحریرات میں ہندی الفاظ ملتے ہیں بعض اوقات ایسے محاورات بھی ہوتے ہیں جو ہندی زبان سے فارسی میں ڈھالے گئے ہیں اور اُنکے ہندوستانی ہونیکا پتہ دیتے ہیں۔ یہی حال ضیائے برنی کا ہے۔ ہمیں اس طرز بیان کے متعلق نہ شرمندہ ہونیکی ضرورت ہے نہ اُس کے لئے معذرت درکار ہے نہ اخفا کی حاجت ہے۔ زبان بھی انسان کے دیگر حالات کی طرح متغیر ہونیوالی چیز ہے اور ماحول سے بہت جلد متاثر ہوتی اور تبدیلیاں اختیار کرتی ہے۔ ہندوستان کی فارسی ایک جداگانہ حیثیت رکھتی ہے اور اُسی نہج سے ایک مورخ اُسے دیکھنے پر مجبور ہے۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اُس زبان کو بیقدری یا بے عزتی کی نظر سے دیکھیں۔ وہ اسی طرح متغیر ہوتی رہی جس طرح کہ ہم رفتہ رفتہ ہندوستان میں متغیر ہوتے رہے۔ یہ تغیرات ناگزیر تھے اور اُنکے متعلق افسوس کرنا بالکل نامناسب اور بیجا ہے۔

ضیائے برنی کی رنگین بیانی، ادیبانہ پرواز اور شاعرانہ تخیل کا ہمارے خیال میں بہترین نمونہ تاریخ فیروز شاہی کا وہ مقام ہے جہاں اُس نے بلبن کے رنگیلے جانشین سلطان معزالدین کیقباد کی عیش پرستیوں کا نقشہ کھینچا ہے وہ خود اُس عہد میں بچہ تھا اور سن شعور کو نہیں پہنچا تھا جو کچھ اُس نے لکھا ہے اُس میں متخیلہ سے کام لیا ہے یہ مقام جو طویل ہونی کی وجہ سے پورا انتخاب نہیں کیا جا سکتا اصل کتاب میں پڑھنا

چاہیے (صفحہ ۱۵۶ - ۱۶۵) ضیائے برنی نے اس پر بڑا ناز کیا ہے اور اپنی انشا پردازی کا بہترین نمونہ قرار دیتے ہوئے اُسکا "قبتہ التواریخ" نام رکھا ہے۔

> ہمیں چند ورقے کہ در اخبار و آثار معزی نوشتہ ام و اوراق اخبار عیش و عشرت او را و ہم معصران او را "قبتہ التواریخ" نام کردہ۔ معانی غزلہائے دیوانی در وصف جمال خوبرویاں درج گردانیدہ" (صفحہ ۱۶۶)

سلطان معزالدین کیقباد بلبن کا پوتا تھا۔ اسکا باپ سلطان ناصرالدین بغرا خاں بلبن کی وفات کے وقت بنگال میں حاکم تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں کیقباد دہلی میں بادشاہ بنا دیا گیا۔ بعد میں باپ بیٹے میں تخت سلطنت کے لئے نزاع ہوا لیکن بالآخر صلح ہوگئی۔ اور باپ نے بیٹے کو دہلی کا بادشاہ مان لیا۔ اس تمام قصہ کو خسرو نے قران السعدین میں لکھا ہے۔ وداعی ملاقات کے وقت باپ نے اپنے نوجوان اور عیش پرست بیٹے کو نصیحتیں کیں اور عیاشیوں سے روکنا چاہا۔ کچھ دن بیٹا اپنے باپ کی نصیحتوں پر عمل کرتا رہا، لیکن بالآخر پھر عیش و عشرت کا شکار ہوگیا۔ ضیائے برنی نے دکھلایا ہے کہ کس طرح بادشاہ اس جال میں دوبارہ پھنستا چلا گیا۔

بادشاہ کے عیش و طرب کی شہرت پہلے سے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اطراف و جوانب ملک سے گروہا گروہ ارباب نشاط دہلی میں جمع ہو گئے تھے۔ اب جو بادشاہ کے تائب ہونیکا حال معلوم ہوا تو ایک کھلبلی مچ گئی۔ بالآخر ایک دن ایک ماہ رو شوخ و شنگ، بلائے بیدرماں اور آفت بے بدل "قبلئے زرنگاری پہنے ترکش زراندود کمر سے باندھے، تیر کی دم ترکش میں لٹکائے، کلاہ شاہانہ نیمہ گوش تک سر پر رکھے، اسپ سبز خنگ دم برافراشتہ پر جو ساز طلع سے مرصع تھا سوار زرہ ہزار میخی پہنے، چابک سوار شکار انداز کی شکل میں پرچم سیاہ گھوڑے کے سینہ پر لٹکائے" فوج سے نکلا اور گھوڑے کو کودانے پھاندنے لگا اور بادشاہ کے مقابل جا پہونچا اُس کے حسن کو دیکھکر سب مدہوش رہ گئے کوئی روک نہ سکا۔ وہ فوراً گھوڑے سے اتر کر بادشاہ کے گھوڑے کے سامنے لوٹ گیا اور نہایت دلکش آواز میں یہ بیت پڑھی۔

"گر قدم بر چشم ما خواہی نہاد
دیدہ بر رہ می نہم تا می روی"

اور کہنے لگا "شاہجہاں اس غزل کا مطلع زیادہ مناسب حال ہے لیکن خوف شاہی سے پڑھنے کی ہمت نہیں رکھتا"

بادشاہ اُسے دیکھکر وارفتہ ہوگیا اور اُسے اجازت دیدی۔ اُس نے فوراً یہ شعر پڑھا۔

سرو سیمینا بصحرا می روی   نیک و بد عہدی کہ بے ما می روی

پھر کیا تھا، توبہ ختم ہوئی فوراً شراب طلب ہوئی اور بادشاہ نے جام شاہی ہاتھ میں لیکر یہ شعر پڑھا۔

شب زمے توبہ کنم از بیم نازشاہداں   بامداداں روئے ساقی باز در کار آورد

غرض اس قصہ کو کہاں تک لکھا جائے اُس پریرو نے جب بادشاہ کو والہ و شیفتہ دیکھا تو بادشاہ سے سفارش کی کہ اور بھی بہت سے میرے ساتھی ہیں جو نوازش کے منتظر ہیں انہیں بھی بار بخشا جائے۔ چشم زدن میں عیش و عشرت کا بازار گرم ہوگیا (صفحہ ۱۶۱-۱۶۵) جس کا ضیائے برنی نے ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ واقعی قابل دید ہے:-

"فرمان شد تا آں طائفہ را پیش آوردند۔ چوں در جمال ایشاں نظر انداختند یکے از یکے خوبتر و زیبا تر و نغز و شیریں تر بودند چوں در سرود و پاکوفتن در آمدند حاضران مجلس را از نظارہ آں مہوشان حور پیکر و از کرشمہ آں خوباں ماہ منظر و از نیک روئی آں سرو قستان مایہ ناز و از تنگ وآں گلعذاراں جاں نواز حیرت روئے نمود۔ و سلطان را از شوخی آں رہ دیدگان عجب آمدہ گو و از لطیفہ گفتن آں زر دبازاں عربدہ جو و از پاکوفتن آں دلربایاں سیمیں ساق و از رباب زدن آں جاں نوازاں نیک آواز نید پدر فراموش شد . . . . . و از نرد و شطرنج باختن آں سہ پیکراں و گرہ بازی و کعبتین غلطانیدن آں سیمبراں آشفتہ تر و مدہوش تر می شد . . . . . و در ہر منزلیکہ سرا پردہ سلطانی بر آوردند از ہر چہار جانب سرا پچہا بانگ از خوبرویاں خوش آواز بر می آمد و از صوتِ ناز دلنوازشاں زہرہ در سویم آسمان معلق می زد . . . . . و از زاریدن چنگ و رباب و نالش کمانچہ و نالہ سکل و نائے و طنبور ایشاں مرغ از ہوا فرود می آمد و وحوش مدہوش می شد . . . .

وازسرود آں سادہ پسران چہارابرو وازرقص آں پاکوباں عربدہ جو وازکرشمۂ آں ترکان دلربا وازغمزۂ آں پرجفایان بے وفا خوب طبعان لشکر وسربازان دلاور دیوانہ وعاشق می شدند ودرصفت آں خوبان تازہ وترغزلہائے جدید می گفتند، وجوانان آشفتہ خوئے و آشفتگان دیوانہ رو پیراہنہا ضرب می کردند وجعدہا می بریدند، وقرار وسکون ازدلہائے بیدلاں می پرید وفریاد عاشقاں دل باد دادہ بآسماں می رسید۔

وہرخرچے کہ عاشق پیشگان بے سروپاہاں درکیسہ وہمیان داشتند درتماشائے آں جاں نوازاں دلربا برسرایشاں نثار کردند ودلدادگان بے خان وماں اسپ وسلاح وغلام وکنیزک وخیمہ دستوری فروختند ودرزیر پائے خوباں می ریختند . . . مسکین عاشقاں مستمندرا ازغلبہ ہوائے بتانِ آدمی رو وازشوق لقائے سادہ پسران بدخو خواب وخور فراموش گشتہ روز ہمہ روز بیہوش می بودند وشب ہمہ شب مدہوش ماندند۔

وازسخن مسخرگاں وبھنڈائی بھنڈان (بھانڈ) وبوالعجبی بازیگران وبے شرمی داستان کہ ازاطراف ممالک بدرگاہ رسیدہ بودند، دراطراف سراچہہائے سلطانی بازیہا می کردند و ہنرہائے خود می نمودند، داد سخن می دادند، ناداشتی وبھنڈائی را بنہایت می رسانیدند، از ہرطرف خندہائے قہقہہ برمی آمد ونظارگیان را حیرت رو نمود . . . . شہریاں رادرہوائے آں اقران ودرعیش آں سروقامتاں ماہ پاصرف شد ملکہا درگرو افتاد وخانہا وسرہا ازدست رفت و وامہا برگردن آمد۔ وملک زادگان دیوانہ شدند وخواجہ زادگان آشفتہ گشتند۔ ملتانی بچگان ازبود وسود باز افتادند وتونگرزادگان را اجلاس روئے نمود وبے خانماں شدگان راہ لکھنوتی گرفتند وعاقلاں شیدا شدند، وعالماں درمعصیت افتادند، وزاہداں ازتعبد دست برداشتند وعابداں درخمارخانہا گرفتند ننگ ونام ازجہاں برفت . . . . ودرقبہا شراب سبیل کردہ بودند وخمہائے خمر فروبردہ . . صفحہ ۱۲۳ ل ۱۲۵)

ضیائے برنی نے اپنے دیباچہ میں لکھاہے کہ وہ ابتدائے آدم کے وقت سے لیکر اپنے عہد تک کی

خ لکھنا چاہتا تھا لیکن طبقات ناصری کے ہوتے ہوئے جو اسی قسم کی عام تاریخ ہے اُس نے اس ارادہ کو ترک کر دیا صرف دارالملک دہلی کے آٹھ اخیر بادشاہوں کی تاریخ پر جن کی سلطنت کا بیان طبقات ناصری میں نہیں تھا اکتفا فیروز شاہی میں حسب ذیل سلاطین دہلی کی تاریخ ہے۔

) سلطان غیاث الدین بلبن	بیس برس	(۶۶۴-۶۸۶ھ ۱۲۶۶-۱۲۸۷ء)
) سلطان معزالدین کیقباد	تین برس	(۶۸۶-۶۸۹ھ ۱۲۸۷-۱۲۹۰ء)
) سلطان جلال الدین خلجی	۷ برس	(۶۸۹-۶۹۵ھ ۱۲۹۰-۱۲۹۶ء)
) سلطان علاء الدین خلجی	بیس برس	(۶۹۵-۷۱۵ھ ۱۲۹۶-۱۳۱۶ء)
) سلطان قطب الدین مبارکشاہ خلجی	۴ برس ۴ ماہ	(۷۱۶-۷۲۰ھ ۱۳۱۶-۱۳۲۱ء)
) سلطان غیاث الدین تغلق	۴ برس چند ماہ	(۷۲۰-۷۲۵ھ ۱۳۲۱-۱۳۲۵ء)
) سلطان محمد بن تغلق	۲۷ برس	(۷۲۵-۷۵۲ھ ۱۳۲۵-۱۳۵۱ء)
) سلطان فیروز شاہ	۶ برس (ابتدائی)	(۷۵۲-۷۵۸ھ ۱۳۵۱-۱۳۵۷ء)(صفحہ ۲۲-۲۳)

ضیائے برنی نے اپنے تاریخ کے ذرائع معلومات اس طرح بیان کیے ہیں کہ بلبن کی تاریخ اس نے اپنے پ اور دادا سے جو اُس بادشاہ کے زمانہ میں معزز عہدوں پر فائز تھے نیز دیگر سربرآوردہ اشخاص سے جو اس کے ہد میں بڑے بڑے عہدوں پر مامور تھے سنکر لکھی ہیں:-

> ''آنچہ ایں ضعیف از اخبار و آثار سلطان غیاث الدین بلبن در تاریخ آوردہ است از پدر و جد خود استماع دارد از ایشاں کہ در عہد او صاحب اشتغال خطیرہ بودہ اند کیفیت ملک داری او شنیدہ است
>
> (صفحہ ۲۵)

معزالدین کیقباد کی تاریخ اپنے باپ موید الملک اور اپنے استادوں سے سنے ہوئے واقعات کی بنا پر لکھی

> ''ایں ضعیف در جلوس سلطان معزالدین کیقباد نبیسہ سلطان بلبن خورد سال بودہ است، و آنچہ اخبار و آثار جہانداری او در تاریخ بیشتر ام از موید الملک پدر خود و از استادان خود کہ علامہ

> روزگار بودند سماع دارد" (صفحہ ۱۲۷)

سلطان جلال الدین خلجی کے عہد سے لیکر اخیر تک اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر لکھا ہے۔

> "آنچہ این ضعیف در اخبار و آثار جلالی و علائی و تا آخر درین تاریخ نوشتہ است، بر حکم مشاہدہ
> و معائنہ در قلم آوردہ" (صفحہ ۱۷۵)

اسی طرح ضیائے برنی کی کل تاریخ زبانی روایات اور ذاتی مشاہدات پر مبنی ہے۔ اُس نے اس کتاب کے لکھنے میں دوسری کتابوں یا معاصر مصنفوں سے نقل نہیں کی ہے۔

اس طریق تصنیف کا اُس کی کتاب پر بین اثر پڑا ہے۔ وہ ایک محقق مدقق کی طرح پر جس نے تمام جزئیات کا کامل تفحص کیا ہو اور ہر ہر واقعہ کے متعلق علمی تحقیقات انجام دی ہوں نہیں لکھتا، نہ وہ اپنی یا دوسروں کی تحریری یادداشتیں نہیں رکھتا ہے جس سے استفادہ کر سکے۔ وہ ایک عام داستان گو کے طریق پر اپنی تاریخ لکھتا ہے جس کی وجہ سے اسکا بیان شگفتہ رواں اور دلچسپ ہے۔ وہ واقعات کو بنظر مجموعی دیکھتا اور عام حیثیت سے لکھتا ہے۔ اُس کے بیان میں اُسکا انداز بہ نسبت ایک وقائع نویس کے ایک عام مورخ کا ہے جو ترتیب واقعات اور استقصائے جزئیات کے متعلق تو زیادہ فکر نہیں کرتا لیکن مجموعی اور عام تصورات کو پیش نظر رکھتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے تاریخ کی اس نوعیت سے بخوبی آگاہ ہے۔ چنانچہ محمد تغلق کے عہد میں وہ لکھتا ہے:-

> "من درین تاریخ کلیات مصالح جہانداری و اہمات امور ملک داری سلطان محمد نبشتہ و در تقدیم
> و تاخیر ہر فتح ما اول و آخر ہر سرگذشتے و فتنہ و حادثہ نظر نینداختہ و ترتیب و نسق مراعات نمودہ
> کہ اہل دانش را از مطالعہ کلیات مصالح جہانداری و اہمات امور ملک رانی اعتبار حاصل
> شدنی است . . . ." (صفحہ ۴٦٧)

ضیائے برنی کے اس انداز بیان اور طریق تاریخ نگاری کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ باوجود راستباز ہونے کے جابجا غلطیاں کر گیا ہے۔ وہ اپنی تاریخ میں تاریخوں اور سنین کو بہت کم لکھتا ہے اور غالباً جو سنین و تواریخ لکھی ہیں وہ زبانی یادداشت سے لکھی گئی ہیں اسی وجہ سے سنین اور واقعات کی ترتیب میں جابجا اُس کے بیانات غلط ہیں۔ بعض واقعات کے متعلق اُس کی اطلاعات بہت تھوڑی اور برائے نام ہیں۔ بعض واقعات جو لکھی

جانے کے قابل تھے نظر انداز ہو گئے ہیں۔ اُس نے تاریخ کا اصلی مقصد بجائے صحت و ترتیب واقعات کے محض علمی یعنی اخلاق آموزی قرار دیا ہے۔ اگر بجائے زبانی اطلاعات اور ذاتی معلومات پر اکتفا کر لینے کے وہ علمی تفحص اور تحقیقات سے بھی کام لیتا تو وہ ان نقائص سے بڑی حد تک محفوظ رہ سکتا۔ یہ سچ ہے کہ اُس کے سامنے ایسی کتابیں نہ تھیں جو صحیح معنی میں اس دور کی تاریخیں کہی جا سکتیں لیکن معاصر مصنفین کی ایسی کتابیں موجود تھیں جن سے استفادہ کر کے واقعات کی تصحیح ہو سکتی اور مزید معلومات بہم پہنچ سکتی تھیں۔ خود اس کے دوست خسرو کی کتابیں بلبن کے عہد سے لیکر غیاث الدین تغلق کے وقت تک کار آمد ہو سکتی تھیں۔ اس کے علاوہ بعض دیگر مصنفین مثلاً کبیر الدین عراقی مصنف فتحنامہائے علائی (صفحہ ۱۴) سے وہ مدد لے سکتا تھا لیکن اُس نے اس طرف کبھی توجہ نہیں کی جو افسوسناک ہے۔ خسرو کے علاوہ دیگر مصنفین عہد کی کتابیں بالعموم تلف ہو چکی ہیں اور جو سہولت ضیائے برنی کو ہو سکتی تھی وہ اب مفقود ہے۔

ضیائے برنی کی ہر قسم کی غلطیوں اور کمیوں کو بالتفصیل بیان کرنیکا یہ موقع نہیں ہے اس بحث کو ہم اُس کتاب کے لئے محفوظ رکھتے ہیں جس کا ہم نے اس مضمون کے تمہید میں ذکر کیا ہے۔ محض مثال کے طور پر چند باتیں لکھے دیتے ہیں۔ بلبن کا سنہ جلوس اس نے سنہ ۶۶۲ھ بتایا ہے، حالانکہ صحیح سنہ ۶۶۴ھ ہے کیقباد کا سنہ ۶۸۵ھ لکھا ہے حالانکہ صحیح سنہ ۶۸۶ھ ہے جلال الدین خلجی کا سنہ ۶۸۸ھ لکھا ہے حالانکہ صحیح سنہ ۶۸۹ھ ہے۔ اُس نے عہد علائی کی فتوحات دکن کو جو اُس عہد کی تاریخ کا ایک نہایت اہم اور دلچسپ حصہ ہیں چند الفاظ میں بیان کر کے چھوڑ دیا ہے۔ اُس نے اسی عہد کے مغلوں کے تمام حملوں کا ذکر نہیں کیا۔ محمد تغلق کے عہد کے واقعات میں بڑی بے ترتیبی اور غلطیاں پائی جاتی ہیں جن کی تصحیح ابن بطوطہ کے بیانات سے ہو جاتی ہے (دیکھو دیباچہ انگریزی ترجمہ سفرنامہ ابن بطوطہ جلد دوم مترجمہ خانصاحب مولوی محمد حسین مرحوم مطبوعہ دار الاشاعت پنجاب صفحہ ۱۸۹۸) بلبن کا عہد پورے طور پر جانچے جانے کے قابل ہے۔

ضیائے برنی جیسا کہ ہم پہلے بھی دیکھ چکے ہیں تاریخ کو علمی فوائد کا آلہ بنانا چاہتا ہے۔ وہ تاریخ کو تجربہ، اور مواعظ و عبرت کا خزانہ سمجھتا ہے اُسکا میلان وعظگوئی اور پند آموزی کیطرف ہے۔ وہ جا بجا وصایا اور نصائح کے بیان میں دلچسپی لیتا ہے (دیکھو وصایائے بلبن صفحہ ۶۹-۸۰ و ۹۵-۱۰۶ اور وصایائے سلطان ناصر الدین

بغرا خاں پسر بلبن صفحہ ۱۵۲-۱۵۶، نصائح قاضی مغیث الدین بسلطان علاء الدین صفحہ ۲۸۹-۲۹۶) ان نصائح میں ملک داری اور احکام سلطنت کے طریقوں کو بیان کیا گیا ہے، جو اُس زمانہ کے فلسفہ سیاسیات اور اُسکے نظریوں کو بتلاتے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ اکثر پند و نصائح جو ان اشخاص کی طرف منسوب کئے گئے ہیں اُن تقریروں کی طرح جو یونانی مورخ تھیوکی ڈائیڈس ( ) نے یونان کے مشاہیر کیطرف منسوب کئے ہیں، بہ نسبت صحیح تاریخی واقعات ہونے کے زیادہ تر فرضی ہیں، اگرچہ وہ ان لوگوں کے اخلاقی، سیاسی اور تمدنی تصورات اور اُس عہد کے متداول خیالات کو صحیح طور پر ظاہر کرتے ہیں۔ اخلاقی حیثیت سے سب سے زیادہ جو چیز اُسے غور کرنے اور عبرت کا درس دینے کیطرف مائل کرتی ہے وہ انقلابِ تاج و تخت ہیں۔ ایسے موقعوں پر وہ کائنات پر ایک حکیمانہ نظر ڈالتے ہوئے دنیا کی بے ثباتی دکھاتا ہے اور بعض اوقات اُسکا بیان شاعرانہ لطف حاصل کر لیتا ہے۔ جلال الدین خلجی بلبن کے محل "کوشک لعل" میں تخت نشینی کے لئے آتا ہے۔ اُس وقت اُسے بلبن کا عہد اور اُسکا جاہ و جلال یاد آتا ہے جبکہ جلال الدین ایک معمولی امیر کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ اصطبل کے قریب فوراً گھوڑے سے اتر پڑتا ہے اور محل میں پہنچ کر وہ اپنے امراء کو مخاطب کر کے اس طرح بیان کرتا ہے: —

> "و مرا ایں زمان وہم چنیں وہم افتاد کہ سلطان بلبن در دل ایں کوشک بر تخت نشستہ است و بار داده و من پیش او می روم و من ایں پادشاہ را درون ایں کوشک بسیار خدمت کردہ ام و مرا دل می زند۔ و ہیبت و حشمت ہنوز از دل من نرفتہ است"

اس کے بعد سلطان جلال الدین اُس جگہ جہاں بلبن کے امراء بیٹھا کرتے تھے جا بیٹھتا ہے اور قبل اس کے کہ کسی سے بات کرے دستار کے پلو کو آنکھوں پر رکھکر زار زار روتا ہے اور کہتا ہے:

> "پادشاہی ہمہ فریب و نمائش است، و اگرچہ بیرون نقش و نگاری می نماید و لیکن درون زار زار است .... ایں زمان از روئے تجربہ می اندیشم کہ آنچناں پادشاہے کہ سلطان بلبن بود چہل سال در خانی و پادشاہی ملک راند و آنچناں پسران شائستہ و برادرزادگان نامور و ارکان ملک و ملکت و بندگان و بزرگان با چنداں حشمت و عظمت او داشت کہ بیخ ہر یکے از اعوان دولت

او باب رسیده بود و ہیچ کدامی از شریکان و مخالفان و مزاحمان در ملک او نمانده و سه سال بیش نیست که او نقل کرده است و بر تخت او نبیرہ او نشسته است این زمان درین جمع نظر می کنم بجز سه چهار کس ازاں جمع نمی بینم و از چنداں کوکبه و دبدبه و انبوهی کسے در نظر می آید . . . . . . برآں چناں پادشاہے قاہرے کامگارے فرزندان پادشاہی نماند و بفرزندان او چنانچه باید نه رسید بر ما چه گونه خواهد و بفرزندان ما چگونه میراث خواهد رسید . . . کسیکه بملک می رسد بیک دو خود را فرزندان خود را و خویش و تبع خود را در می بازد" (صفحه ۱۷۸ - ۱۸۰)

اُن کوتاہیوں کے باوجود جو ضیائے برنی میں پائی جاتی ہیں وہ اُس عہد کے لئے ایک ناگزیر موقع ہے جس کے بغیر اس عہد کی تاریخ کا مطالعہ ممکن نہیں ہو سکتا بحیثیت مورخ کے ہمارے خیال میں اُس کی قدر و قیمت حسب ذیل امور پر مبنی ہے۔

(۱) وہ تین چوتھائی صدی کے لئے ایک معاصر مورخ ہے اور بقیہ ربع صدی کے لئے وہ نہایت قریبی مورخ ہے۔

(۲) وہ حرفت و نسبت کے لحاظ سے مورخ ہے جس نے اس فن کو اپنے لئے مخصوص کر لیا تھا اور اسوجہ سے واقعات کو مورخانہ نقطۂ نظر سے دیکھنے کا عادی تھا۔

(۳) وہ اُس عہد کے اکثر مشاہیر اور سربرآوردہ اشخاص سے جنہوں نے اُس عہد کی تاریخ کے بنانے میں حصہ لیا اور کارہائے نمایاں انجام دئے ذاتی طور پر واقف تھا۔

(۴) اُسکا مشاہدہ بالعموم عمدہ ہے اگرچہ وہ واقعات سے عام طور پر بغیر ترتیب و نسق کے بحث کرتا اور واقعہ نگار کی حیثیت سے غلطیاں کر جاتا ہے۔

(۵) وہ راست باز اور متدین ہے اور اگرچہ اُن معتقدات اور تعصبات سے بالا نہیں ہے جو اُس زمانہ میں عام طور پر پائے جاتے ہیں اُس کے متعلق یہ اعتراض کہ اُس نے دیدہ و دانستہ کہیں غلط بیانی سے کام لیا ہے صحیح نہیں ہے بعض ناقدوں نے اُس کے بعض بیانات کو اخفائے حق سے تعبیر کیا ہے۔ مثلاً اُس روایت کے بنا پر جو ابن بطوطہ نے نقل کی ہے خیال کیا گیا ہے کہ سلطان محمد نے اپنے باپ تغلق کو ایک صنعت

سے تیار کئے ہوئے محل کو گروا کر اُسے مروا ڈالا۔ ہمارے خیال میں یہ روایت خالی از شبہ نہیں ہے اور اگر یہ واقعہ صحیح بھی ہو تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ضیائے برنی کو اسکا علم تھا۔ یہ سچ ہے کہ محمد تغلق اس کا مربی اور محسن تھا لیکن ضیائے برنی نے اُس کی سیرت کے بیان میں اُس کے عیوب کو نہیں چھپایا ہے۔

(۶) ضیائے برنی نے تاریخ کا جو موضوع قرار دیا ہے۔ وہ تذکرہ کے موضوع سے نہایت قریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سیرت نگاری میں غیر معمولی دلچسپی لیتا اور اُس میں ید طولیٰ رکھتا ہے۔ ہمارے خیال میں اُسکی بہترین خوبی سیرت نگاری میں ہے۔ اُس دور نے بعض غیر معمولی شخصیتیں پیدا کیں مثلاً بلبن، علاء الدین، محمد تغلق۔ اس کی لکھی ہوئی سیرتیں مکمل متحرک اور زندہ ہیں اور اُنکے متعلق اس کی تنقید منصفانہ ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ان میں سے بعض شخصیتیں بہت دشوار اور پیچیدہ ہیں جن کے بعض واقعات کی ضیائے برنی صحیح تعبیر نہیں کر سکا ہے مثلاً محمد تغلق کے انتظامات اور اصلاحات کی تہ تک نہیں پہنچا۔ محمد تغلق ان لوگوں میں تھا جو اپنے زمانہ سے آگے چلتے ہیں اور جنہیں انکے معاصر صحیح طرح نہیں سمجھ سکتے۔ سکہ میں جو اُس نے تبدیلیاں کیں وہ معاشی اصول پر مبنی تھیں جنہیں اُس عہد کے لوگ نہیں سمجھ سکے۔ اسی طرح بعض انتظامات علاء الدین کے بھی صحیح طور پر نہیں سمجھے گئے۔

(۷) اُس کی کتاب کا کوئی بدل نہیں ہے۔ اس کی معلومات کی تصحیح ہو سکتی ہے اور ان میں اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے لیکن اگر ہم تاریخ فیروز شاہی کو علیحدہ کر لیں تو اُس عہد کی پوری تاریخ مرتب نہ ہو سکے گی نہ اُس عہد کی شخصیتوں کو ہم سمجھ سکیں گے۔

(۸) باایں ہمہ وہ ہندوستان کا سب سے پہلا ہندوستانی مورخ ہے جو بجائے خود کچھ کم موجب فخر نہیں ہے۔

غزل

از مولنا سید شرف الدین صاحب یاس استاذ جامعہ ملیہ اسلامیہ

اپنی قسمت کو ترے ہجر میں رونے والے
سونے دینگے نہ تجھے چین سے سونے والے
مجھکو مارا ہے محبت سے تو نادم بھی نہ ہو
او جفا کر کے پشیمان نہ ہونے والے
خاک و خوں میں نہ تڑپتا ہوا اب چھوڑ کے جا
دل میں او ناوک بیداد چبھونے والے
تم بھی دیکھو تو اسے کہتے ہیں فریاد و فغاں
میں بھی دیکھوں تو بڑے چین سے سونے والے
قتل عشاق پہ اس ناز بجا کے صدقے
او مرے خون کو دامن سے نہ دھونے والے
انکی بچپن میں اسی جنس کی بکری تھی فقط
دل ہی دل بیچتے پھرتے تھے کھلونے والے
کچھ بھی اب وہم دل آزردگی غیر نہیں
او مری نعش پہ منہ ڈھانپکے رونے والے

سختیاں ہجر کی اٹھ سکتی ہیں کس سے اے یاس
ان پہاڑوں کے فقط ہیں ہمیں ڈھونے والے

شمالی اور دکھنی اُردو کی علیحدگی

دکھنی اور اردو کے صوتی اور لسانی اختلافوں کی اہمیت اُن علم دوستوں پر ظاہر ہے جنہیں کبھی اس بارے میں غور کرنے کا موقع ملا ہے۔ افسوس ہے کہ فنی اصطلاحات کی دقتوں کی وجہ سے انکے متعلق فی الحال کوئی خیالات اُردو زبان میں پیش نہیں کئے جاسکتے۔ صرف انکے اسباب و علل کی نسبت چند مختصر سے نوٹ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

یہاں اس امر کا اظہار بھی نامناسب نہ ہوگا کہ دکھنی کی ابتداء، ارتقاء، عروج و تنزل پر اتبک پہلے تو اصلی اور صحیح ذریعوں سے مدد لیکر بہت کم لکھا گیا ہے اور جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اس خیال پر مبنی ہے کہ دکھنی اور اردو ایک ہی زبان کے دو نام ہیں، یا پہلی کو دوسری سے جو تعلق ہے وہ بالکل ایسا ہے جیسے ایک گندہ اور بھونڈی لڑکی کو اپنی پاکیزہ اور حسین ماں کے ساتھ ہوتا ہے۔

اس باطل خیال کی وجہ سے اتبک دکھنی اور اردو دونوں کے بولنے والے متعدد غلطیوں کے مرتکب ہوتے رہے ہیں اور انکی نوعیت اور نتائج دونوں اس قدر اہم ہیں کہ اگر اس وقت بھی انپر غور و خوض نہ کیا جائے تو کئی طرح کی خرابیوں کا اندیشہ ہے۔

خشت اول چوں نہد معمار کج　　تا ثریا می رسد دیوار کج

یہ چند تمہیدی جملے اور خود نفس مضمون اس توقع پر مبنی ہیں کہ اردو کی لسانی حیثیت میں دلچسپی لینے والے اسپر بھی غور و خوض کریں۔

برٹش میوزیم
۲۹ ستمبر سنہ ۲۸ء

سید محی الدین قادری

سلطان علاء الدین، اُس کے سپہ سالار ملک کافور، اور سلطان محمد تغلق کے ساتھ شمالی ہند کے امیرو

عالموں، فوجیوں، تاجروں اور کاریگروں نے جب دکن کا رُخ کیا اُس وقت خود اُنکی زبان عبوری حالت میں تھی۔ ان طبقوں کے افراد (جن میں سے اکثر دکن میں آباد ہو گئے اور بعض شمال کو واپس بھی ہوئے) جو غیر معین ہندلمانی[ملہ] اُس وقت بولتے تھے۔ اُسی کو دکن کے وہ عربی النسل یا ایرانی مسلمان بھی استعمال کرنے لگے جو یا تو سندھ اور گجرات سے دکن میں آئے تھے یا مغربی ساحل سے داخل ہوئے تھے۔ اس زبان کی تشکیل اور ترویج میں اُن نَومسلموں نے بھی خاصہ حصہ لیا ہوگا جن کی مادری زبانیں دکن کی دیسی زبانیں تھیں لیکن جو اپنے ہم مذہبوں سے متحد رہنے کی خاطر فطرتاً ایک مشترکہ زبان کے خواہشمند تھے۔

جب دکن اور شمال سیاسی حیثیت سے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے اور اُنکے درمیان تعلقات منقطع ہو گئے تو ان دونو جگہوں کی ہندلمانیوں نے بھی جدا جدا طریقوں پر نشو و نما حاصل کرنی شروع کی۔ شمال کے مسلمانوں کی طرح دکھنی مسلمانوں کو بھی غیر زبان بولنے والے ہمسایوں سے سابقہ پڑا لیکن ان دونو جگہ کے ہمسایوں میں کئی طرح کا فرق تھا۔ شمال کے ہندوؤں کی زبان بالعموم ایک ہی تھی اور دکن والوں کی چار سے زیادہ۔ اس کے علاوہ دکن کی تمام زبانیں سوائے مرہٹی کے دراوڑی نسل سے تھیں اور شمال کی خالص آریائی۔

لسانیاتی قوانین کے مطابق شمالی اور دکھنی ہندلمانیوں پر تغیرات کا ہونا لازمی تھا۔ لیکن شمالی ہندلمانی اور دکھنی ہندلمانی پر ایک ہی قسم کے تغیرات نہیں ہوئے کیونکہ دونوں جگہوں کی دیسی زبانوں کے علاوہ وہاں کی آب و ہوا اور وہاں کے سیاسی حالات بھی بالکل مختلف تھے۔ رفتہ رفتہ دکھنی ہندلمانی شمالی سے علحدہ ہو گئی اور آخرکار ایک کا نام دکھنی پڑ گیا اور دوسری کا اُردو۔

دکھنی اور شمالی ہندلمانیوں پر جن جن طریقوں سے تغیر ہوئے ان پر چند اجمالی اشارے یہ ہیں:

[ملہ] چونکہ عہد محمد شاہ سے قبل اردو یا ریختہ کے لئے کوئی خاص اصطلاح موجود نہ تھی بلکہ اسوقت اُردو کو ہندی یا ہندوی کہتے تھے جو آجکل ایک خاص زبان کا نام ہے اس لئے اُس زبان کیلئے جو ہندو اور مسلمانوں کے ملاپ سے ہندوستان کے متفرق حصوں میں پیدا ہوئی تھی ہم نے ہندلمانی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ لفظ ہندو مسلمانوں سے مرکب ہے۔ اسکو سب سے پہلے مرحوم وحید الدین سلیم نے ایک اور مفہوم میں استعمال کیا تھا۔

(۱) شمال بہ نسبت دکن کے اُن ممالک سے قریب تھا جہاں کی مادری زبان فارسی اور ترکی تھی۔ وہاں بہ نسبت دکن کے ایرانی، افغانی، ترک اور مغل زیادہ آتے رہے قطب الدین ایبک سے بہادر شاہ ظفر تک جتنے حکمران مسلسل گذرے وہ سب یکے بعد دیگرے ان شمالی حملہ آوروں میں سے تھے جن کی زبانیں ہندوستان کے لئے اجنبی تھیں۔ اس کے برخلاف دکن کے حکمران خاندانوں کے بانی وہی تھے جو دکن یا ہندوستان میں ایک مدت سے مقیم تھے اور دکن کی زبان اور طرز معاشرت سے مانوس تھے۔

حکمران سلسلوں کے بانیوں کے علاوہ شمال کے بالعموم تمام بادشاہوں کی زبان بھی فارسی یا کوئی اور بیرونی زبان تھی۔ محمد تغلق سے لیکر محمد شاہ اختر تک کسی شمالی بادشاہ نے ہندلمانی میں نہ نثر لکھی نہ نظم۔ اس کے خلاف دکن میں کئی بادشاہ ایسے گذرے ہیں جن کی دکھنی نظم اور نثر اس وقت بھی موجود ہے۔

---

(۲) جب کبھی ترکستان، ایران یا افغانستان میں کوئی سیاسی انقلاب ہوتا یا تباہی آتی تو وہاں کے باشندے پناہ لینے کے لئے یا تلاش معاش کی خاطر ہندوستان ہی کا رخ کرتے چنانچہ آئے دن نوواردوں کی ٹکڑیاں ہندوستان میں داخل ہوتی رہتی تھیں اور چونکہ دہلی کے امیروں اور قدردانوں کے دسترخوان کی وسعت میں اس وقت تک کوئی کمی نہیں ہوئی تھی اس لئے سب کے سب وہیں جم جاتے۔ اور یہی نووارد چند ہی دنوں میں بادشاہوں کے درباروں میں رسائی کرکے ملک میں بڑے بڑے مرتبے حاصل کرلیتے۔ غرض سپہ سالار سے لیکر ایک معمولی سپاہی تک اور وزیر اعظم سے ایک معمولی منشی تک ہر جگہ اکثر ایک ٹھیٹ ولایتی منتخب ہوتا۔ کیونکہ انتخاب کرنے والا خود ولایتی ہوتا تھا۔

بیرونی ہند سے خانگی درآمدوں کے علاوہ اکثر شمال مغرب کی جانب سے حملے ہوا کرتے تھے جن کا سلسلہ احمد شاہ درانی کے پانچویں حملے تک برابر جاری رہا اور یہ تمام حملہ آور غیر زبانیں بولنے والے تھے

سیاسی تحریکات کے علاوہ ہر وقت بیرونی اثر غالب رہتا تھا۔ شاہی درباروں سے، محمد شاہ کے زمانہ تک بھی، بالعموم بحیثیت ولایتی (ایرانی) شاعر گراں بہا صلے لیکر اپنے اپنے وطنوں کو شاد کام واپس جاتے تھے۔ ایرانی نوواردوں کی قدر میر اور سودا کے زمانہ تک باقی تھی۔

غرض ان فارسی گو امیروں، سپاہیوں، عالموں، شاعروں وغیرہ کی آئے دن آمد اور اقتدار و اثر کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمال میں سب کے لئے فارسی گوئی لازمی ہوگئی اور اگر کبھی کچھ مہلت پاکر فارسی کا زخم مندمل بھی ہونے پاتا تو پھر دوبارہ فارسی گویوں کا ایسا حملہ ہوتا کہ وہ زخم از سر نو ہرا ہو جاتا۔ اس طرح شمال کے باشندے اپنی ہندلمالی میں ترقی نہیں کر سکے۔

دکن فارسی گو ممالک سے دور تھا۔ اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہاں ایرانی نہیں گئے لیکن جو بھی گئے انہوں نے خود کی ذات کو دکن میں محو کر دیا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ وہاں بادشاہ دیسی زبان استعمال کرتا ہے تو انہوں نے بھی اس کے استعمال کو اپنے لئے ننگ و عار نہیں سمجھا۔ نیز وہاں ایرانی ہی برسر اقتدار نہیں رہے۔ دکن کی قدیم تاریخوں کا مطالعہ اس بات کے کئی ثبوت پیش کرتا ہے کہ وہاں کے دیسی باشندوں نے ہمیشہ اجنبیوں کو زیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ وہ اکثر دفعہ ان کوششوں میں کامیاب بھی رہے۔ وہاں کے عالم زیادہ تر دیسی ہی ہوتے تھے۔ اور جو دیسی نہ ہوتے وہ دیسیوں کی تفہیم کی خاطر مذہبی کتابیں وغیرہ دیسی زبان ہی میں لکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

(۳) شمال کے ہندو اور مسلمانوں میں زیادہ اتحاد و یکجہتی نہیں رہی۔ آخر آخر میں اکبر کے زمانہ میں اس کی جھلکیں نظر آتی ہیں لیکن وہ بھی دیرپا نہیں ثابت ہوئیں۔

دکن میں ابتدا ہی سے ہندو مسلمان متحد تھے۔ دکن کی شمال سے علٰحدگی کا آغاز ہی ہندو مسلم اتحاد (اگر کچھ تھا بھی) یا میل جول صرف معاشرتی اغراض پر مبنی تھا۔ دکن کے مسلمان معاشرتی اور تمدنی ضرورتوں کے علاوہ سیاسی ضرورتوں کی بنا پر بھی اپنے ہم ملکوں سے متحد تھے۔ دکنی بحیثیت مجموعی شمال سے علٰحدہ ہونا چاہتے تھے۔ وہاں کے امیر شمالی امیروں کے مخالف تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ شمال سے لوگ دکن جائیں اور ان کے معاملات میں دخل دیں۔ چنانچہ اپنی اس آزادی

اور خود مختاری کی خاطر انہیں اپنے ہم ملکوں سے متحد ہو کر اُنکے دوش بدوش رہنا پڑا ۔ وہاں کے پہلے مسلمان حکمراں حسن گنگو سے لیکر آخری بادشاہ ابوالحسن تانا شاہ تک تقریباً ہر ایک کے درباری ہندو وزیر یا عہدہ دار موجود تھے ۔

اس طرح شمال کے مسلمان عہدیداروں اور حاکموں کو ہندستانی میں بات چیت کرنے کی بہت کم ضرورت پڑی اس کے خلاف دکن میں ابتدا ہی سے اس میں ترقی ہوتی گئی ۔

(۴) شمال میں اگرچہ درباروں اور مجلسوں میں ہندو اور مسلمان امیروں اور عالموں کو بہت کم ملنے جلنے کا اتفاق ہوتا تھا لیکن بازاروں اور لشکروں اور رات دن کے کام کاج میں دونو قوموں کے عوام کو ایک دوسرے سے ہر وقت سابقہ رہتا تھا ۔ اس میل جول کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں قوموں کے عوام کی بول چال (یعنی ہندستانی) مشترک ہوتی گئی ۔ اور چونکہ شمالی ہندو ایک ہی قسم کی زبان بولتے تھے اس لئے مرور ایام کے ساتھ اس میں صفائی اور پختگی بھی پیدا ہوتی رہی ۔ تاہم دونو قوموں کی ادبی (یا لکھنے کی) زبانیں ایک زمانہ تک قطعاً جدا جدا تھیں ایک کی پراکرت یا سنسکرت تھی تو دوسری کی فارسی یا عربی ۔

اس بارے میں دکن کی حالت بالکل مختلف تھی وہاں اگرچہ بالعموم ہندو اور مسلمان متحد تھے لیکن ان دونوں کی زبانوں کی متحدہ ترقی میں قسم قسم کی رکاوٹیں تھیں پہلے تو مسلمان جو ہندستانی بولتے ہوئے دکن میں داخل ہوئے وہ وہاں کی دیسی زبانوں کے موافق نہ تھی کیونکہ وہ مرکب تھی شمالی ہند کی دیسی زبان اور فارسی سے اور شمال کی دیسی اور دکن کی دیسی زبانوں میں خاصہ فرق تھا ۔

دکھنی مسلمانوں کے لئے لازمی تھا کہ وہ اپنی بول چال میں اپنے ہمسایوں کی زبان کے بعض اجزا بھی شامل کر لیتے لیکن یہ امر بھی دقتوں سے خالی نہ تھا ۔ انکے ہمسایوں کی زبان ایک تو تھی نہیں وہ چار سے زیادہ تھیں ۔ خود اُنکے آپس میں بہت زیادہ اختلاف تھا اور وہاں کار برآری کے لئے چاروں زبانوں سے واقفیت یا کم از کم اُن کے الفاظ کا میل جول لازمی تھا ۔

(۵) شمالی ہندوؤں اور مسلمانوں کی بول چال کی زبان (یا ہندلمانی) میں بعد میں بہت کم فرق باقی رہ گیا تھا۔ اور رفتہ رفتہ یہ یگانگت اس قدر گہری ہوتی گئی کہ مغلوں کے آخری زمانہ میں جب ہندو اور مسلمان سیاسی حیثیت سے بھی متحد ہونے لگے تو بول چال کی زبان کے علاوہ دونوں کی ادبی زبان بھی مشترک ہونے لگی۔ چنانچہ ہندو بھی فارسی میں لکھنے لگے۔ اور اُن کی ان فارسی تحریروں کی وجہ سے ان کی بول چال کی زبان بھی متاثر ہوئی۔ وہ اس میں بھی فارسی کے خاصے الفاظ استعمال کرنے لگے اور بہت جلد ان کی بول چال فارسی آمیز ہو گئی۔

اس کے خلاف، دکھنی ہندوؤں اور دکھنی مسلمانوں کی زبانوں میں لسانیات کی رو سے بھی فرق تھا۔ کیونکہ دکھنی مسلمانوں کی ہندلمانی کا آغاز دکن میں نہیں ہوا تھا۔ اُنکا ڈھچر ٹھیٹ شمالی اور آریائی تھا۔ دکھنی ہندوؤں کی زبانیں زیادہ تر دراوڑی تھیں اور دکھنی مسلمانوں کو اپنے ہمسایوں سے متحد رہنے کے لئے اس امر کی ضرورت تھی کہ وہ رفتہ رفتہ اُن کی زبانوں سے بھی متاثر ہوتے اور فارسی یا کسی اور بیرونی زبان کے الفاظ کم سے کم استعمال کرتے۔ وہ جتنے زیادہ فارسی کے الفاظ اپنی زبانوں میں ملاتے اتنا ہی اپنے ہم ملکوں میں اجنبی رہتے۔ اور اُنکے روزمرہ کے کام کاج میں دقتیں پیش آتیں غرض فارسی اور دراوڑی اثر نے بھی ان دونوں جگہ کی ہندلمانیوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے میں خاصہ کام کیا۔

حالات حج

(بسلسلہ سابق)

علیگڑہ پارٹی سے بھی ملاقات ہوئی - پروفیسر حمیدالدین خاں کہنے لگے کہ میں تو وہابیوں کا طرفدار تھا مگر مدینہ میں انکے جو جرائم دیکھے وہ ناقابل معافی ہیں - انہوں نے قبروں کے گنبد گرا دئے ہیں جن پر آیات لکھی ہوئی تھیں - علاوہ بریں قاضی مدینہ دو گھنٹہ تک مسجد نبوی میں بیٹھے رہے اور ان کے پاؤں روضہ اطہر کیطرف تھے -

ان دونو شکایات پر پروفیسر صاحب جملہ وہابیوں سے بیزار ہوگئے تھے -

مولوی سلیمان اشرف صاحب ہمارے پرانے کرم فرما بھی اس قافلہ میں تھے جو وہابیوں کے قدیمی مخالف ہیں - کہنے لگے کہ دیکھئے آج پانچ تاریخ ہوگئی ہے مگر ابتک اعلان نہیں ہوا کہ حج کس دن ہوگا - میں نے کہا کہ دستور یہ ہے کہ حج کمیٹی حج کے دن کا اعلان ۶ ذوالحجہ کو کرتی ہے جبکہ نجدی اور یمنی قافلے آچکتے ہیں کیونکہ ان سے رویت ہلال اور تعین تاریخ حج میں شہادت اور مدد ملنے کی توقع رہتی ہے - لیکن مولانا اس جواب سے مطمئن نہ ہوئے اور کہنے لگے کہ پچھلے سال عین وقت پر نجدیوں نے محض اس وجہ سے کہ لوگ جمعہ کے حج کو حج اکبر نہ سمجھیں تاریخ بدلکر حاجیوں کو پریشان کیا تھا -

میں نے جب اس امر کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ مولانا کا بیان صحیح نہ تھا - پچھلے سال بھی حسب معمول ۶ تاریخ کو اعلان ہوا تھا اور کوئی تبدیلی اس میں نہیں کی گئی تھی - نجدی تو خود عوام الناس کی طرح جمعہ کے حج کو حج اکبر سمجھتے ہیں اور انکی کتب میں اسکی تصریح ہے - مولانا نے مناسک حج پر ایک کتاب لکھی تھی جس کی نسبت بار بار فرماتے تھے کہ میں نے بہت اچھی کتاب لکھی ہے مجھے بھی ایک نسخہ دینا چاہا مگر میں نے اس وجہ سے نہیں لیا کہ جہاز پر اسکو ایک مسافر کے پاس دیکھ چکا تھا -

یہ کچھ دستور سا ہوگیا ہے کہ اکثر مولوی جب حج کو جاتے ہیں یا اسکا ارادہ کرتے ہیں تو مناسک پر کوئی کتاب یا رسالہ لکھ ڈالتے ہیں جس میں حج کے فرائض کی صرف ظاہری شکلوں سے بحث ہوتی ہے جن کا بڑا حصہ عملاً بیکار ثابت ہوتا ہے۔ ان کتابوں اور رسالوں کی اسقدر کثرت ہوگئی ہے کہ اب کچھ لکھنا لاحاصل ہے۔ اصل ضرورت حج کے حقائق سمجھانے کی ہے جن کے متعلق ایک حرف بھی ان میں نہیں ہوتا۔

ڈپٹی زین الدین صاحب اس مختصر قافلہ کے امیر تھے۔ اور غالباً اسی کتاب کے قوانین وضوابط کے ماتحت جرمانے اور تاوان لگاتے تھے۔ پروفیسر حمیدالدین خاں کہنے لگے کہ مجھ پر چار "درم" (قربانیاں) عائد ہوچکی ہیں۔ ایک بار جامہ احرام سوتے میں سر پر آگیا تھا۔ دوسری بار کندھے پر پھینکتے ہوئے۔ تیسری بار کسی غیر کا دامن سر پڑ گیا تھا۔ چوتھی بار غالباً کوئی لونگ کھالی تھی۔

میرے ساتھ بٹوے میں لگے ہوئے پان تھے جو میں ہندوستان سے لے گیا تھا۔ اس کو پیش کیا پروفیسر نے منہ میں ڈالا مگر چونکہ اس میں الائچی تھی اس وجہ سے فوراً تھوک دیا اور منہ صاف کر ڈالا۔ ورنہ قریب تھا کہ فرد جرم لگ جائے۔

ایک طرف فقہ کی یہ شدت تھی اور دوسری طرف یہ خفت کہ ہمارے ترک بھائی دین تو کجا اس میں قانون بننے کی بھی صلاحیت نہیں تسلیم کرتے تھے۔

مولوی محمد سلیم صاحب ظہور حسین وارڈ کے پرانے سب پراکٹر بھی مکہ میں ملے۔ روزانہ شام کو وہ اسی طرح پورے لباس میں حرم شریف میں آتے ہیں جس طرح مغرب کے وقت ظہور وارڈ سے کالج کی مسجد میں آیا کرتے تھے۔

ایک نوجوان ترک ڈاکٹر معہ چند ترکوں کے ہم لوگوں سے ملنے کے لئے تشریف لائے۔ میں نے کہا کہ آپ لوگوں نے یہ کیا کیا کہ اپنے دستور اساسی سے فلاں فلاں دفعات جو اسلام کے متعلق تھیں نکال ڈالیں۔ ڈاکٹر نے اس کے جواب میں زور شور سے ترکوں کے اسلامی کارنامے بیان کئے اور کہا کہ کیا ایسی قوم کی نسبت یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ اسلام کو چھوڑ بیٹھی۔ میں نے کہا کہ ترک مسلمان سہی مگر جو حکومت یہ کہدے کہ میرا دین اسلام نہیں وہ یقیناً کافر ہے۔

اس کے جواب میں ڈاکٹر کے طویل بیان کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ بیکار نہیں ہے بلکہ غیر ضروری اعلان کا حذف ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ ترک مسلمان ہیں پھر اس کے لئے دستور اساسی میں دفعات رکھنے کے کیا معنی۔

لیکن مولوی ظفر علیخاں صاحب کی اس جواب سے تسلی نہیں ہوئی۔ انہوں نے دو ایک یوروپین سلطنتوں کی مثالیں پیش کیں کہ باوجود عیسائی ہونے کے بھی انکے دستور اساسی میں حمایت عیسویت کے دفعات موجود ہیں۔

ڈاکٹر کا جواب یہ تھا کہ کیا اسی تقلید پر آپ ہم کو مجبور کرنا چاہتے ہیں ؟

مکہ میں متعدد اقوام اور ریاستوں کی طرف سے رباط قائم ہیں۔ مصری رباط جو تکیہ کے نام سے مشہور ہے اور مسجد حرام کے متصل ہے ایک بڑی اور پختہ عمارت ہے وہاں سے ہزاروں فقراء اور مساکین کو روزانہ کھانا تقسیم ہوتا ہے۔ بعض امرائے مصر اس میں ٹھہرتے بھی ہیں۔ ان لوگوں نے مجھکو اور مولوی ظفر علیخاں کو تکیہ دیکھنے کے لئے بلایا تھا۔ چائے اور قہوہ سے تواضع کی اور دیر تک گفتگو کرتے رہے اس میں ایک شفاخانہ بھی ہے جہاں سے اوسطاً روزانہ پچاس بیماروں کا علاج ہوتا ہے۔ دوائیں مفت دیجاتی ہیں۔ عمل جراحی بھی کیا جاتا ہے جس کے مکمل آلات موجود ہیں۔

سب سے بہتر رباط بوہرہ قوم کا ہے جو ملا سیف الدین طاہر کے حسب ہدایت غالباً آٹھ لاکھ روپیہ کے صرفہ سے تیار ہوا ہے۔ یہ عمارت نہ صرف مکہ بلکہ سارے جزیرہ نمائے عرب میں بے مثل بتائی جاتی ہے اس میں پانسو حجاج نہایت آرام کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ عمارت بہت بڑی، عالیشان، صاف ستھری ہے اور مکہ میں سلطانی شفاخانہ کے بعد صرف یہی ایک جگہ ہے جس میں ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی ہم نے دیکھا۔ اس کے متصل ایک کنواں بھی کھدوا گیا ہے جس کا پانی صاف اور شیریں ہے۔

جماعت اہل حدیث کے ارکان بھی ایک رباط کی فکر میں تھے۔ دیکھیں کب بنتا ہے۔

اہل حدیث وہابی قبضہ کے بعد سے مکہ میں اس طرح داخل ہوتے ہیں جیسے کوئی فاتح اپنے رقبہ مفتوحہ میں۔ اور اس میں شک نہیں کہ سلطان انکی عزت بھی کرتے ہیں لیکن ان میں سے بعضوں کا بیجا ناز ممکن ہے کہ اس عزت کو بھی کھو دے۔

پہلے دن جب سلطان موتمر میں تشریف لائے تھے تو اس جماعت کے ایک مولوی صاحب نے ان کو مخاطب کرکے پوچھا کہ ہمارے "مذہب" کا نام کہیں قرآن میں بھی آیا ہے؟۔ لوگ اس بیموقع اور بے معنی سوال کو سنکر برہم ہوئے۔ سلطان نے جواب دیا کہ آپ کو یہ سوال کسی عالم سے کرنا چاہئے اس نے کہا کہ آپ بھی تو امام ہیں۔ لیکن ادہر ادہر سے لوگوں نے اشاروں سے روکدیا۔ اور دوسرے دن جب دعوت کے رقعے تقسیم ہوئے تو اسکا نام خارج کرادیا گیا۔

ایک دوسرے مولوی صاحب جن کو دعوت کا ٹکٹ نہیں ملا تھا سلطان کے محل پر پہونچے اور درخواست کی کہ مجھکو اپنے مہمانوں میں شامل کرلیجیے انکے ساتھ ایک مولانا اور تھے انہوں نے کہا کہ میرے لئے اونٹ کا بندوبست کردیجئے۔ سلطان اپنے ایک ملازم سے یہ کہکر کہ یہ حضرات جو کچھ فرماتے ہیں لکھ لو اٹھ گئے۔

حنبلی مصلے کے پیچھے ایک چوکی واعظوں کے لئے پڑی ہوئی ہے بیشتر علما اہل حدیث ہی کو میں نے اسپر وعظ کہتے ہوئے دیکھا۔ ایک دن راہ میں ایک مولانا سے ملاقات ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ حرم میں بھی آپ کا کوئی وعظ ہوا یا نہیں۔ فرمانے لگے کہ جی ہاں۔ فلاں شخص نے اپنی تقریر میں خلافت کے کارکنوں پر بہت لے دے کی تھی۔ میں نے اسی وقت اٹھکر مجمع کے سامنے جوابات دئے۔ پرسوں میری آخری تقریر حرم میں ہونے والی ہے۔

ابھی ہم اس جواب کی لذت ہی لے رہے تھے کہ ایک دوسرے مولانا مل گئے۔ ان سے بھی یہی سوال کیا۔ بولے کہ ظفر علیخاں صاحب نے اپنی تقریر میں رفع یدین اور آمین بالجہر کی مخالفت کی تھی۔ میں نے اپنے وعظ میں نہایت قوی دلائل سے انکا ثبوت دیا۔ اچھا اثر پڑا مجمع بھی خوب تھا۔

میں نے کہا مولوی صاحب نے تو صرف ان فروعی امور پر لڑنے جھگڑنے کی مخالفت کی تھی لیکن مولانا کو تو تقریر کے لئے ایک متنازع فیہ موضوع کی ضرورت تھی اور بس۔

رہا مجمع سو اسکی کیفیت یہ تھی کہ واعظ مغرب کے بعد کھڑا ہوتا دو چار ہندی اس کے گرد بیٹھ جاتے اور بقیہ نمازی جن سے اسوقت مسجد کا صحن بھرا رہتا تھا تماشا دیکھتے ہوئے نکلتے چلے جاتے۔

اس فرقہ کو سلطان کی مدح میں اسی قدر غلو ہے جس قدر کہ متعصبین کو انکی ہجو میں۔ اتفاق ایسا ہوا کہ سلطان جب مدینہ میں تھے تو وہاں بارش ہوئی پھر جدہ میں آئے تو وہاں بھی اور جب مکہ میں پہنچے تو یہاں بھی پانی پڑا اور عرفات میں گئے تو وہاں بھی۔ اہل حدیث میں سے ایک صاحب کہنے لگے کہ ان کی مقبولیت میں کیا شک ہی۔ دیکھتے نہیں کہ جہاں جاتے ہیں آسمانی رحمت ساتھ ساتھ رہتی ہی۔ ایک دوسرے صاحب فرمانے لگے کہ سلطان ولی ہیں جس نے انکی مخالفت کی وہ اپنے رتبہ سی گر گیا چنانچہ فلاں فلاں اور فلاں ایک اور صاحب نے جو جدید تعلیم یافتہ تھے کہا کہ کاؤنٹ ٹالسٹائی نے جو پیشین گوئی کی ہی کہ دنیا کی نجات ایک یا بانی مصلح کے ہاتھوں ہوگی وہ یہی ہیں۔

افسوسناک امر یہ ہی کہ مکہ میں تعلیم نہیں ہے۔ چند مدرسے ہیں جن میں موسم حج کی وجہ سی تعطیل تھی۔ میں ان کو دیکھ نہ سکا۔ مدرسہ صولتیہ بھی بند تھا مگر اس کے مہتمم صاحب نے اس کی تینوں عمارتیں دکھلائیں جدید مکان نہایت عالیشان اور چہار منزلہ ہے۔ اس کی وہ اوپر کی چھت بھی دکھائی جہاں مولانا محمد علی اور شوکت علی صاحبان جب حج کو گئے تھے تو جاکر سویا کرتے تھے۔ واقعی نہایت وسیع صاف ستھری اور ہوادار ہے۔

مہتمم صاحب کا بیان تھا کہ یہاں دیوبند کا نصاب پڑھایا جاتا ہی اور معلمین کو بڑی بڑی تنخواہیں اور طلبہ کو وظائف دئے جاتے ہیں لیکن واپسی میں اسی مدرسہ کے ایک مدرس میرے ساتھ تھے۔ انہوں نے ان باتوں کی تصدیق نہیں کی۔ اور کہا کہ یہاں سوائے ابتدائی تعلیم کے اور کچھ نہیں ہی۔ وظائف نہایت حقیر ہیں اور وہ بھی چند طلبہ کو دئے جاتے ہیں۔

مدرسہ فخریہ کے جلسہ میں بھی شریک ہوا۔ اس میں تجوید اور نوشت و خواند کی معمولی تعلیم ہوتی ہے۔

مدرسۃ الفلاح اور معہد سعودی کا نصاب و نظام مجھے بالکل نہ معلوم ہو سکا۔

اہل مکہ اسی پر قانع ہیں۔ اور اپنی حالت کے لحاظ سے اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ چنانچہ حدود مسجد حرم میں مولوی ابراہیم صاحب راندیری کی دعوت میں شیبی صاحب کے بھتیجے سے جو

عملاً کعبہ کی کلید بردار ہیں اس موضوع پر میں نے گفتگو کی انہوں نے کہا کہ معہد سعودی جو قائم ہوا ہے اس میں حدیث و فقہ و تفسیر کے اچھے اچھے مدرس سلطان نے بلائے ہیں۔ اب انشاء اللہ مکہ میں بھی علماء پیدا ہونے لگیں گے۔ ان کی تقریر سے واضح ہوتا تھا کہ تعلیم کا مفہوم ان کے ذہن میں سوائے چند دینی کتب کے اور کچھ نہیں ہے۔ کاش اس مرکز دین میں دین ہی کے علماء پیدا ہوں۔ لیکن ممتاز اور ذوی لیاقت تو ہوں۔

سلطان کو بھی اسکا بیحد افسوس ہے انہوں نے ایک بار کہا کہ لوگ روتے ہیں کہ مسلمانوں کا فلاں ملک نکل گیا اور فلاں صوبہ جاتا رہا اور میں روتا ہوں کہ اسلام ہی ہاتھوں سے جا رہا ہے۔ کیونکہ جب علماء نہ ہوں گے تو دین کیسے باقی رہیگا۔ میرے دیکھتے دیکھتے ریاض میں جہاں ستر نامی علماء تھے اب بارہ لڑکے رہ گئے ہیں۔

مگر باوجود اس احساس کے تعجب یہ ہے کہ وہ اپنے شاہزادوں کی تعلیم کیطرف بھی جو رات دن موٹریں دوڑاتے پھرتے ہیں اور اسی مشغلہ میں اپنا سارا وقت برباد کرتے ہیں کوئی خاص توجہ نہیں کرتے۔

کتب خانے متعدد ہیں لیکن اس مرکز اسلام کی شان کے مطابق ایک بھی نہیں۔ سب سے بڑا کتب خانہ جو ہے اس میں کم و بیش چھہ ہزار کتابیں ہیں گو بعض قلمی نوادر ہیں لیکن بہت سی ضروری علمی مطبوعہ کتابیں ندارد ہیں۔

حضارمیں سے علامہ احمد سورکتی ہم سے ملنے کے لئے آئے۔ یہ جاوہ کی جمعیت الارشاد کے صدر اور صاحب علم و فضل ہیں۔ اس جمعیۃ کے ایک دوسرے سرگرم کارکن علی بن عبداسد باذغیبی ہیں۔ ایک دن انہوں نے مجھکو محلہ قشاشیہ میں چائے پر بلایا تھا وہیں ایک شخص سے پہلی بار معلوم ہوا کہ عبداللہ عیسری مولانا شوکت علی اور چند دیگر اشخاص کے خطوط امام یمن کے نام رکھتا ہے۔

یہ عبداللہ پانچ چھہ مہینہ جامعہ ملیہ میں رہا تھا اور مکہ میں پہنچنے کے بعد خود بخود آکر ہمارا میر مطبخ بن گیا تھا مجھے اس کی پوری حالت معلوم تھی اور میں جانتا تھا کہ یہ کس قماش کا آدمی ہے۔ میں نے اس

خبر کی اصلیت سے اسی وقت انکار کیا۔ کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ اگر اس قسم کے خطوط ہوں گے تو یقیناً جعلی ہوں گے۔

میں ۴ر جون کو مکہ سے واپس چلا آیا تھا بمبئی میں پہنچکر ۲۲ر جون کو میں نے اخبار خلافت میں پڑھا کہ عبداللہ گرفتار ہو گیا اور اس کے پاس سے خطوط بھی برآمد ہوئے۔ مولانا شوکت علی صاحب کی تردید بھی اسی نمبر میں تھی کہ یہ خط انکا نہیں ہے۔ وہ اگر تردید بھی نہ کرتے تو بھی مجھے یقین تھا کہ وہ خط انکا نہیں ہو سکتا حسن عطاس مینی آج بھی میرے پاس پڑہتا ہے وہ حلفیہ بیان کرتا ہے کہ اس نے کوئی خط نہیں لکھا۔ اور میں اس کو عبداللہ سے زیادہ سچا سمجھتا ہوں۔ عبداللہ جاہل اور جسور آدمی ہے۔ وہ اپنے جعل میں آپ گرفتار ہوا ہے۔

اخبار خلافت کے اسی نمبر کے اڈیٹوریل میں "شہید حرم" کا عنوان نظر آیا جس کے نیچے اس مصری پاگل کا قصہ بیان کیا گیا تھا جس نے مسجد حرم میں منبر پر چڑھکر جمعہ کے دن کئی آدمیوں کو زخمی کیا تھا آخر میں اس کے پاؤں میں بندوق سے چھرے مار کر اس کو اتارا گیا تھا مجھے اس اڈیٹوریل نگار کی ذہنیت پر ماتم کرنا پڑا کیونکہ وہ شخص آج بھی مکہ کی گلیوں میں مارا مارا پھرتا ہے جس کو یہ شہید حرم بنا کر وہابی حکومت کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

مکہ میں کل ایک ہی اخبار ہے جس کا نام ہے ام القریٰ۔ وہ بھی ہفتہ وار۔ میں اور مولوی ظفر علیخاں دونوں وہاں گئے۔ اسکا دفتر حمیدیہ کے متصل ایک بڑے مکان میں ہے جس میں پریس بھی ہے۔ اس کی اشاعت ۳۲۰۰ ہے۔

یہ اخبار ابھی عہد طفولیت میں ہے اور سوائے سلطان نجد اور انکے شاہزادوں کے آمد و رفت کے حالات جفلات ملوکیہ اور بلدیہ مکہ کے اخبار کے اور باتیں کمتر لکھتا ہے۔

جب حج کا دن قریب آتا ہے تو مکہ کے بعض باشندے حج بدل تلاش کرتے ہیں۔ اکثر ہندیوں کو میں نے دیکھا کہ انہوں نے اپنے اپنے اعزہ و اقارب کیطرف سے ایک ایک گنی پر حج کرایا۔ دہلی کے ایک صاحب بھی ملے جو کسی کی طرف سے حج کرنے گئے تھے۔ وہ دو دو روپیہ پر عمری

خرید رہے تھے۔ میں اس بوالعجبی پر حیران تھا کہ حج بیچیں اور عمرے خریدیں۔

میں نے دیکھا کہ حج بدل کے متعلق جملہ فرق کے علماء کا ایک ہی مسلک تھا یعنی سب کے سب اس کے جواز[لہ] پر متفق تھے بلکہ بہت سے حج بدل ہی میں گئے تھے۔ کاش اسی طرح دیگر مسائل میں بھی یہ لوگ اتفاق کر لیتے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ان میں یہ نفع نہیں۔ ایک مولانا صاحب جو ساتویں بار حج بدل میں گئے تھے مجھ سے فرماتے تھے کہ یہ اچھی تجارت ہے نصف تو کہیں گئے نہیں۔

مکہ میں تمباکو نوشی بالعموم ممنوع ہے لیکن گھروں میں کوئی روک نہیں۔ شارع عام پر احتیاط کی ضرورت ہے۔ کیونکہ نجدی اس سے نفرت رکھتے ہیں اور جب کسی کو پیتے دیکھتے ہیں تو بید سے سزا دیتے ہیں۔ مگر موسم حج میں کسی قدر رعایت برتی جاتی ہے۔ دکانوں پر سگریٹ اور سگار کے بکس بھی ملتے ہیں۔

ہمارے ساتھ حقہ تھا اور تمام جماعت میں سے صرف میں اور مولوی ظفر علیخاں پیتے تھے۔ آدمی کو ہدایت تھی کہ جب لال مندیل والا کوئی عرب ملنے کے لئے آئے جو نجدیوں کی خصوصیت ہے تو اس کو اٹھا کر الگ رکھدے۔

خود ہمارے ساتھیوں میں سے مولوی داؤد صاحب غزنوی بھی نجدیوں سے اس معاملہ میں کچھ کم نہ تھے۔ میں ان سے کہا کرتا تھا کہ شاید آپ کا گھر دربار صاحب سے قریب واقع ہے۔

ایک دن صبح کو کوئی ملازم نہ تھا مولوی ظفر علیخاں کو سخت طلب تھی اٹھے اور خود چلم بھر کر لائے۔ میں بھی چونکہ ان کا شریک عمل تھا اٹھکر حقہ تازہ کرنے لگا۔ اور اس وقت یہ شعر کہے۔

بھرتے ہیں چلم ظفر علیخاں — اسلم کرتے ہیں حقہ تازہ
مکہ میں جب آگئی یہ نوبت — حقہ کا نکالدو جنازہ

[لہ] میرے نزدیک قرآن کریم کے اس عام اصول "لیس للانسان الا ما سعیٰ" کے مطابق ہر انسان کو صرف اس کے ہی عمل کی جزا و سزا ملیگی۔ ایک دو روایتیں جو حج بدل کے متعلق آئی ہیں انکا محل مخصوص ہے وہ عام نہیں کیجا سکتیں۔

لیکن جنازہ تو نہیں نکالا گیا۔ ہاں یہ ہوا کہ ہمارا حقہ حج میں ساتھ نہیں گیا۔

مکہ کی تاریخی یادگاروں کے متعلق کتاب مرآۃ الحرم نامی جو وہاں عام طور پر شائع ہے۔ نہایت مکمل اور مفصل ہے۔ لیکن اس کی روایات نیز وہاں کے معلمین کے بیانات کچھ زیادہ قابل وثوق نہیں معلوم ہوئے۔

اکثر مزارات پر پہرے قائم ہیں تاکہ زائرین سجدہ اور شرک نہ کرنے پائیں۔ بعض جگہ مثلاً غار حرا یا جبل ثور پر بلا سلطانی اجازت کے جانے نہیں دیتے۔

مسجد بلال جبل ابو قبیس پر ہے۔ مجھ سے بعض ہندیوں نے کہا کہ وہابیوں کا ظلم دیکھئے کہ اس کو مقفل کرا دیا ہے۔ میں نے کہا کہ وہ حرم شریف کے صحن میں سے نظر آتی ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ مسجد حرم کی نماز کو جس میں دوسری مساجد سے ایک لاکھ گنا زیادہ ثواب ملتا ہے کوئی چھوڑ کر اس میں نماز پڑھنے کیوں جائیگا۔ علاوہ بریں حرم میں دس بار آنے جانے سے اس پہاڑ کی چوٹی پر ایک بار بھی چڑھنا اتنا زیادہ مشکل ہے۔ پھر ایسی صورت میں اسکا مقفل رکھنا ہی قرین مصلحت ہے۔

مولانا فاخر صاحب کو شکایت تھی کہ وہابیوں نے حضرت خدیجہ کا مزار تو توڑ ہی ڈالا تھا اب اس پر اونٹ بٹھالتے ہیں۔ مجھے اعتبار نہ آیا چنانچہ جب میں نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کے گرد دیوار کھنچی ہوئی ہے اور وہاں تک اونٹ تو کیا بلی کا بھی گزر نہیں۔ احاطہ کے باہر میدان میں بے شک اونٹ بیٹھتے ہیں۔

سنت کے مطابق ۸؍ ذی الحجہ کو مکہ سے حج کے لئے روانگی ہونی چاہئے۔ لیکن لوگ ۴ - ۵ ذی الحجہ سے جانے شروع ہو جاتے ہیں۔ بالخصوص اہل جاوہ۔ کیونکہ انکے ذمہ وطن میں بھی جسقدر دعوتیں لازم ہوتی ہیں انکو وہ میدان عرفات ہی میں پہنچکر کھلاتے ہیں۔

امسال منا میں بھی پانی کا انتظام کافی تھا اور عرفات میں بھی۔ میں نے دیکھا کہ توانا لوگ نہر زبیدہ سے خود پانی نکالکر لاتے تھے اور جا بجا سبیلیں بھی لگی ہوئی تھیں جہاں سے مفت پانی ملتا تھا۔ مصری سبیل حیدر آبادی سبیل۔ دہلی والوں کی سبیل۔ بمبئی والوں کی سبیل اور خود سلطانی سبیل۔

مول بیچنے والے بھی ہر جگہ گھومتے تھے اور ۷؍ - ۸؍ کنستر تک پانی ملجاتا تھا۔

راستہ میں نیز منا اور عرفات میں جا بجا چائے۔ پانی شربت اور برف کی دکانیں تھیں۔ سلطان کی تمامتر کوشش یہی تھی کہ حجاج کو پانی کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ عرفات میں ایک کنویں کی کھدائی میں وہ پانچہزار گنی خرچ کر چکے ہیں ایک انجن بھی منگوایا ہے مگر ابھی تک پانی نہیں نکلا۔ سننے میں آیا ہے کہ جبل شہدار میں جو مکہ سے دو تین میل کے فاصلہ پر ہے ایک سوتا دریافت ہوا ہے جس کا قطر نہر زبیدہ سے بھی زیادہ ہے اور پانی بھی اچھا ہے۔ احمد زہیر جو ایک عراقی رئیس اور سلطان کے خاص دوست ہیں بیان کرتے تھے کہ سلطان بہت خوش ہیں اور کہتے ہیں کہ انشاءاللہ اس سوتے سے میں مکہ سیراب کر لوں گا۔

حجاج کے لئے منا سے عرفات تک ہسپتال کے متعدد کیمپ تھے۔ اور پانچ ڈاکٹر، عبدالہادی امین بیگ اور بشیر جو شامی ہیں اور عبدالحمید اور محمود جو لاہوری ہیں ہر وقت گشت اور علاج میں مصروف رہتے تھے۔ دو لاریاں اسی غرض کے لئے مامور تھیں کہ مریضوں کو کیمپ میں لے پہنچاتی رہیں۔

اسال اللہ کے فضل سے بہت امن رہا اور ۸ ذی حجہ سے ۱۲ تک یعنی پانچ دن میں اموات کی کل تعداد ۳۴۵ تھی جن میں سے ۷۵ فیصدی لو کی وجہ سے واقع ہوئیں۔ تقریباً تین لاکھ آدمیوں میں روزانہ ۷۰ اموات کا اوسط بالکل معمولی ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ بعض حجاج اپنے بخل یا ناداری کی وجہ سے للغہ فی کس خیمہ کے لئے ادا نہیں کرتے جس کی وجہ سے انکو سایہ نصیب نہیں ہوتا اور بعض اوقات لو لگ جاتی ہے جس سے جانبری مشکل ہوتی ہے۔

ہندوستانی حاجیوں میں سے اہل بنگالہ بالخصوص باوجود روپیہ رکھنے کے بھی بخل سے کام لیتے ہیں اور ان میں سے بہت سے سوال کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ واپسی میں میں نے دیکھا کہ جدہ اور نیز جہاز میں ان میں سے بعض لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے تھے۔ انکی وجہ سے تمام ہندوستانی عربوں کی نگاہ میں ذلیل ہیں۔

جہاز میں تو محض لالچ کی وجہ سے یہ مسکین بنجاتے تھے۔ ہوٹل سے دال بھات کھا کے آ رہے ہیں لیکن کسی کو گوشت یا پلاؤ کھاتے دیکھا فوراً پیالہ سامنے کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اس بدپرہیزی سے بیماری

میں مبتلا ہوتے تھے اور مرتے تھے۔ اور اکثر تو ہیضہ مکہ سے ساتھ لاتے تھے۔ جہاز میں ۱۴ موتیں ہوئیں جن میں سے ۱۲ بنگالی تھے۔

میں علماء بنگالہ سے خصوصیت کے ساتھ درخواست کرتا ہوں کہ وہ مسلمانوں کو اچھی طرح سمجھا دیں کہ سوال ذلت ہے۔ سوال حرام ہے اور سواد الوجہ فی الدارین ہے۔

منا میں قربانی کے بعد سلطان کو عید کی مبارکباد دینے کے لئے لوگ گئے۔ ہر شخص جو جاتا تھا۔ سلطان کھڑے ہوکر برادرانہ اس سے مصافحہ کرتے تھے۔ ٹیونس کے ایک بزرگ مصافحہ کے وقت جھک گئے۔ سلطان نے ہاتھ کھینچ لیا اور کہا کہ یہ اسلامی طریقہ نہیں ہے کہ کسی کے آگے آدمی سر جھکائے۔ لوگوں کو جاہ و تمکنت پسند امراء نے یہ عادت سکھا رکھی ہے۔ میں مسلمانوں کے لئے اسکو نہایت نازیبا سمجھتا ہوں۔

عربوں میں یہ دستور بھی میں نے دیکھا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مصافحہ کرتے وقت رخسار یا پیشانی چومتے ہیں اور یہ رسم اس قدر عام ہے کہ اختیار تمیزی کی اس میں بہت کم گنجایش ہے۔

ابراہیم الفضل اسی دوران میں انتقال کر گئے تھے انکے اعزہ منا میں تھے دوسرے دن ہم ان کی ماتم پرسی کو گئے۔ اس کے بعد رمی جمرات کیا۔ بعض جہال کی حالت دیکھکر مجھے بہت ہنسی آئی۔ ایک ہندوستانی عقبہ اولے پر رمی کر رہا تھا۔ بجائے چھوٹی چھوٹی کنکریوں کے اس نے پتھر کے ٹکڑے لے رکھے تھے۔ زور زور سے مارتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ "لے۔ اور لے" غالباً وہ ان نشانات کو اپنے خیال میں مجسم شیطان سمجھے ہوئے تھا۔

ایک بڑے ڈیل ڈول والے الہ آباد کے واعظ بھی تھے۔ کہنے لگے کہ میں نے بھی آج تاک تاک کے شیطان کے منہ ہی منہ میں پتھر مارے۔ میں نے کہا تو پھر تو اس کے دانت بھی جھڑ گئے ہوں گے اور آنکھیں بھی پھوٹ گئی ہونگی۔

قربانیاں لاکھوں کی تعداد میں ہوتی ہیں۔ بعض لوگ انکا گوشت کھانے کے لئے لاتے ہیں۔ آس پاس کے بدو بھی بقدر ضرورت اٹھا لیجاتے ہیں۔ بعضوں کو میں نے دیکھا کہ وہ کھالیں بھی کھینچ رہے

تھے۔ مگر کہانتک بڑا حصہ بیکار رجاتا ہے۔ حافظ حلیم صاحب کانپوری سے اسکے متعلق گفتگو ہوئی کہ اگر آپ ان کھالوں کے نکالنے کا کچھ بندوبست کرسکیں تو یہ ایک بڑی خدمت ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ میں نے ہرطرح پر اندازہ لگالیا۔ تاجرانہ حیثیت سے اس میں جس قدر خرچ پڑے گا اتنا نفع نہ ہوگا۔ یہاں کارخانہ دباغت بھی قائم کرنا مشکل ہے کیونکہ پانی نہیں ہے۔

بالعموم دنبے اور بکریاں لوگوں نے ذبح کیں۔ خال خال لوگ تھے جنہوں نے اونٹ خریدے تھے۔ آٹھ دس روپیہ میں اچھے دنبے اور پانچ چھ روپئے میں اچھی بکری مل جاتی تھی۔ اونٹ تین چار گنی میں۔

امسال اونٹوں کے کرایہ میں حکومت نے بہ نسبت سالہائے سابق کے ۲۵ فیصدی اضافہ کردیا تھا۔ حجاج اس سے ناراض تھے لیکن اصلیت یہ ہے کہ حکومت حجاج کے لئے آسائش اور امن وامان قائم کرنے میں بہت خرچ کرتی ہے۔ قبائل کے شیوخ کو جنکی ضمانتوں میں انکے علاقے ہوتے ہیں رقم دینی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ صحت عامہ پر بھی معمول سے زیادہ صرفہ بڑھ گیا ہے اور حجاز کی آمدنی کا اور کوئی ذریعہ نہیں بجز حجاج کے اس لئے ناگزیر تھا کہ اونٹوں اور موٹروں کے کرایہ میں اضافہ کرکے اخراجات کے لئے رقم نکالی جائے

میں نے دیکھا کہ نجدیوں اور نجدی حکومت کے زیادہ تر شاکی ہندی ہی تھے اور انکی اکثر شکایتیں نہایت خفیف بے بنیاد یا بر بنا تعصب تھیں۔ ورنہ ہم غیر عرب حجاج کے لئے صرف دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ ہمارا جان ومال محفوظ رہے۔ دوسرے یہ کہ اس بے آب وگیا خطہ میں آرام وآسائش خاصکر پانی کا بندوبست کیا جائے۔ ان دونوں امور میں وہابی حکومت مطلق قاصر نہیں ہے۔ اتنا بڑا اجتماع تھا لیکن ایک شخص کی نسبت یہ سننے میں نہ آیا کہ وہ لوٹا یا مارا گیا ہو۔ اور نہ یہ کہ کوئی پانی کی قلت سے ضائع ہوا ہو۔ حالانکہ یہ باتیں وہابی حکومت سے پہلے بالکل عام تھیں۔

سال گذشتہ اس قسم کا صرف ایک واقعہ پیش آیا تھا۔ میں نے سنا کہ ان حجاج میں سے جو مکہ سے جدہ کو واپس ہوئے کوشان کے مقابلہ سے معلوم ہوا کہ ایک آدمی نہیں پہونچا۔ ابن سعود کی پوری

قوت اس کی تلاش میں مصروف ہوگئی چنانچہ وہ ہندی راستہ میں ایک ٹیلہ کے نیچے زخمی ملا۔ سلطان نے اس علاقہ کے شیخ کو طلب کیا اور کہا کہ مجرم کو معہ حاجی کے سامان کے حاضر کرو۔ دوسرے دن بدو معہ مال مسلوبہ کے جو اس کے سر پر تھا پہنچا یا گیا۔ سلطان بہت برہم ہوئے۔ اور کہا کہ لوگ اپنے اہل وعیال اور خانماں کو چھوڑ کر مال صرف کر کے اور سفر کی زحمتیں اٹھا کر بیت اللہ کی زیارت کے لئے آتے ہیں اور یہ بے ایمان انکو لوٹتے ہیں۔ میں ایسی سخت سزا دونگا جو دوسروں کے لئے عبرت ہو۔ قاضی نے اس کو ڈاکو قرار دیکر ایک ہاتھ اور پاؤں برخلاف کاٹ لینے کا حکم دیا۔ سلطان نے اعلان کرایا اور مجمع عام میں حمیدیہ کے سامنے ڈاکو کو بلوا کر ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کٹوا دیا۔

امن کا مظہر وہاں اسقدر نمایاں ہے کہ بنگالی حاجی جو خوف کی وجہ سے شغدف سے نیچے نہیں اترتے تھے اب جدہ سے مکہ اور مکہ سے جدہ پیدل آتے جاتے ہیں۔ میں واپسی میں عشا کے بعد مکہ سے موٹر پر چلا تھا راستہ میں دیکھا کہ عورتیں اور لڑکیاں تک پیدل چلی آرہی ہیں۔ اور وہی بنگالی جو شغدفوں سے نہیں اترتے تھے میدانوں۔ پہاڑیوں کے دامنوں اور ہموار ٹیلوں پر جا بجا دو دو اور چار چار آرام سے سوئے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہمیانیاں انکی کمروں سے بندھی ہوئی ہونگی۔ اور کہیں نہ پولیس ہے نہ چوکیدار وہی بدو جو لوٹتے تھے اب محافظ ہیں۔

راستہ میں کہیں کہیں میں نے دیکھا کہ اونٹوں پر سے مسافروں کے بسترے۔ برتن اور صندوق وغیرہ گرے پڑے ہیں موٹر والے سے کہا کہ انکو اٹھا لے جدہ میں چلکر ہم پولیس کے حوالہ کر دینگے۔ اس نے کہا کہ ہم نہیں اٹھا سکتے۔ اور آپ اطمینان رکھیں یہ سب کا سب صبح تک جدہ تک پہنچ جائے گا اور انکے مالکوں کے حوالہ کر دیا جائیگا۔

جدہ میں معلموں کے وکیلوں کے دروازوں پر پچاسوں حاجیوں کے سامان آئے ہوئے پڑے تھے جس میں صندوق بھی تھے۔ ہنڈ بیگ بھی اور بسترے بھی۔ وکیل ان حجاج سے کہتا تھا کہ جہاں ٹھہرے ہو وہاں اپنے اپنے سامان لیجاؤ۔ لیکن بہت کم لوگ لے گئے۔ کیونکہ انکو یقین تھا کہ یہ جس قدر ہمارے کمروں میں محفوظ ہیں اسی قدر اس سڑک پر۔ چنانچہ ایک ہفتہ تک میں رہا اور انکے سارے سامان وہیں

پڑے دیکھتا رہا۔

ڈاکہ اور رہزنی اب بالکل مفقود ہے بلکہ تقریباً ناممکن۔ ہاں چوریاں ہوتی ہیں وہ بھی بہت کم۔ اور بیشتر خود حجاج ایک دوسرے کا مال چراتے تھے۔ چنانچہ جہاز میں بھی اس قسم کے وقوعے ہوتے رہے۔

حج سے فارغ ہونیکے بعد واپس آنے والے حجاج عجلت کیساتھ جدہ پہنچتے ہیں کیونکہ واپسی کے ٹکٹ آمد ہی کی ترتیب پر ملتے ہیں۔ جہاز بھر جانے پر بقیہ مسافروں کو وہیں پڑا رہنا پڑتا ہے۔ ممکن ہے کہ دوسرے جہاز کے انتظار میں کئی ہفتے لگ جائیں۔ اور امسال جہاز کی کمپنیوں کے باہمی تنازع سے ایک کمپنی کا مسافر دوسری کمپنی کے جہاز سے نہیں آسکتا تھا۔ اس لیے بہت سے آدمی وہاں پڑے رہ گئے۔ اگر مکہ ہی میں جہازوں کی روانگی کی تاریخ معلوم ہوتی رہے جو کچھ مشکل نہیں ہے کیونکہ ٹیلیفون لگا ہوا ہے تو حاجیوں کو حرم چھوڑ کر جدہ میں انتظار کے دن نہ کاٹنے پڑیں۔ جاوی حجاج کے لیے انتظام اچھا تھا۔ انکے تمام جہازوں کی روانگی کی تاریخ اخبار ام القرے میں پہلے ہی سے شائع ہو چکی تھی۔ ہندوستان کے حجاج کا انتظام بہت اصلاح طلب ہے۔ خان بہادر ڈپٹی عبد الرب خاں صاحب نے انکی پریشانیاں دیکھکر برٹش قونصل سے مفصل گفتگو کی تھی۔ مجھسے فرماتے تھے کہ میں نے اس کے متعلق تجاویز سوچی ہیں۔ ہندوستان میں پہنچکر انکو اسمبلی میں پیش کراؤں گا تاکہ قانونی شکل میں آجائیں۔

جدہ چھوٹا شہر ہے۔ سڑکیں معمولی ہیں۔ وہ حصہ کسی قدر صاف اور شاندار ہے جدھر قونصل خانے ہیں۔ بازار میں ضرورت کی جملہ اشیاء موجود ہیں۔ پانی البتہ یہاں ہر جگہ سے زیادہ گراں ہے کیونکہ سمندر کے کھارے پانی سے تیار کیا جاتا ہے اور قیمتاً ملتا ہے۔ قہوہ خانے اور ہر قسم کی کھانے کی دکانیں بہت ہیں۔

ہمارے مذاق کے علمی آدمی صرف شیخ نصیف ہیں۔ جاتے وقت سلطان ابن سعود انکے مکان پر ٹھہرے ہوئے تھے اسوجہ سے ان سے ہم نہ مل سکے۔ واپسی میں چونکہ میں اکیلا تھا اس لئے اکثر انہیں کے یہاں پہنچ جاتا تھا۔ انکے پاس کتابوں کا ذخیرہ بہت اچھا اور بڑا ہے۔ عربی کی جملہ علمی کتابیں موجود ہیں اور شوقین اسقدر کہ جلدیں مصر سے بندھواتے ہیں۔ جہاں کسی کتاب کا نام سنتے ہیں فوراً منگاتے ہیں۔ ان

جوزی کی تلقیح جو گذشتہ سال دہلی سے شائع ہوئی تھی انکے پاس تھی۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب مبارکپوری کی شرح ترمذی کی بابت بھی جو دہلی میں چھپ رہی ہے دیر تک مجھ سے پوچھتے رہے۔ امین ریحانی کی تاریخ النجد الحدیث جو اسی مہینہ میں شائع ہوئی تھی میں نے انکے یہاں دیکھی۔

میرے دوست مولوی عبدالرحمٰن صاحب مرآۃ الشعر والے جو دہلی یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں کے ہیڈ ہیں حج سے واپسی کے بعد جدہ میں ولایت کے سفر کیلئے جہاں انٹیل کانفرنس میں وہ ایک مضمون پڑھنے والے ہیں مصری جہاز المنصورہ کے انتظار میں تھے۔ وہ بھی میرے ساتھ شیخ نصیف کے یہاں جاتے تھے شیخ کی دعوت بھی مجکو کبھی نہ بھولیگی جو سلطانی دعوت سے کم نہ تھی۔ اور تعجب یہ ہے کہ یہ بھی میز اور کرسی پر تھی اور چھری اور کانٹے کے ساتھ۔

ایکدن سلسلۂ گفتگو میں میں نے کہا کہ آخر یہ حنبلیت کس بنیاد پر ہے اور سلفیت کس اصول پر؟ کہنے لگے کہ علماء نجد میں یہ سب تو نہیں مگر اہل نظر اس تفریق کو ناپسند کرنے لگے ہیں اور صرف مسلمان بننا کافی سمجھتے ہیں۔

عرب جنکی تاریخ بچپن سے پڑھتے چلے آتے ہیں اس مختصر سے سفر حج میں آج بھی ہمکو انہیں صفات میں نظر آئے۔ انمیں دین ہے اور شجاعت۔ مہمان نوازی ہے اور کرم۔ خوش خلقی اور زندہ دلی انکی ایک ایک ادا سے ٹپکتی ہے۔

اسی کے ساتھ وہ قومی عیوب بھی ہیں جنہوں نے انکو کھویا ہے یعنی قبائلی عصبیت اور فخر بالانساب۔ انکے ساتھ سب سے دلچسپ گفتگو وہ ہوتی تھی جن میں قبائل کے انساب اور انکے مفاخر کا تذکرہ ہوتا تھا آجکل ربیعہ کی گردنیں بلند ہیں کیونکہ حکومت اور سیادت بنی تغلب کے ہاتھ میں ہے۔ مگر مضر میں سے قریش کی بزرگی اب بھی مسلم ہے۔

یہ امر نہایت رنجدہ ہے کہ غلامی جسکا رواج دنیا سے بالعموم اٹھ گیا ہے ابتک عرب میں پائی جاتی ہے اور مکہ جیسے محترم اور مقدس شہر میں جو اسلام کا مرکز ہے بردہ فروشی کی دکان موجود ہے۔ سلطان کو اسکا علم ہے لیکن پھر بھی وہ اس کے انسداد کیطرف توجہ نہیں کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب اس کے کچھ ایسے خوگر ہوگئے ہیں کہ اس کو اتنا برا نہیں سمجھتے جس قدر کہ وہ ہماری نگاہ میں ہے۔

کوہ مصوری

از مولوی اقبال احمد خاں صاحب سہیل

مرحبا کوہِ مصوری! یہ تری شانِ جمال   تری چوکھٹ چومتے ہیں سرفروشانِ جمال
جابجا خم دار سڑکیں اُس پہ پھولوں کا ہجوم   جیسے بل کھائی ہوئی زلفِ عروسانِ جمال
یہ فلک فرسا بلندی پیکرِ شان و شکوہ   یہ بہشت آشوب رنگ آرائیاں جانِ جمال
تیری برف آلود چوٹی بن گئی آئینہ دار   دیکھنی چاہی شعاعِ حور نے شانِ جمال
تیرے کھڈ سے ابر یوں لہرا کے ہوتا ہے بلند   رقص میں ہو جیسے آہِ مستمندانِ جمال
صبحدم پھولوں پہ وہ اک کہر سا چھایا ہوا   کھل گئی ہو نیند میں یا زلفِ پیچانِ جمال
دامن کہسار میں وہ لالہ و گل کا ہجوم   رنگ لایا ہو غضب خونِ شہیدانِ جمال
ابر و باد و ماہ و خور سب تابع فرمانِ حسن   حکمراں اس سرزمیں پر ہے سلیمانِ جمال
یہ نضارت خیز منظر یہ نسیم مشکبار   ایک فردوس نظر ہے یہ خیابانِ جمال
حسن فطرت پر تمدن کی یہ رنگ آمیزیاں   ہو گیا لبریز گل ہاں آکے دامانِ جمال
صبحدم وہ شعلۂ رخسارِ گل کی آب و تاب   جگمگا اٹھتی ہے گویا اک شبستانِ جمال

شب کو وہ فانوسِ برقی کی فروغ انگیزیاں
ہر طرف روشن ہے اک سروِ چراغانِ جمال
یہ قیامت خیز جلوے اُس پہ یہ حسنِ فرنگ
ہر روش پر جلوہ گر سروِ خرامانِ جمال
ہر قدم پر "یا الٰہی خیر" کہتی ہے نگاہ
آفت نظارہ ہے یہ محشرستانِ جمال

زیں گلستان شعلۂ شوقے بجانم در گرفت
تا دل افسردہ ام ذوقِ نوا از سر گرفت

ہے ہوا اس سرزمیں کی یا شرابِ زندگی
پھر دلِ افسردہ میں ہے التہابِ زندگی
یہ نشاطِ بے خلش ہے زندگی کا ماحصل
وقت جو گزرا یہاں وہ تھا شبابِ زندگی
رزمِ ہستی کی کشاکش سے رہائی ہو گئی
یاں ملی آ کر ہمیں تعبیرِ خوابِ زندگی
روح کو صحرائے غربت میں ملا درسِ سکوں
تھی وطن کی زندگی تو خود حجابِ زندگی
رات دن شورِ من و تو، روز و شب فکرِ معاش
بس خور و خواب و غلامی ہے نصابِ زندگی
صورتِ مرغِ قفس نغمے بھی اپنے وقفِ غیر
ننگ ہے اس زندگانی پر خطابِ زندگی
اے مصوری! تیرے صدقے تو نے دکھلایا ہمیں
کس طرح ہیں اہلِ مغرب کامیابِ زندگی
اب گئے وہ دن کہ مشرق سے یہ ہوتا تھا طلوع
سوئے مغرب اب تو پہنچا آفتابِ زندگی
گوشِ عبرت ہے تو سن مرغانِ صحرا کی صدا
زندگی مرغِ قفس کی ہے عذابِ زندگی

تیری آنکھوں سے نہاں ہے چشمۂ آبِ حیات   یہ نمودِ ظاہری تو ہے سرابِ زندگی
روحِ حریت کی بیداری کو کہتے ہیں حیات   روز و شب سے تو لگاتا ہے حسابِ زندگی
قوم پر مٹنے سے ملتی ہے حیاتِ جاوداں   ٹوٹ کر خود بحر بنتا ہے حبابِ زندگی
ہوتی ہے سیراب خونِ آرزو سے کشتِ دل   دودِ آہِ دل سے اٹھتا ہے سحابِ زندگی
ہے نویدِ صبحِ ہستی خندۂ چاکِ جگر   اس قفس کا ٹوٹنا ہے فتحیابِ زندگی
تو نے اس آسائشِ ہستی کو سمجھا ہے حیات   اے اسیرِ دامِ غفلت! یہ ہے خوابِ زندگی
جا سوئے گورِ غریباں گر ہے راحت کی تلاش   زندگی تو اصل میں ہے اضطرابِ زندگی
اے اسیرِ رنگ و بو تا کے گرفتارِ فریب   اٹھ، کہ اب آیا ہے وقتِ احتسابِ زندگی
دہر کو معمور کر لے نغمۂ توحید سے   چھیڑ دے ناخن سے پھر تارِ ربابِ زندگی

خیز و گلزارِ وطن را آب و رنگ از سر بدہ
ایں خراباتِ کہن را رونقِ دیگر بدہ

تنقید و تبصرہ

رسائل

نور جہاں۔ نظام المشائخ۔ اسلام۔ مولوی۔ نمائش۔ سفینہ

نور جہاں کا دار الخواتین نمبر نسائی رسالوں میں "نور جہاں" امرتسر نہایت ممتاز رسالہ ہے۔ دوسرے رسائل کی طرح "نور جہاں" نے بھی خاص نمبر شائع کرنے شروع کئے ہیں۔ دار الخواتین نمبر اسی سلسلہ کی تیسری کڑی ہے۔ یہ نمبر تحریک دار الخواتین کی اشاعت اور تقویت کے خیال سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اور مفید علمی و ادبی مضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۶۰ صفحوں پر ختم ہوتا ہے۔ رسالہ کو دلچسپ بنانے کی خاطر کافی تعداد میں تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں۔ یہ امر بھی امید افزا ہے کہ گو رسالہ مرد مضمون نگاروں سے بے نیاز نہیں ہے لیکن اس کا زیادہ حصہ عورتوں ہی کے تراوش قلم کا رہین منت ہے۔ قیمت ۱۲؍

ملنے کا پتہ:۔ دار الاشاعت نسوان امرتسر۔

نظام المشائخ کا رسول نمبر نظام المشائخ نہایت ہی قدیم مذہبی رسالہ ہے۔ اس کا رسول نمبر ہمارے پیش نظر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک کے مختلف پہلوؤں پر اس کے اکثر مضامین میں نہایت عقیدت اور محبت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس لئے عاشقان رسول کے لئے نہایت اچھا تحفہ ہے اس رسالہ میں خواجہ حسن نظامی صاحب کی تفسیر القرآن بھی مسلسل شائع ہوتی ہے۔ قیمت باتفسیر سالانہ ہے بے تفسیر دو روپے آٹھ آنے

ملنے کا پتہ: کوچہ چیلان۔ دہلی

اسلام کا پیغمبر نمبر اسلام ایک تبلیغی رسالہ ہے اس لئے پیغمبر نمبر میں داعی اسلام اور انکی تبلیغ کو بطور نمونہ پیش کیا ہے۔ مضمون نگاروں میں اکثر مقتدر حضرات کے نام بھی نظر آتے ہیں قیمت سالانہ عار

ملنے کا پتہ: اسلام امرت سر

مولوی کا رسول نمبر "مولوی" دہلی نے اپنا رسول نمبر نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ لکھائی باریک اور چھپائی سرخ ہے جس سے پڑھنے میں عام طور پر تھوڑی سی تکلیف ہوتی ہے۔ اس میں نہ صرف عمارات کی بلکہ کئی ایک انسانی تصاویر بھی موجود ہیں اور "مولوی" میں انکی موجودگی کافی اہمیت رکھتی ہے۔ اشتہارات کے سلسلہ میں جوانی اور اس کے لوازمات متعلقہ پر کافی سامان مہیا کیا گیا ہے جس سے ہماری رائے میں مولوی کو کم سے کم اس نمبر میں تو ضرور احتراز کرنا چاہئے تھا۔ حجم ۱۲۰ صفحے قیمت ۱۲ر سالانہ عگر

ملنے کا پتہ:۔ مولوی کوچہ چیلان۔ دہلی

نمائش یہ رسالہ میرزا رفیق بیگ صاحب کی ادارت میں دکن سے شائع ہوتا ہے۔ اس میں ادبی مضامین کے علاوہ سائنس اور صنعت کے مضامین کا بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ چنانچہ ستمبر کے رسالہ میں "ہندوستان اور زراعت"، "متحرک تصویریں"، "یورپ کی صنعت کا زمانہ" اس حصہ کے خاص مضامین ہیں۔ دوسرے مضامین میں "اشتراکیت کی ابجد" خاص طور پر ناظرین کی توجہ کا مستحق ہے۔ قیمت سالانہ ہیر

ملنے کا پتہ:۔ نمائش کاچی گوڑہ

سفینہ مدراس سے کسی وقیع اردو رسالہ کا شائع ہونا یقیناً تعجب خیز ہے۔ جنوبی ہند میں اردو زبان کا جس قدر کم رواج ہے اس کو دیکھتے ہوئے ظاہر ہے کہ ایک رسالہ کو طرح طرح کی مشکلات سے دوچار ہونیکا امکان ہے مضامین کی کمی تو ممکن ہے کہ شمالی ہند سے پوری کیجا سکے لیکن خریداروں کی بے توجہی کا کوئی نعم البدل نہیں ہوسکتا۔ ان حالات میں اردو سوسائٹی گورنمنٹ محمڈن کالج مدراس کی یہ سعی کہ اس نے ایک سہ ماہی

رسالہ شائع کرنا شروع کر دیا یقیناً قابل مبارکباد ہے۔ رسالہ کی مجلس ادارت پانچ حضرات پر مشتمل ہے جسمیں چار طالب علم ہیں اور انکے صدر "فضل العلما" جناب محمد عبدالحق صاحب ایم اے ہیں۔ رسالہ کے پہلے دو نمبر اس وقت ہمارے سامنے ہیں۔ فہرست مضامین پر ایک سرسری نظر ڈالنے ہی سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ رسالہ مذکور کی نہایت صحیح اصولوں پر ابتداء کی گئی اور ذوق سلیم کے ساتھ اس کو ترتیب دیا گیا ہے۔ یعنی اسے محض کالج کی فضا میں محدود نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ دعوت عام ہو۔ یقیناً مدراس میں ایک ایسے رسالہ کی سخت ضرورت تھی جو جنوبی ہند میں اردو کی ترویج کے سلسلہ میں مدد ہو اور وہاں کے اردو داں طبقہ میں صحیح مذاق ادب پیدا کر سکے۔ سفینہ بخوبی اس کمی کو پورا کرتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس کی کافی ہمت افزائی کیجائے گی۔ قیمت سالانہ ے۸/

(م۔ ع۔ خ)

ملنے کا پتہ: سفینہ۔ گورنمنٹ محمڈن کالج۔ مونٹ روڈ۔ مدراس

کتب

خدا کے رسول۔ تذکرہ رسول۔ منتخبات اردو۔ لطیفیات۔

خدا کے رسول | مرتبہ محمد مہدی صاحب اسسٹنٹ مہتمم تاریخ بھوپال۔ ناشر محمد قاسم صاحب جاگیردار مالی پورہ بھوپال۔ سائز ۳۰ بر ۲۰ / ۱۶ حجم: ۳ صفحات۔ قیمت ۲ر

شکر ہے کہ بچوں کے لئے سیرۃ پاک پر چند مفید کتابیں مہیا ہو گئی ہیں۔ چونکہ لکھنے والے عموماً ایسے ہیں جنہیں رسول اکرم کی سوانح زندگی میں دنیا کے لئے ایک بہترین نمونہ نظر آتا ہے اور وہ بچوں کی ابتدائی تعلیم کی اہمیت سے بھی واقف ہیں اس لئے ہمارے خیال میں جس نے بھی جو لکھا خوب لکھا ہے۔ محمد مہدی صاحب اسسٹنٹ مہتمم تاریخ۔ بھوپال کی کتاب "خدا کے رسول" ہم نے پڑھی۔ بچوں کے لئے بہت مفید تالیف ہے زبان نہایت آسان ہے اور واقعات صرف وہی لئے ہیں جو ایک آٹھ نو برس کے بچے کی سمجھ میں آسکیں۔ مولوی صاحب سیرت نبوی پر چار کتابیں اور مرتب کر رہے ہیں جو ایک دوسرے سے نسبتاً مفصل و مشرح ہوں گی۔ ہماری دعا ہے کہ وہ کتابیں بھی جلد زیور طبع سے آراستہ ہو کر بچوں کے ہاتھوں تک پہنچ جائیں۔

تذکرۂ رسول | مؤلفہ محمد عبد الغنی صاحب۔ ناشر کتب خانہ رحمانی شیخ پورہ مونگیر۔ سائز ۱۸×۲۲/۸ حجم ۸۸ صفحات۔ قیمت ۸ر

حضور اکرم کے مقدس حالات زندگی پر ایک مختصر سا رسالہ ہے جو دوسری بار شائع ہوا ہے۔ "مولود خواں" طبقہ اگر میلاد کی محفلوں میں جھوٹی سچی روایتیں بیان کرنے کے بجائے اس کتاب سے کچھ فائدہ اٹھائے تو بہتر ہے۔ تذکرۂ رسول میں دو چیزیں قابل ذکر ہیں۔ معجزاتِ رسول کا بیان اور چند اچھے شعراء کے حمد و نعت کا انتخاب جو کتاب کے آخر میں درج ہے۔

منتخبات اردو | مؤلفہ سید ابو ظفر صاحب ندوی۔ ناشر گجرات ودیا پیٹھ۔ احمد آباد۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۹۲ صفحات۔ قیمت ۲ر

یہ گجرات کی قومی یونیورسٹی کے نصاب کی کتاب ہے جو کم اردو جاننے ہندو طلبہ کے لئے لکھی گئی ہے۔ انتخاب اچھا ہے۔ اور دو باتوں کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ کتاب کے مطالعہ سے طلبہ کے دلوں میں اپنے ملک کی محبت پیدا ہو اور جو ناواقفیت عموماً ہندو طلبہ کو مسلمانوں کی تاریخ سے ہوتی ہے۔ وہ باقی نہ رہے۔ ہمارے خیال میں سید ابو ظفر صاحب اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ کتاب نہ صرف ہندو طلبہ کے لئے مفید ہے بلکہ مسلمان بچوں کے لئے بھی موزوں ہے۔ اور اسلامیہ اسکولوں کے چھٹے درجہ کے نصاب میں داخل ہو سکتی ہے۔ طباعت اور کاغذ وغیرہ بہتر ہے۔ اور قیمت ۲ر بہت کم۔

لطیفیات | مصنفہ محمد حسن صاحب لطیفی۔ ناشر جناب عارف سنی ہاؤس۔ لدھیانہ۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۸۶ صفحات۔ قیمت ۱۲ر

لطیفی صاحب کے شاعرانہ جذبات اور مضامین کا مجموعہ ہے۔ بیشتر مضامین اور نظمیں "راوی" "انیس" اور "انتخاب" وغیرہ میں شائع ہو چکی ہیں۔ کتابت، طباعت اور کاغذ وغیرہ اچھا ہے۔

ح۔ ع۔ خ)

شذرات

ہندوستان میں اس وقت جس قدر قومی مدارس ہیں ان سب میں جامعہ ملیہ اسلامیہ اپنی خصوصیات میں امتیاز رکھتی ہے وہ امتیاز یہ ہے کہ جدید مغربی علوم اور قدیم مشرقی آداب میں جو امتزاج ہوا اس کے لحاظ سے اہل ہند کے لئے جو بہترین لائحہ تعلیم ہو سکتا تھا جس کے ذریعہ سے ہم اپنے دینی عقائد اور تمدنی و معاشرتی آداب کو ایک طرف سنبھالے رکھیں اور دوسری طرف مغربی علوم و فنون سے بھی بہرہ ور ہوں اس جامعہ کی صورت میں نمایاں ہوا۔ قوم و ملک کے تعلیمی رہنماؤں نے جن کے دل ملکی و قومی ہمدردی سے لبریز تھے اس کے نصاب اور نظام کو مرتب کیا اور اس درسگاہ کو قائم کرکے انہیں صحیح تعلیمی اصول پر چلایا۔

جامعہ کے مقاصد متعین ہیں اُن میں اس کو کسی قسم کا التباس یا تذبذب نہیں۔ اس کے سامنے ملک اور قوم کی بہبود اور آزادی ہے۔ دینی اور دنیوی صلاح و فلاح ہے۔ وہ مشرقی مدارس کی کہنہ اور فرسودہ نزاعات سے بیزار ہے اور جدید تعلیم گاہوں کے الحاد اور بے دینی سے بمراحل بعید۔ اس کا مطمح نظر یہ نہیں ہے کہ وہ دین کے نام سے چند کتابیں پڑھا کر طلبہ کو مسجدوں کی امامت یا مذہبی مناظروں کے لئے تیار کرے نہ یہ کہ فقط دنیوی تعلیم دے کر غلامی اور نوکری کے قابل بنا دے بلکہ وہ انکے دماغوں کو ان ادنیٰ امور سے اس بلندی کیطرف لیجانا چاہتی ہے۔ جہاں سے انسان حقائق شناسی کے ساتھ دینی اور دنیوی ترقی کی راہیں دیکھتا ہے اور اپنے اندازہ کے مطابق ملکی اور قومی خدمت کے قابل ہوتا ہے۔

یہ مقصد ایک حقیقت ہے جس کی طرف ابھی تک اہل ملک کی توجہ بہت کم ہے لیکن ہم کو یقین ہے کہ وہ دن بہت جلد آنے والا ہے جبکہ قومی اور ملکی تعلیم کے نظام پر ملت کو غور کرنا ہوگا اور اسی شاہراہ کو اختیار کرنا ہوگا جس کو ارباب بصیرت نے جامعہ کی شکل میں رونما کیا ہے۔

کیا ہندو اور مسلم تعلیم کا مسئلہ الگ الگ زاویۂ نگاہ کے مطابق رہے گا؟ کیا ان میں یکجہتی اور اغراض و مقاصد میں یگانگت نہیں پیدا کیجائے گی جس کے بغیر ملک کا ترقی کرنا محال ہے؟ کیا مسلمانوں میں ایک جماعت صرف عربی اور دوسری جماعت صرف مغربی تعلیم پر قانع رہے گی اور وحدت تعلیم کا سوال حل نہ کیا جائے گا؟ کیا ہندوستانیوں کی تعلیم دفتری حکومت ہی کے مفاد کے لئے ہوگی یا ان کو اپنا اور اپنی ملت کا مفاد بھی مدنظر ہوگا؟ غرض یہ اور اسی قسم کے اور بھی مسائل ہیں جن کا حل اس نظام اور نصاب میں موجود ہے جنکو جامعہ نے اختیار کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں دفتری حکومت نہ ہمکو امداد دے سکتی تھی نہ ہم اس سے توقع رکھ سکتے تھے چنانچہ حکومت کی امداد کا سوال ہمارے پروگرام سے روز اول ہی سے خارج ہے۔ اور جامعہ کا کل سرمایہ صرف ملک و ملت ہی جس نے انسوس ہے کہ ابھی تک بہت کم توجہ اس طرف منعطف کی ہے

ہم رؤسا۔ یا امرار یا اس جماعت کو جو حکومت کے زیر اثر ہے کسی قدر معذور رکھتے ہیں کیونکہ ہمارے اغراض تعلیمی کے ساتھ انکی ہمدردی و اعانت اسی وقت ہوسکتی ہے جب حکومت کا اشارہ ہو۔ لیکن رہنمایان ملک۔ ارباب بصیرت اور عام ملت سے ہم کو ضرور گلہ ہوسکتا ہے۔

مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں مرحوم جو اس درسگاہ کے مربی اور سرپرست تھے انکی وفات کے بعد اجمل میموریل فنڈ کھولا گیا۔ باوجود اس کے کہ مسیح الملک کے تعلقات ہندوستان کے طول و عرض میں عوام سے لیکر امرار اور رؤسا تک کے ساتھ تھے لیکن پھر بھی کوشش بلیغ کے بعد آٹھ لاکھ کی اپیل میں سے صرف پندرہ ہزار روپئے جمع ہوسکے اور جامعہ کی ان مالی مشکلات میں جو حکیم صاحب کے انتقال کے بعد آپڑیں اس رقم سے کوئی آسانی نہ پیدا ہوسکی۔

۲۹ر اکتوبر ۲۸ء کو جامعہ کا آٹھواں یوم تاسیس تھا جو بعض ضروری ارکان کی اس دن عدم موجودگی کیوجہ سے ۵ر نومبر کو منایا گیا۔

طلبائے جامعہ نے اپنے قلبی تعلق کیوجہ سے اس دن کے لئے جامعہ کے واسطے اپنی اپنی قابلیت اور بساط کے مطابق تحفے تیار کئے تھے جو بیشتر علمی تھے۔ مثلاً مختلف اسلامی فتوحات کے تاریخی نقشے۔ نباتات وحیوانات بری وبحری کی شکلیں۔ شاہیر کی تصویریں۔ قطعات۔ کتبے۔ بزرگان دین کے مقولے دلکش خط میں نقش ونگار کے ساتھ۔ خطبات اور مختلف مضامین وغیرہ۔ حاضرین نے ان کو بہت دلچسپی کی نگاہ سے دیکھا۔

شرکاء جلسہ میں بڑے بڑے رہنمایان ملک بھی تھے مثلاً پنڈت مدن موہن مالویہ۔ پنڈت موتی لال نہرو لالہ لاجپت رائے۔ ڈاکٹر بینٹ۔ سری نواس آئنگر۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ ڈاکٹر انصاری۔ مولانا عبدالقادر قصوری وغیرہ

مالوی جی نے قومی جھنڈا نصب فرمایا۔ اس کے بعد شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے جامعہ کی رپورٹ سنائی جس میں ملک وملت کی بے توجہی کی تلخ حقیقت کو بھی شیریں الفاظ میں ظاہر کیا۔ اور کہا کہ پھر بھی نہ ہم مایوس ہیں نہ ناراض بلکہ کامیابی کا یقین لئے ہوئے صبر کے ساتھ اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اور امید رکھتے ہیں کہ ہمارے کام کو دیکھنے کے بعد قوم مجبور ہو جائے گی کہ وہ ہماری طرف اپنی پوری توجہ منعطف کرے۔

ڈاکٹر بیسنٹ نے اپنی تقریر میں طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے مسلمانان سلف کی علمی کوششوں اور ترقیوں کا ذکر کیا اور کہا کہ دین اسلام اور تاریخ اسلام سے بڑھکر علمی جد وجہد کی ترغیبات کہیں نہیں مل سکتیں

اراکین اردو اکادمی کی خدمت میں سال رواں کی چوتھی کتاب سیر المصنفین حصہ دوم روانہ کیجا چکی ہے۔ پانچویں کتاب تاریخ مغربی یورپ چھپ رہی ہے جو رابنسن کی کتاب Western Europe کا ترجمہ ہے۔ یہ بھی دسمبر میں حاضر خدمت کردیجائے گی۔ بعض اراکین نے باوجود بہیم خط لکھنے کے تاریخ الامت حصہ ششم کے بارے میں ابتک اطلاع نہیں دی ہے کہ آیا یہ کتاب آنکو بھیجی جائے یا نہیں؟ براہ کرم دفتر کو فوراً مطلع کر دیجئے ورنہ دسمبر ۲۸ء کے بعد اکادمی کے زرچندہ میں ہم اس کو نہ بھیج سکیں گے۔

اُردو زبان کا قدیم و مستند ماہوار رسالہ

صرف

زمانہ

ہے جو ملک کے مشہور ادیب منشی دیا نرائن نگم صاحب بی۔اے کی ادارت میں پچیس ۲۵ سال سے متواتر اُردو زبان کی خدمت انجام دے رہا ہے علمی ادبی مقالات حقیقی تنقیدی مضامین دلکش و سبق آموز افسانے، بہترین نظمیں اور غزلیں علمی خبریں اور نوٹس غرض ہر قسم کے بہترین مضامین آپ کو صرف "زمانہ" میں مل سکتے ہیں۔ مشاہیر ملک و اہل قلم کے علاوہ آرٹ کی اعلیٰ تصاویر بھی ہر ماہ بالالتزام "زمانہ" میں شائع ہوتی ہیں۔ فروری سنہ ۲۸ء میں "زمانہ" کی پچیس سالہ جوبلی کے موقع پر ایک خاص نمبر "جوبلی نمبر" کے نام سے شائع ہو کر قبولیت عام سند حاصل کر چکا ہے اگر آپ نے ابھی تک "زمانہ" ملاحظہ نہیں کیا ہے تو آج ہی خریدار ہو جائیے۔ قیمت سالانہ پانچ روپے۔ ششماہی تین روپیہ۔ اور فی پرچہ ۸ر آنے مقرر ہے۔

منیجر رسالہ زمانہ کانپور